میرے بھی صنم خانے

قرۃ العین حیدر

مکتبہ جدید لاہور

میرے بھی صنم خانے

۱۔ تراشیدم

۲۔ پرستیدم

۳۔ شکستم

قیمت - چھ روپے

بار اوّل - فروری سنہ ۱۹۴۹ء

اتحاد پریس لاہور میں باہتمام رشید احمد چودھری چھپ کر مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوا

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

(۱)

چلی جاتے موری نیّا کنارے کنارے

اس وقت بل کھاتے طویل پہاڑی راستے کے کنارے کنارے بکھری ہوئی سُرخ چٹانوں کے پیچھے بہار کا نارنجی آفتاب مدھم ہو کر چھپتا جا رہا تھا۔ شام کی ہواؤں میں ابھی خنکی باقی تھی۔ لیکن ان میں خود رو کوہستانی پھولوں کی تیز مہک تیرنی شروع ہو گئی تھی اور شفاف، ٹھنڈے پانی کے چشموں پر جہاں انجیر کی ڈالیاں جھکی ہوئی تھیں شام کا اندھیرا گہرا تا آ رہا تھا۔ اس اندھیرے میں شیر دل کی انگریزی ایجنسی کی عمارتوں کے سامنے سڑک کی دوسری طرف انجیر کے درختوں اور انگور کی بیلوں میں چھپا ہوا وہ چھوٹا سا ہوٹل برقی روشنیوں سے جگمگا اُٹھا تھا۔

وہ اپنا دن بھر کا کام ختم کر کے تھکا ہارا اس ہوٹل کے زینے کی سُرخ قالینوں والی گیلری میں پہنچا اور وہاں سے اپنے کمروں کی طرف جانے کے بجائے بے انتہا اکتاہٹ کے ساتھ ڈ رائنگ روم میں چلا گیا اور اس کے دریچے میں سے چپ چاپ باہر درختوں کے پرے دیکھنے لگا۔ جہاں لہراتی ہوئی سفید سڑک پہاڑیوں کو کاٹتی چکر کھاتی ان دیو

ان ہرے نخلستانوں کی سمت نکل گئی تھی۔ جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے قصبے تھے اور جھیلوں کے سایہ دار درختوں کے جھنڈ تھے اور ٹھنڈے پانی کی جھیلیں تھیں۔ جہاں سیاہ آنکھوں والی سفید فام ارمنی لڑکیاں سائے کی طرح گلیوں میں سے گزر کے ایک گھر کے دروازے میں سے نکل کر دوسرے گھر میں داخل ہو جاتی تھیں اور سُرخ بالوں والے بچے جھیلوں کے کنارے رنگین سنگریزوں سے کھیلتے تھے اور اس ابدی سکوں اس لاتنا ہی خاموشی کے خواب آگیں سحر کو ایک جھٹکے سے توڑتی ہوئی بھاری بھاری بھاری لاریاں اس راستے پر سے نکل جاتی تھیں اور اس کے بعد پھر وہی سناٹا طاری ہو جاتا تھا۔ رات کی بے چین تاریکی میں یہ سناٹا زیادہ گہرا ہو جاتا تھا۔ زیادہ گمبھیر تا سے گونجتا تھا۔ یہاں تک کہ ہوٹل کی نچلی منزل میں مغرب کی سفید فام قوموں کی اس انتہائی مختصر سی نو آبادی کے چھوٹے موٹے مقامی ڈانس بینڈ کے سارے ساز چلا اُٹھتے تھے اور صبح کی اولیں ساعتوں تک چیختے رہنے کے بعد تھک کر خاموش ہو جاتے تھے اور ہوٹل کی رقص گاہ اور پٹرول ایجنسی کے سوئمنگ پول اور ہسپتال کے لکڑی کے بنگلے کی ساری روشنیاں ایک ایک کر کے بجھ جاتی تھیں۔

وہ دریچے میں کھڑے کھڑے اور بھی زیادہ اکتا گیا اور اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ اب کیا کرے۔ اس نے دوسرا سگریٹ جلایا اور بے دلی سے ایک فارسی رسالہ اُٹھا کر اُس کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ ابھی تو چائے پینی ہے۔ ٹی روم کے سرے پر اس کے مخصوص دریچے کے نزدیک ایک چھوٹی سی سنگ مرمر کی میز پر اس کی ڈاک اور اس کا سماوار اُس کے منتظر تھے۔ آتشدان میں آگ کب کی بجھ چکی تھی کیونکہ موسم تبدیل ہو جا رہا تھا اور وادیوں میں بہار کی آمد آمد تھی۔ دریچے کے باہر انگور

کی بیل کے پتے شام کی ہوائیں آہستہ آہستہ سرسرا رہے تھے۔ نیچے ہوٹل کے صحن کے وسط میں سُرخ پتھروں کے فوارے پر ایک نارنجی تلبنے کا فرشتہ اپنا پرانا بربط لئے ایک ستون پہ چڑھا بیٹھا تھا اور اس میں سے کبھی کبھی پانی کی سرد پھواریں اُبل پڑتی تھیں۔ اور ان کے چھوٹے چھوٹے قطرے انجیر کے پتوں میں سے چھنتی ہوئی پورچ کی مدھم روشنی میں ایک لحظہ کے لئے جگمگا اُٹھتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سڑک کی ڈھلوان پر سے بھاری اور مسلح روسی موٹریں شور مچاتی گذر جاتی تھیں اور موڑ پر پہنچ کر وادی کے پرے جاتے ہوئے ان کی آوازیں رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی جاتی تھیں۔

صبح کی ہوائی ڈاک بے خیالی سے اُلٹنے پلٹنے کے بعد صوفے پر بیٹھ کر ہاتھوں میں چہرہ رکھ کے وہ لاؤنج کے سُرخ پردوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ٹی روم کے ستونوں کے پرے سُرخ قالینوں والے ہال کے سرے پر بار کے پیچھے سے چند رالیسی ناک والے موسیو ؤوں کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔ ہال کے دبیز گدیلوں والے صوفوں پر کچھ لوگ ادھر اُدھر بیٹھے تھے۔ چند سنجیدہ اور متفکر چہروں اور سُرخ مونچھوں والے روسی اپنے سامنے رکھے ہوئے شراب کے گلاسوں میں سوڈے کے اُٹھتے ہوئے بلبلوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ بار کے سامنے پٹرول کمپنی کا انگریز منیجر گھومنے والے اونچے اسٹول پر بیٹھا غم دل اور غم روزگار کو بیئر کے بڑے بڑے مگساں میں ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی کبھی کچھ دیر بعد ہوٹل کی چھت پر سے کوئی جنگی طیارہ زور زور سے گڑگڑاتا فضا کی بیکراں تاریکی میں اپنی منزل کی سمت گذر جاتا تھا۔

وہاں پر اس وقت ایسا ناقابل برداشت، منجمد اور مطمئن سکوت دھیرے دھیرے گرج رہا تھا جو اکثر کسی بڑی آندھی کی آمد کا انومان ہوتا ہے۔

وہ اکیلا اپنے صوفے پر بیٹھا چائے کی پیالی میں چمچہ بجاتا اور ایک طبی رسالہ پڑھتا رہا
رات کے کھانے کی گھنٹی میں ابھی بہت وقفہ باقی تھا۔

تھوڑی دیر بعد لاؤنج کے سرخ پردوں کو جنبش ہوئی اور ہنستی شور مچاتی چند امریکن
لڑکیاں ہال میں داخل ہوئیں اور وہاں پر زندگی کے سارے آثار یکلخت پیدا ہو گئے شراب
کے گلاس ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ دبے دبے قہقہے گونج اُٹھے اور ریڈیو پر دنیا
کے سارے اسٹیشنوں کو ٹیون کیا جانے لگا۔ پیالو پر دور افتادہ ہالی وڈ کی تازہ ترین
دھنیں چھڑ گئیں اور بوڑھا موسیو، انگریز منیجر اور روسی افسر سب مل کر ایک ساتھ
باتیں کرنے لگے۔

ٹی روم میں وہ اسی طرح بیٹھا طبی رسالہ پڑھتا رہا
"وہ کہاں ہے" ؟ ایک عنابی بالوں والی لڑکی نے اپنی شربتی آنکھیں چاروں طرف
گھما کر ایک صوفے پر دھم سے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"کون" ؟ انگریز منیجر نے ایک بھوں اٹھا کر بے تعلقی سے دریافت کیا
"وہی۔ سانولا، سیاہ آنکھوں والا مغرور ہندوستانی" دوسری لڑکی نے گراموفون
کے لئے ریکارڈ منتخب کرتے ہوئے میز پر چڑھ کر کہا۔

مردوں نے لاؤنج کے سرخ پردوں کی طرف ذرا ناپسندیدگی کا اظہار کرتی
ہوئی سرسری نظر ڈالی اور پھر کوک ٹیل بنانے میں مصروف ہو گئے۔
نچلی منزل میں رات کے کھانے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔
رفتہ رفتہ بہت سے امریکن، روسی، انگریز اور ہندوستانی سوئمنگ پول کے کلب
اور اپنے اپنے کمروں میں سے نکل آئے اور سب نیچے چلے گئے۔

چقندر ایسی ناک والا موسیو دُوتلے بار کے پیچھے بیٹھا اونگھتا رہا۔ یہ اس کی ہمیشہ کی عادت تھی۔ وہ بار کے کام سے چھٹی پا جاتا تو اپنے اونچے اسٹول پر بیٹھا بیٹھا گیلری میں سے گذرنے یا ہال میں آنے جانے والوں کو اپنی نیم باز خوابیدہ آنکھوں سے فیلسوف کی طرح دیکھتا رہتا اور شاید فلسفۂ حیات پر غور کیا کرتا۔

طبی رسالہ ایک طرف پھینک کر اُس نے ایک اور سگریٹ جلایا اور ایک لمبی سی گہری سانس لے کر سوچا۔ چنانچہ ایک اور غیر دلچسپ، طویل، بے رنگ دن کا اختتام ہوا۔ اُس نے ایک طویل انگڑائی لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ جس کی وجہ سے اس کی لمبی کالی پلکیں نیچے جھک آئیں۔

امریکن لڑکیوں کی ہنسی کی آوازیں برابر سنائی دے رہی تھیں۔ اسے شور مچانے والی بے تکلف بشاش امریکن لڑکیاں پسند نہیں تھیں۔ اسے خیال آیا جب تک وہ طہران میں رہا۔ اُس کا وقت کتنی دلچسپی سے گذرتا تھا۔ برطانوی سفارت خانے کے بال اور شاہِ ایران کے محل کی ضیافتیں۔ وہ ایرانی امراء کی گوری گوری، دبیز اور گداز لڑکیاں جو کس قدر صفائی سے اس سے عشق کرتی تھیں کہ وہ اور اس کے دوست پلکیں جھپکتے رہ جاتے تھے اور کیپسین کے ساحل اور شمران کی پھولوں سے لدی ہوئی پہاڑی اسے لندن اور پیرس اور وی آنا کے مقابلے میں طہران کہیں زیادہ اچھا لگا تھا۔

لیکن فی الحال تو وہ کھانے کی گھنٹی کے انتظار میں مصروف تھا اور نچلی منزل میں امریکن لڑکیاں متواتر ہنسے جا رہی تھیں۔

اور تب یکایک ہوائی جہاز کے انجن کے شور کے ساتھ ساتھ ٹیرس کے نیچے بہت سی موٹروں کی ایک دھکے کے ساتھ رکنے کی آواز آئی۔ چاروں طرف چیخ پکار مچ گئی

اونچلی منزل سے بہت سے لوگ دوڑتے ہوئے سڑک کی طرف چلے گئے۔

"کیا بات ہے موسیو"۔ اس نے صوفے پر لیٹے لیٹے سگریٹ کے ڈبے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

غالباً ایک اور حادثہ"۔ موسیو ڈولے نے اپنی آنکھیں آدھی کھول کر جواب دیا اور پھر اپنی سوتی سوتی آواز میں بولا" موسیو کو اب تک پیاس نہیں معلوم ہوئی" اور جواب کا انتظار کئے بغیر کوک ٹیل بنانے میں مصروف ہوگیا۔

باہر اسی طرح شور مچ رہا تھا۔ موسیو ڈولے کے ہاتھ سے گلاس لیکر اس نے دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ جنگ ختم ہونے والی تھی۔ لیکن فوجوں کے کونوائے دن رات اس پہاڑی راستے پر سے گذرتے رہتے تھے اور ایک نہ ایک حادثہ پیش آجاتا تھا مختلف کیمپوں کو جانے والے دستے وہاں پر آکر رکتے ، پٹرول لیا جاتا۔ افسر ہوٹل کے بار پر تازہ دم ہوتے۔ زخمی لکڑی کے بنگلے والے ہسپتال تک پہنچائے جاتے۔ مہینوں سے یہ چکر یونہی چل رہا تھا۔

اس نے سگریٹ دریچے سے باہر پھینک دیا اور پھر ہاتھوں پر اپنا چہرہ رکھ کر اپنی سیاہ پلکیں جھپکاتا رہا۔ اسے معلوم تھا۔ ابھی اس کا اردلی آکر اس سے کہے گا۔ بڑے صاحب چلئے ہسپتال۔ ایک اور حادثہ۔ یا ایک اور آپریشن۔ کسی کی ناک ٹوٹی ہوگی کسی کے کان۔ کوئی یونہی تفریحاً ہسپتال میں داخل ہونا چاہتا ہوگا۔ کہ جب تک یہاں قیام رہے۔ بفکری اور آرام سے وقت گذرے۔ اس نے گھبرا کر گھڑی پر نظر ڈالی اب وہ کھانے کے فوراً بعد اپنے کمرے میں جاکر سوجانا چاہتا تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا سارے ملازم اپنے اپنے کام چھوڑ کر باہر پہنچ گئے تھے۔

پھر وُہ شور، وہ گھما گھمی نزدیک تر آ گئی۔ مدھم ستاروں کے نیچے بہت سے سائے نچلے ٹیرس پر سے گذرتے ہوئے ڈرائیو پر آ گئے۔ دو اسٹیشن ویگن پٹرول پمپ کے پاس لے جا کر کھڑے کر دیئے گئے۔

اور وُہ سب دفعتہً تاریکی میں سے نکل کر پورچ کی روشنی میں آ گئے۔

لاؤنج کے دریچے میں سے اُس نے دیکھا۔ وُہ کئی تھے۔ بھاری بھاری غرارے پہنے شالوں میں لپٹی ہُوئی بیگمات کئی نوجوان لڑکیاں اور لڑکے۔ بہت سے ملازمین۔ دو یا تین کتے۔ ہوٹل کا منیجر بھاگا بھاگا ان کے خیر مقدم کے لئے پہنچا اور کچھ نورسٹڈ لینڈنگ اور رات بھر کے قیام کے متعلق باتیں کرنے کی آواز آئی۔

"کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟" موسیو دولے نے اپنے اسٹول پر سے اچک کر ایک ملازم سے پوچھا جو نہایت سرعت سے گیلری میں سے گذر رہا تھا۔

"اب تک تو نہیں۔ صرف ایک موٹر کا اگلا مڈگارڈ ٹوٹ گیا ہے"۔ اس نے جواب دیا اور زینے کے دروازے میں غائب ہو گیا۔

پھر وُہ سب اوپر آ گئے۔ ان کا سامان گیلری میں پھیلا دیا گیا۔ ایک سیاہ، سیدھے بالوں والی لڑکی گہرے سبز رنگ کے کوڈرائے کے سلیکس پہنے اور شانوں پر اوورکوٹ ڈالے پرس جھُلاتی اس بےفکری سے ان کے آگے آگے چل رہی تھی۔ گویا ہوائی جہاز اور موٹروں کے حادثے روزمرہ کی معمولی تفریح تھی۔ اُس کا رنگ زیادہ صاف نہیں تھا لیکن الزبتھ آرڈن کے پیچل شیڈ نے اسے اتنے گورا کر رکھا تھا کہ سُرخ قالینوں والے ہال کی تیز روشنی میں وُہ بالکل سفید نظر آ رہی تھی اور اپنے سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں کی وجہ سے اپنے مغربی لباس میں ہسپانوی یا ارمنی معلوم ہوتی تھی۔

وہ اور ان کے کتے ادھر اُدھر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ہوٹل کے ملازمین جس سرگرمی سے بھاگ دوڑ مچا رہے تھے۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ نووارد دل کی شان و شوکت سے بیحد مرعوب ہو گئے ہیں۔

"دوسرا گلاس موسیو؟" ایک جمائی روکنے کے بعد موسیو ودلے نے اس کے پاس آ کر پوچھا۔

"نہیں، شکریہ۔ کھانے میں کتنی دیر ہے؟"

"پتہ نہیں۔ یہ لوگ موسیو کسی ہندوستانی رجواڑے سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی تفریحی سفر یا شاید مقدس زیارات سے واپس آ رہے ہیں۔" موسیو ودلے نے ہال کی طرف دیکھتے ہوئے صوفے پر جھک کر بڑی رازداری اور اہمیت کے لہجے میں سرگوشی کی۔ "دوسرا گلاس؟" اس نے پھر پوچھا

"نہیں شکریہ۔" اس نے دوبارہ جواب دیا۔ موسیو ودلے اسی طرح ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا بار کی طرف واپس چلا گیا۔

بھئی واہ۔ بڑے ولایتی زائرین ہیں جو کتوں کو لے کر زیارات کے لئے جاتے ہیں اُس نے ایک کتے کو لاؤنج میں چہل قدمی کرتے دیکھ کر سوچا۔

وہ سب کھانے سے پہلے اپنے کمروں کو دیکھنے کے لئے گیلری میں چلے گئے۔ کاؤنٹر پر جھکا ہوا موسیو ودلے بیحد اشتیاق سے سبز سلیکس والی لڑکی سے فورسڈ لینڈنگ کی تفصیلات پوچھنے میں مصروف تھا۔

وہ نہایت صبر و استقلال سے ہاتھوں پر چہرہ ٹکائے کھانے کی گھنٹی کا انتظار کرتا رہا۔

اور پھر یکلخت ٹی روم اور ہال کی روشنیاں بجھ گئیں۔ چاروں طرف کے مدھم سے شور میں اضافہ ہوگیا۔ ملازم دوڑ بھاگ کر شمعیں روشن کرنے میں مصروف ہوگئے۔ سرخ قالینوں والا ہال اندھیرا اور خالی پڑا تھا۔ بہار کا چاند جو سرخ پہاڑیوں کے پیچھے سے طلوع ہو رہا تھا۔ لاؤنج کے دریچوں میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ موسیو دولے نے جلدی سے ہال میں آکر پیانو پر رکھا ہوا شمعدان روشن کیا اور اس کی مدھم روشنی ٹی روم میں پھیل گئی۔ وہ جواب تک موسیو دولے سے باتیں کر رہی تھی۔ شمعدان اٹھا کر گیلری میں جانے لگی۔

اور اس وقت اس نے ہال کی سیڑھیاں اترتے ہوئے شمعدان اونچا کرکے دیکھا اس کے سامنے لاؤنج کے سرخ پردوں کے پرے وہ صوفے پر بیٹھا ہاتھوں پر اپنا چہرہ ٹکائے اکتاہٹ کے ساتھ اپنی بڑی بڑی کالی پلکیں جھپکا رہا تھا۔

اپنے سامنے ہال کی سرخ قالینوں والی سیڑھیوں پر اس لڑکی کو شمعدان اٹھائے ایک لحظے کے لئے اسے بڑے غور سے دیکھتا پاکر وہ فوراً تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا۔

"آیئے نیچے چلیں۔ نچلی منزل کی بجلی ابھی فیل نہیں ہوئی ہے"۔ اس لڑکی نے بڑے اخلاق سے کہا اور بڑے اطمینان سے شمعدان اٹھائے آگے آگے چلتی ہوئی گیلری میں آگئی۔

سنسان اور اندھیری گیلری میں سے سایوں کی طرح چپ چاپ اور اکٹھے گذرتے ہوئے وہ زینے تک آئے۔ نچلی منزل میں کھانا شروع ہو چکا تھا اور چھری کانٹوں کی آواز میں ملی جلی ہنسی کا شور لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔

"اُفوہ آپ کے ہوٹل میں کھانا کتنی دیر ہوتا ہے"۔ اس لڑکی نے شمعدان اونچا کرکے زینے

پر سے اترتے ہوئے کہا۔ ڈائننگ ہال میں داخل ہو کر اس نے شمعدان ایک کونے میں
رکھ دیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف چلی گئی۔

وہ خاموشی سے حسب معمول اپنی مخصوص میز پر اکیلا جا بیٹھا۔

پھر ڈنر ختم ہوا۔ اور سب کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ ایک امریکن لڑکی کوئی پرانا
گیت گنگناتی اس کے پاس آئی۔

"ڈوک چلو نا چلیں۔ آج تو چھٹی کی رات ہے" امریکن لڑکی نے اس سے کہا
سب باہر ٹیرس پر اتر آئے۔ درختوں میں قمقمے جگمگا اٹھے تھے اور چاند کی دھیمی روشنی
میں پیڈریکو کے ستونوں کے سائے بڑے پر اسرار معلوم ہوتے تھے۔ بالکونی میں ناچ کے
سازوں نے جاز کی ایک دھن چھیڑ دی۔ شراب کے گلاس اونچے کیے گئے۔ برطانیہ
کے لئے۔ روس کے لئے۔ امریکہ کے لئے۔ شیشے ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ ناچ
شروع ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ جاز کو کانوں کے بجائے ٹانگوں کے ذریعے سنا جاتا ہے۔ وہ بھی
تھوڑی دیر تک اپنی امریکن ہم رقص کے ساتھ ناچتا رہا۔ ناچتے ہوئے وہ کئی بار ٹیرس
کے ایک کونے پر جھکے ہوئے انار کے ایک پیڑ کے نیچے سے گذرے اور وہاں سے
اس نے دیکھا کہ سیڑھیوں کے نیچے وہ لڑکی سیاہ زرتار شام کے لباس میں گھاس پر
دوزانو جھکی اپنے ایک کتے کو بیحد سنجیدگی سے کچھ سمجھا رہی ہے۔

جب وہ دوبارہ اس کے قریب سے گذرا تو ہوا کے جھونکے سے درخت کی شاخوں
میں لٹکی ہوئی جاپانی قندیلیں زور زور سے جھولنے لگیں اور ان کی رنگ برنگی لرزاں جھلملاہٹ
میں اس نے سر اٹھا کر اسے ایک نظر دیکھا اور اس کی سیاہ آنکھیں کہہ اٹھیں۔ ارے یہ تو

تم ہو۔ تمہیں تو میں پہچانتی ہوں۔

دوسرا ناچ شروع ہوا تو وہ اس کے قریب گیا۔ اسے اپنی طرف مخاطب ہوتا دیکھ کر وہ خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور خاموشی سے اس کے ساتھ ٹیرس پر آ کر ناچ میں شامل ہو گئی۔

پھر نغمے کی گت تبدیل ہوئی۔ ایک بہت پرانا بہت محبوب نغمہ جو ان گنت مرتبہ ایسی ہی پراسرار راتوں میں بجایا گیا یا گنگنایا گیا ہو گا۔ بہت مدھم سروں میں بجنے لگا۔

اس سیاہ آنکھوں والے خوبصورت اور مغرور حلبی کے ساتھ ساتھ ناچ کے قدم رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ واہ بھئی۔ ریگستانوں اور پہاڑیوں کے اتنے طویل اور سفر پریشان کن سفر کے بعد اس خوشگوار رات کی خنکی کتنی اچھی معلوم ہو رہی ہے اور اس ہوٹل کا کھانا اور چائے بھی بہت عمدہ ہے۔

"روشی بٹیا اب سونے کے لئے چلنا چاہیئے۔ کل ہمیں صبح سویرے ہی چلنا پڑیگا" ناچ کے اختتام پر کسی نے اس سے کہا۔ وہ ایک ہلکا پھلکا شب بخیر کہہ کر اس کے بازو سے الگ ہو گئی اور اپنے ساتھیوں سے جا ملی اور ان کے ساتھ زینے کی سمت چلی گئی وہ پرانا نغمہ بجا کیا۔ امریکن لڑکی کے انتظار میں وہ ایک آرام کرسی پر آ بیٹھا۔ انار کے درختوں کے نیچے صوفے پر نیم دراز ایک ادھیڑ عمر کا انگریز ترنگ میں آ کر اپنی بھدی آواز میں بار بار اس نغمے کے الفاظ دہرائے جا رہا تھا۔ "میں نے اسے کیپری کے جزیرے میں ایک پرانے وال نٹ کے درخت کے نیچے پایا۔ موسم گرما تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ نیلے اطالوی آسمانوں کے نیچے میں نے اس سے کہا۔ خاتون میں تو عرض

ایک لاابالا اسپلانی ہوں ۔۔۔ خاتون ۔۔۔ میں ایک ۔۔۔ ایک گھوڑا ہوں "۔ نشے اور غنودگی کی جھونک میں وہ انگریزو ہیں لیٹ کر خراٹے لینے لگا۔

رات گہری ہوتی گئی ۔ ٹیرس رفتہ رفتہ خالی ہونا شروع ہو گیا۔

"اوجیزس ۔۔۔ کتنی الف لیلیٰ ایسی رات ہے یہ"۔ بالکونی کی ریلنگ پر جھکی ہوئی ایک امریکن لڑکی نے اپنے قریب کھڑے ہوئے روسی سے کہا۔

"غوں"۔ روسی نے حلق میں سے کوئی آواز نکال کر جواب دیا۔ پھر وہ دونوں بار کی طرف چلے گئے۔

ہوٹل کی ساری عمارت پر پھر وہی سناٹا طاری ہو گیا۔

پھر صبح ہوئی ۔ پھر شور مچا ۔ خودرو پہاڑی پھولوں کی جھاڑیوں میں نیلے اور سرخ پرند چہچہائے اور پورچ میں کھڑی ہوئی موٹریں ہارن بجاتی درختوں کے نیچے سے گذرتی ہوٹل کے پھاٹک سے باہر نکل گئیں۔

موٹروں کے ہارن کے شور نے اسے جگا دیا ۔ وہ ایک طویل انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا ۔ صبح کی چاء پلنگ کے برابر کی میز پر دیر سے ٹھنڈی ہو رہی تھی ۔ اس نے اخبار اٹھا کر دریچے سے باہر دیکھا ۔ نیچے صحن میں نارنجی تانبے کا فرشتہ اپنے زنگ آلود بربط پر اپنے شکستہ پر جھکائے چپ چاپ بیٹھا تھا اور دریچے کے شیشوں پر انار کے پتے صبح کی ہوا میں سرسرا رہے تھے۔

"آقائے سلیم "۔ دروازے پر بڑی مودبانہ دستک ہوئی

جب وہ اپنے اردلی سے بات کرنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا ۔ اس وقت باہر سرخ چٹانوں اور انجیر کے باغوں اور لا تتناہی اکتائے ہوئے کوہستانی

راستوں پر ایک اور دن طلوع ہو چکا تھا

اور صبح ہوتے ہوتے بہار کے نارنجی آفتاب کی کرنوں میں ندی کا پانی بالکل سونے کے رنگ کا ہو گیا تھا اور پروائی ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ ندی بڑے سکون، بڑی خاموشی سے رواں تھی۔ اس کے کنارے کنارے درختوں کے سائے میں بندھی ہوئی کشتیاں بالکل ساکت تھیں اور درختوں کے جھنڈ چپ چاپ کھڑے تھے۔

دن بھر ہوا امرودوں اور جامنوں کے کنجوں میں یونہی کاہلی سے سرسراتی رہی جیسے فضا میں بڑھتی ہوئی گرمی کی وجہ سے اسے نیند سی آ رہی تھی۔ آم کے پیڑوں کی ڈالیاں چھوٹی چھوٹی ہری کیریوں کے بوجھ سے ٹھنڈی نم زمین تک جھک آئی تھیں اور جن پیڑوں پر ابھی بور باقی تھا۔ ان کے پتوں میں موسم کی اسی نئی حدت سے بچنے کے لئے کوئلیں جا چھپی تھیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چلا اٹھتی تھیں یا ان کنجوں میں سے گذرتا ہوا کوئی لڑکا 'کو' 'او' کی آواز نکال کر اگر ان کی نقل کرتا تو بڑی مستعدی سے اس کا جواب دے دیتی تھیں۔ پھر دھوپ ڈھلنے لگی اور موسم کی اس نئی نئی گرمی میں کچھ کمی ہوئی تو پروائی ہوا بے طرح جھنجھلاہٹ کے ساتھ درختوں سے جا ٹکرائی اور آم اور جامن کے ان کنجوں میں پہنچ گئی۔ جہاں کوئلیں چھپی بیٹھی تھیں۔ کچھ بھی نہیں ——— کچھ بھی نہیں ——— پتوں کی جنبش کے ساتھ ساتھ اس کی سنسناہٹ میں جیسے کوئی کہتا سنائی دیا (لیکن دراصل یہ امردوں کے باغ کے رکھوالے کا لڑکا تھا جو گھاٹ کی شکستہ سیڑھی پر لیٹا آم کے پتے کی سیٹی بجانے کی کوشش کر رہا تھا)

ہوا درختوں میں دیر تک اپنا مدھم سا شور پیدا کرتی رہی اور اس طرح وقت کے اس

بہت بڑے۔ پاگل کر دینے والے صحرا میں ایک دن اور طلوع ہوا۔ اس سرخ، گرم، اور نڈھال آفتاب کے ساتھ ساتھ گھسٹتا رہا اور پھر ندی کے اس پار اندھیرے میں جا گرا لہروں کی سطح، ہرے پتوں کے جنگل اور اس کے کنارے کنارے منڈلاتے ہوئے سرمئی راستے پر جھٹ پٹے کے وقت کی تاریکی بکھرنے لگی (امبر پور راج کا انور اعظم اس وقت جب پہلی بار ادھر سے گذرا تو اس نے دیکھا کہ گو بارشوں کا مہینہ ابھی بہت دور تھا لیکن کرو آہا راج کے علاقے میں چاروں طرف خوب ہریالی تھی۔ وہاں پر دور دور تک آم کے باغ پھیلے ہوئے تھے اور ان کے درمیان سے وہ ندی، وہ گھاگرا بل کھاتی گذرتی تھی اور وہ سڑک جس پر سے انور اعظم کی نیلی ٹوسیٹر گذر رہی تھی۔ بہت خاموش اور صاف شفاف تھی اور کبھی کبھی اس سڑک پر سے دیہاتی مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی زرد اور گرد آلود لاریاں شور کرتی نکل جاتی تھیں اور وہاں پر تمباکو اور ارہر کے کھیتوں کے پرے ایک نہر تھی جو دور نیپال کی سرحد کے قریب اس ندی میں سے نکالی گئی تھی اور اس نہر کے پاس ہائیڈرو الیکٹرک کا چھوٹا سا پاور ہاؤس تھا اور دور سے نہر کے کنارے کھڑا ہوا آبھوسن کی چھت کا سفید ریسٹ ہاؤس نظر آتا تھا جس میں اکثر سپرنٹنڈنگ انجنیر یا ضلع کے دوسرے حکام آکر ٹھہرتے یا پکنک منانے والے منچلوں کی ٹولیاں یا یو۔ ٹی سی کے دستے رک جاتے، پھر آم کے ان باغوں کے چاروں طرف کچی منڈیروں کے کے ساتھ ساتھ ایکھ کے جھنڈ کھڑے تھے۔ وہاں پر ہریالی تھی اور ٹھنڈک، اور سکون، اور کیلے کے جھنڈ میں ٹھاکر راجندر پرتاب سنگھ کے پرانے مندر کا بدرنگ جھنڈا پروائی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ مندر کے بڑے دروازے کا رخ ٹھاکر صاحب کی نئی کوٹھی کی سمت تھا۔ وہ شیو جی کا مندر تھا اور شیو جی کی اکتائی ہوئی خوفناک، سرخ

مورتی کا گول پتھر دن بھر ڈھیروں پانی میں نہاتا رہتا تھا اور وہ پانی پتھر کے پینڈے میں مل کر فرش پر سے بہہ بہہ کے مندر کے چبوترے کے چاروں طرف گیندے اور گل ہزارے کی کیاریوں میں جذب ہو جاتا تھا اور رات کے سناٹے میں ٹھاکر صاحب کی کوٹھی میں سے کیرتن کی آواز بلند ہوتی تھی۔ چلو چلو ری سکھی مِتھرا نگری۔ وہ مرلی بجاتے آتے ہیں اور پہروں کھڑتال کے ساتھ کیرتن یا بھجنوں کے بول ایک ہی لَے میں دہرائے جاتے تھے اور ڈھیروں گائیں اور کالی بھینسیں اور بھورے بھورے کالے پیلے سوروں کے غول کے غول نظر آ رہے تھے۔ اکثر کسی بھینس کی پیٹھ پر کوئی کالا بُھتنا ایسا بچہ اسے لکڑی سے مارتا مارتا ندی کی طرف جاتا دکھائی دے جاتا اور اس کو تار کی سرمئی سڑک پر انور اعظم کی نیلی ٹو سیٹر کے برابر سے بڑے بڑے کمانڈو اور جیپ اور ٹرک زناٹے سے فیض آباد چھاؤنی کی طرف نکلتے جا رہے تھے اور اس سڑک سے ذرا پرے ایک ڈیڑھ فرلانگ بھر کا سُرخ بجری والا راستہ نظر آ رہا تھا جو کرواہا راج اور چھاؤنی کی آبادی شروع ہونے سے ذرا پہلے اس زرد رنگ کی پرانی کوٹھی کی طرف جاتا تھا جس کے باغ میں ڈھیروں گلاب اور چنبیلی کی جھاڑیاں تھیں اور جس کے کنارے پر ایک بورڈ لگا تھا۔ "یہ عام راستہ نہیں"

اور جنگل کے کنارے کنارے منڈلانے والے اس سرمئی راستے کے سرے پر اس نے اپنی ٹو سیٹر روک لی کیونکہ دفعتاً اسے خیال آیا تھا کہ ستر میل کا سفر طے کرنے کی وجہ سے انجن گرم ہو گیا ہے اور ریڈی ایٹر کو تازہ ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہے۔ لیکن کیلے کے جھنڈ میں چھپی ہوئی ٹھاکر صاحب کی نئی کوٹھی کے سارے دروازے بند تھے جس کا مطلب تھا کہ ٹھاکر صاحب ابھی اپنی بھانجی کی شادی نپٹا کر بلرام پور راج سے واپس

تشریف نہیں لائے ہیں چنانچہ اس نے گرم انجن دوبارہ اسٹارٹ کیا اور گھاگرا ندی کے کنارے کنارے چھاؤنی کے انگریزی کلب کی طرف نکل گیا۔ شفق کے سائے میں کار آگے بڑھاتے ہوئے اُسے خیال آیا کہ یہی سڑک اسّی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد یونہی بل کھاتی اور خاموش، کرواہار راج کی غفراں منزل کے بڑے پھاٹک تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ کیا نئی یا عجیب بات تھی۔ لیکن بہر حال تھی۔

پھر وہاں وہی سکوت طاری ہو گیا جس میں صبح و شام صرف ٹھاکر راجندر پرتاپ سنگھ کے مندر کے سنکھ کی آواز نکل ہوتی تھی جس کے ساتھ ساتھ چھوٹے ٹھاکر کے دونوں السیشین کتے اپنی آواز ملا کر زور زور سے بھونکنے کی مشق کرتے تھے۔ پروائی ہوائیں مندر کا گلابی جھنڈا لہرایا کیا۔ شام کا اندھیرا بڑھتا گیا۔

اس سکوت اور اس تاریکی میں گھنگھریالے بالوں والی شہلا رحمٰن آہستہ آہستہ قدم رکھتی سُرخ بجری والی روش کے سرے پر آ کھڑی ہوئی اور پرانے گملوں کی ایک شکستہ اور نیچی سی دیوار پر جھک کر سامنے کی طرف دیکھنے لگی۔ سامنے جدھر ندی بہہ رہی تھی اور آم کے جھنڈ تھے اور جوہی کے پھولوں پر بھنورے گونج رہے تھے۔ وہ بہت دیر تک اس جگہ کھڑی اپنی نظم کی آخری دو سطریں موزوں کرنے کی کوشش میں منہمک رہی "۔ بجائے ان پر سے کتنے طوفان گذر کے راہیں بنا رہے ہیں۔ گذر کے راہیں بنا رہے ہیں"۔ سرخ آفتاب مولسری اور چمپا اور جامنوں کے پیچھے ندی کے گلرنگ پانیوں میں لڑکھڑا کر گر چکا تھا اور لمبے لمبے چپ چاپ سائے چاروں طرف پھیلتے جا رہے تھے۔

ایکھ کے کھیت کو پار کر کے دو سائے اس راستے کی جانب آتے دکھائی دیئے

ان دو انسانوں نے چھینٹے چلاتے رنگوں والے اسکارف اور گہرے رنگوں کے دھاریدار سوٹ پہن رکھے تھے اور غالباً کسی ہمسایہ زمینداری کے لڑکے تھے۔

"ہلو— ار— تسلیمات عرض ہے شہلا بیگم۔" ان میں سے ایک نے دیوار کے نیچے پہنچ کر کہا۔

"آداب۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ تازہ ترین مصرع دماغ میں گڈمڈ ہو کر رہ گیا۔

"آپ الٰہ آباد سے کب تشریف لائیں۔ میرا خیال تھا آپ ابھی وہی ہیں۔" دوسرے نے کہا

وہ چپ رہی۔

"آپ کو کچھ پتہ ہے کرواہا راج والے اپنے سفر پر سے لکھنؤ واپس آگئے ؟" پہلے نے پوچھا۔

"میں ان لوگوں کو نہیں جانتی۔ چچا میاں کو معلوم ہوگا۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ — میرا خیال تھا— اچھا خیر— کیا آپ کے چچا میاں اندر تشریف رکھتے ہیں ؟ شاید آپ اندھیرے میں مجھے پہچانیں نہیں۔ میں چودھری شمیم ہوں۔ سندیلے کا چودھری شمیم۔ وکیل صاحب اگر الٰہ آباد سے آگئے ہوں —"

"بھئی وہ اندر ہی ہوں گے۔ آگے جا کر معلوم کر لیجئے۔"

وہ دونوں تکلفاً ہنستے ہوئے کوٹھی کی طرف چلے گئے۔ جدھر چنبیلی کی جھاڑیاں تھیں

"ہونہہ"۔ اس نے جھک کر آکاس بیل کا ایک پتہ توڑا اور دیوار پر سے اتر آئی اور گھاگرا کی شفق رنگ لہروں کو دیکھتے ہوئے اس نے تخیلات کا سلسلہ پھر وہیں سے جوڑ لینا چاہا (اس نئی نظم کو بہ جنید رکمار روہت نے کہا تھا کہ وہ الٰہ آباد کے اسٹوڈیوز سے لکھنؤ ریڈیو کے لئے ریکارڈ کروا دے گا۔ بہت ہی اچھا ہوا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے چچا میاں کے ہاں ضلع فیض آباد کے اس خوبصورت علاقے میں آگئی۔

جہاں چچا میاں نے کروآہا راج والوں کی یہ کوٹھی کرائے پر لے رکھی تھی۔ یہاں کی یہ نغمہ ریز، شعر پرور، پرسکون فضا، یہ کوئیا کے ہرے کنج اس کے لئے بہت ہی (یعنی کہ موزوں تھے) نجانے ان پر سے کتنے طوفاں — کتنے طوفاں — وہ پھر شعر کی طرف متوجہ ہوئی۔ "بٹیا چلئے کھانا ٹھنڈا ہوت ہے" برآمدے میں سے نوکر نے آواز دی۔ چچا میاں غروب آفتاب کے وقت ہی کھانا کھا لیتے تھے۔ تاکہ کھانے کے کمرے کے لیمپ پر زیادہ پتنگے نہ جمع ہو سکیں۔

اسے اندر جانا پڑا۔

"یہ سب محض جسم ہی جسم ہیں۔ صندلی۔ گرم، خوبصورت۔ روح کہیں نہیں ملتی۔ کہیں نہیں ملتی"۔ شانتی نکیتن کے اوشیر لہری نے اکتا کر برش ایک طرف رکھ دیئے اور ریویدار وں کے پرے پہاڑی نالے کو دیکھنے لگا۔ جس کے شفاف، پرشور دھارے میں راج ہنسوں کی قطار کا عکس لرز رہا تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور ہوا درختوں میں تھکی تھکی انگڑائیاں لے رہی تھی اور چپکے چپکے روتی جاتی تھی۔

"یہ نوبڑی پرانی پکار ہے، بھائی۔ تمہیں روح کہاں ملے گی۔ ان ٹیڑھے ترچھے نقوش اور تیز رنگوں میں تم زندگی کو سمیٹ لاتے ہو اور پھر روح کی تلاش میں نکلتے ہو۔ تاریک گلیاں جہاں بارش کے ٹھہرے پانی میں سڑک کے مدھم لیمپوں کا عکس جھلملاتا ہے اور جہاں سے وائلن کے بیمار سُر بلند ہوتے ہیں۔ جگمگاتے کاشانے جہاں گریا ناچ ناچے جاتے ہیں اور کوئیائیں سجتی ہیں۔ یہ ہرے جنگل اور اکیلے پہاڑوں کی وادیاں — ان سب جگہوں میں تم منزلِ لیلیٰ ڈھونڈنے آئے ہو۔ بیوقوف ہو تم۔ روح تو محض آرٹ

میں ہے۔ انسانوں میں نہیں ہے۔" وہ بھی اکتا کر چپ ہو گیا۔

اوشیر وقت گذارنے کے لئے اس کا اسکیچ بنا رہا تھا۔ لیکن اب اُن کے چاروں طرف اندھیرا اُبھرتا جا رہا تھا۔ وُہ دونوں خاموشی سے اس چٹان پر بیٹھے رہے۔ وہ ساری دنیا گھوم چکے تھے۔ لیکن انہیں کہیں بھی اپنا گھر نہ ملتا تھا۔ انہوں نے پہاڑی نالے کے اس پار نظر ڈالی۔ ایک بے پروا، مہکتی، سہکتی دُنیا دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں رقص گاہوں کے سرخ پردوں کے پیچھے مرمریں ستونوں پر رقصاں پرچھائیاں لرزتی تھیں اور موسیقی کا ابلیس چیختا تھا۔ جہاں قہوہ خانوں میں سنگ مرمر کی میزوں کے گرد چھوٹے چھوٹے انسان اپنی اپنی مضحکہ خیز مسرتوں اور دکھوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ جہاں جوہی کے گجروں میں لپٹی، کنول کے پھولوں ایسے پیروں والی راجکماریاں لکشمی کے آگے جھم جھم کی آرتی جگاتی تھیں۔

خودرو پہاڑی پھولوں کے انبار سنبھالے، قہقہے لگاتی چند لڑکیاں آبشار کی سمت جاتے ہوئے ان کے نزدیک سے گذریں۔ ان کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور پھولوں کے گچھے اور کچے پہاڑی پھلوں کی ڈالیاں جو انہوں نے راستے میں توڑی تھیں۔ ان کے پیچھے پگڈنڈی پر گرتی جا رہی تھیں اور وُہ انہیں روندتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔

اوشیر اپنی اسکیچ بک پر جھکا رہا۔ اس کے بالوں کی ایک چھوٹی سی لٹ اس کی آنکھوں پر آ گری۔

لڑکیوں نے ہنس کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اب یقیناً یہ اس کافی ہاؤس والے آرٹسٹ کی طرح سامنے آ کر کہے گا۔ میں نے آپ کی یہ تصویر آپ کی اجازت کے بغیر بنا لی ہے۔ اس گستاخی کو معاف کیجئے اور اس پر اپنے دستخط کر دیجئے۔ لیکن وہ

اسی طرح چپ چاپ چٹان پر بیٹھا رہا۔

اسکیچ بنانا بھی بڑا دلچسپ مشغلہ ہے"۔ لڑکیوں نے آپس میں بڑی بے تعلقی سے رائے ظاہر کی اور پھولوں کو سنبھال کر آگے چلی گئیں۔

—— ایک کارواں ہے جو آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ماضی کا افسوس اور فردا کی فکر اس کی رفتار پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ نئے دن آتے ہیں۔ نئی راتیں آتی ہیں۔ جھکڑ چلتا ہے۔ آندھیاں اٹھتی ہیں۔ انسان جیتے ہیں اور مرتے ہیں۔ دل ٹوٹتے ہیں اور جڑتے ہیں۔ کسی کو موت آتی ہے۔ کسی کو نہیں آتی۔ نیند بھی نہیں آتی۔ یہ چکر یونہی چلتا رہے گا۔ سب انشیجبت ہیں۔ سب دکھی ہیں۔ یہ سایہ دار راستے، ان کے کنارے کھڑے ہوئے ہرے درخت، دھان کے کھیتوں اور چائے کے باغوں میں کام کرتی۔ برہا کے گیت الاپتی ہوئی لڑکیاں خچروں اور ریل گاڑیوں کی قطاریں، یہ سب گذر جاتے ہیں۔ کارواں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اگلے لمحے ہم سب ایک دوسرے آسمان کے نیچے ہوں گے۔ ایک دوسرے ہوا کے جھونکے ان پتوں کو چھوئیں گے۔ ان لڑکیوں کے آنچلوں کو ان کے بالوں کو اڑائیں گے۔ ہوائیں پرانی مانوس خوشبوئیں اپنے ساتھ لاتی ہیں اور انہیں ہمارے آس پاس بکھیر کر آگے چلی جاتی ہیں۔ دوسرے انسانوں کو چھیڑنے، انہیں دوسری یادیں دلانے، کاش ایسا ہوتا —— ایسا ہوتا ——

کاش بہار ہی نہ آتی۔

"وہ مارچ کا مہینہ تھا"۔ اوشیر نے اسکیچ بک ایک طرف رکھ کر کہا "جب جھیلوں میں نیلے اور سفید پھول کھلتے ہیں اور وہ خوبصورت تھی۔ وہ امرت شیر گل کی طرح سیدھی مانگ نکال کر اپنے لمبے، سیاہ اور سیدھے بالوں کو پیچھے سمیٹ لیتی تھی اور ڈچ

فنکاروں کی تصویر کی ایسی نظر آتی تھی۔ تم نے کبھی دیکھا ہے کہ گلاب کے پھول اپنی جھاڑیوں کے بجائے گلدان میں زیادہ رنگین، زیادہ روشن اور جاندار لگتے ہیں۔ اندھیرے میں جگمگاتے ہوئے ان کے سرخ شگوفے۔ ان کی تیز خوشبو۔ ان کا گہرا مخملیں رنگ۔ وہ ان کرداروں میں سے تھی جو سارناتھ کی دیواروں اور وشوابھارتی کے صنم کدوں کے نقوش میں نظر آتے ہیں اور اماوس کی پراسرار کالی راتوں میں وینا کی گونج اور دھمک کے ساتھ یک بیک جاگ اٹھتے ہیں اور پھر اس اندھیرے میں اپنی بڑی بڑی ترچھی آنکھیں کھولے زندگی کو چپ چاپ تکتے رہتے ہیں۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے کہیں آگ لگ گئی ہے اور اس کے شعلوں کی سرخ پرچھائیاں آنکھوں میں گھسی جا رہی ہیں اور دم بالکل گھٹا جاتا ہے اور میں نے سوچا۔ یہ زندگی ہے۔ زندگی کی جو تصویریں بنانا چاہتا تھا۔ زندگی جو مجھے کہیں نہ ملتی تھی وہ ہمالیہ کے درختوں تلے جنگل کے دیوتاؤں کے ناچ میں مصروف تھی۔ میں نے ایک دیودار کے پیچھے چھپ کر اسی وقت اس کا اسکیچ بنایا اور بعد میں مدتوں اس میں رنگ بھرتا رہا۔ کیسے کیسے رنگ تھے وہ سین دادا مجھ سے ہنس کر کہتے۔ تم تو چھوکرا ایک دم پاگل کا موافک ہے۔ ایسا ایسا بے مطلب تصویر بنانا جس کا کوئی پچاس روپیہ بھی نائیں دیگا پھر وہ موسم گل کی شہد کی مکھیوں کی طرح ہمالیہ کی کھلی فضاؤں میں ناچتے ناچتے دیوداروں کے سایوں میں غائب ہوگئی۔ وہ مجھے پھر کہیں نظر نہ آئی۔ اس تصویر پر گرد جم گئی۔ اس کے پیسٹل کے سارے ذرے گر گئے۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کے نقوش مدھم پڑ گئے"

اوشیر خاموش ہوگیا۔ شام کے مکمل سکوت میں پہاڑی نالے کا شور تیز ہوگیا۔

وہ بھی اوشیر کے قریب چٹان پر چپ چاپ بیٹھا اپنی کالی پلکیں جھپکا رہا تھا۔ شمالی ہند کی اس ہری وادی میں اس کا پڑاؤ پچھلے ہفتے سے تھا۔ وہ بہت دور سے آ رہا تھا بہت

دنیا گھوم کر وہاں پہنچا تھا اور اسے پھر وہاں سے آگے، جانے کہاں کہاں جانا تھا کیمپ کی وجہ سے وہاں پر جنگل میں منگل ایسا لگ رہا تھا۔ غیر ملکی سیاح اور ہمالیہ کی ان خوبصورت چوٹیوں پر گرمیاں بسر کرنے کے لئے آنے والے لوگ آس پاس سے ٹہلتے ہوئے آبشار اور نالے کے کنارے آنکلتے تھے سلیکس میں ملبوس اسکیٹنگ کی شوقین لڑکیاں قہقہے لگاتی نالے کے پل کی ہموار سطح پر سے پھسلتی ہوئی گذرتی رہتی تھیں۔ ایسے ہی عارضی کیمپ، پڑاؤ، سفر، پھر پڑاؤ۔ اس کی زندگی اسی رفتار سے آگے نکلی چلی جا رہی تھی۔ کہیں سے گھومتا پھرتا اس کا پرانا دوست اوشیر اس وقت وہاں آنکلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کینوس اور ادھوری تصویروں کا تھیلا تھا۔ اس کے پاؤں خاک آلود تھے۔ اس کی آنکھیں بیخواب تھیں۔

"سنتے ہو۔۔۔ میں جنوبی ہند کے ایک بڑے جاگیردار کی امریکن بیوی کی تصویر بنانے کے لئے یہاں بلایا گیا تھا۔ لیکن میں اکتا گیا ہوں۔ میں شاید وہ تصویر بھی ادھوری چھوڑ دونگا وہ ہنومان جی کی شکل والا راجہ مجھے اس کا معاوضہ نہ دے گا۔ لیکن بھائی ہندوستان میں فنکاروں کو معاوضہ دینے نہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ موڈل کے تخت پر بیٹھ کر سگرٹ پر سگریٹ پیتی جاتی ہے اور مجھے اپنی بے معنی باتوں سے اکتا دیتی ہے اور اس تصویر کو اون لکر یا فیشن اینڈ بیوٹی میں بھیجنے والی ہے۔ لیکن میں تو اب یہاں سے بھی چلا جاؤں گا۔" اوشیر نے دفعتہً چٹان پر سے اٹھتے ہوئے کہا

"کہاں جاؤ گے تم؟" اس نے پوچھا

"میں۔۔۔ میں غالباً لکھنؤ چلا جاؤں گا۔ آرٹ اسکول کے پیچھے چنار کے درختوں اور سایہ دار روشوں میں گھری ہوئی سیتن دادا کی کوٹھی میری آخری جائے پناہ ہے اور

گومتی کے ساحل۔ بھائی تم نے کبھی گومتی کے پانی میں شفق کی سرخ پرچھائیوں کو لرزتے دیکھا ہے؟ ۔۔۔ لیکن ابھی تو میں ہردوار جا رہا ہوں۔"

"ہردوار؟"

"ہُم۔ ہردوار بھی بہت بڑی جائے پناہ ہے۔ پائین کے ہرے جنگلوں میں چھپی ہوئی ہمالیہ کی اونچی، اکیلی، برفیلی چوٹیاں اور زینبر رو ندیاں۔ ہر کی پوڑی، رشی کیش ۔۔۔ وہاں غالباً آتما کو سکون ملتا ہے۔"

"آتما کو؟"

"ہُم ۔۔۔ اوم شانتی، شانتی۔"

"کیا؟ ۔ کسی لڑکی کا نام ہے؟" اس نے اپنے خیالوں سے چونک کر بے پروائی سے پوچھا۔ اوشیر ہنس پڑا۔

پھر اس نے سوچا۔ اوشیر بھائی کیوں اتنے دکھی ہوتے ہو چلنے دو یہ زندگی کا چکر۔ ان دور دراز کوہستانی راستوں اور اجنبی گھاٹیوں میں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اپنے راستے چلی گئی۔ جانے کون سے دیس کو۔ اسے کبھی خیال بھی نہ آئیگا کہ ایک مرتبہ ایک گمنام غیر ملکی ہوٹل میں اس نے ایک اجنبی کے ساتھ انار کے درختوں کے تلے ایک شام گذاری تھی۔ اسے شاید یہ کبھی یاد نہ آئے گا۔ اس کا جانے کیسا گھر ہوگا۔ کون لوگ ہوں گے۔ اس کی زندگی کا پس منظر کیا ہوگا۔ اس کی اپنی دلچسپیاں ہونگی اپنے ساتھی ہوں گے۔ اپنی دنیا ہوگی۔ اس نے اس تخیل پرست بنگالی لڑکے سے کہنا چاہا۔ کیوں اتنے رنجیدہ ہو اوشیر لہری۔ تم روح کی تلاش میں کہاں بھٹکے پھروگے۔ چلو آگے چلیں۔ راستے کے اگلے قیام میں ہمیں عمدہ اسکاچ شراب ملے گی اور اچھی، دلچسپ،

شور مچانے والی، بشاش سفید فام لڑکیاں ملیں گی جو تمہیں ہلیٹی گر تیبل کے نئے گیت سنائیں گی اور تمہارے ساتھ رمبا ناچیں گی۔

وہ اوشیر کی طرف مڑا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ چٹان خالی پڑی تھی۔ اوشیر اپنا کینوس کا تھیلا لے کر وہاں سے جا چکا تھا۔ چٹان پر کچھ ٹوٹے ہوئے برش اور رنگوں کے خالی ٹیوب بکھرے رہ گئے تھے۔

رات کی پرچھائیں وادی پر پھیل گئی اور ہوائیں چپکے چپکے روتی رہیں۔

دفعتہً ہواؤں کے غمگین راگ دھیمے پڑ گئے اور رات کے گونجتے ہوئے اندھیارے میں بہت سی شگفتہ جوان آوازیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ گرمیوں کی رات کا جو ناقابل برداشت سکوت فضا پر طاری تھا اسے ان آوازوں نے کچھ دیر کے لئے منتشر کر دیا اور مدھم آسمان کے ٹمٹماتے ستاروں کے تلے کئی چھوٹے چھوٹے چمپئی اور سفید رنگت والے ہاتھوں نے مٹی کے دیئے روشن کئے اور انہیں ایک پیتل کی تھالی میں رکھا۔ تا کہ اس اندھیرے میں کچھ کمی ہو سکے اور وہ سب دور دور کی پگڈنڈیوں اور تاریک راہوں اور چھوٹے چھوٹے گھروں میں سے نکل کر ان دیوٹوں کی روشنی میں دریا کے کنارے ٹھنڈی گھاس پر آ بیٹھے۔ وہ طرح طرح کے لوگ تھے۔ رنگ محلوں میں رہنے والے راجکمار اور راجکماریاں تھیں اور تپتی مٹی پر پیدل گھومنے والے نوجوان تھے اور سفید ساریاں پہنے خاموش آنکھوں والی لڑکیاں تھیں۔ جن کے بالوں میں جوہی کے شگوفے سجے تھے۔ مٹی کے چراغوں کی جھلملاتی روشنی میں ان کے دل دھڑک رہے تھے اور ان کے نوجوان چہروں پر امید اور مایوسی اور بے یقینی اور خود اعتمادی کی پرچھائیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں

وہ بہت کچھ سوچتے تھے۔ بہت کچھ کر چکے تھے۔ انہیں ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ ان کے چاروں طرف ایک بہت بڑی اندھیری دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ اس دنیا سے وہ لڑتے آئے تھے۔ اس دنیا کے لئے انہیں ابھی اور لڑنا تھا۔ ان کے درمیان انقلابی خیالات والے بھی تھے۔ اعتدال پسندی بھی اور قنوطی بھی۔ بہت سے اپنے میں ہمت نہ پاتے تھے کہ جو کچھ وہ سوچتے ہیں سب کہہ اور کر ڈالیں۔ بہت سے ہر سمے اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی شکستوں اور ناکامیوں کے عادی ہو چکے تھے۔ پھر بھی ان سب میں ایک جذبہ تھا۔ ایک ہمت تھی۔ زندگی کی حرارت تھی۔ ایک چھوٹے سے گروہ کی زندگی کی نہیں۔ یہ کروڑوں انسانوں کی زندگی تھی۔ اس میں گرمی تھی۔ طاقت تھی۔ دیوانگی تھی۔ زندہ رہنے کا عزم اور مستقبل کی اچھی طاقتوں پر بھروسہ۔ ان کے قافلوں نے بڑے بڑے معرکے فتح نہ کئے تھے۔ ان کے آگے بڑھنے سے جو ریکھائیں بن رہی تھیں۔ ان کو نئی، اندھی اندھیری آندھیاں مٹاتی جاتی تھیں۔ لیکن وہ ہمت نہ ہارتے تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہو جاتے تھے۔ یہ نوجوان لوگ، ان کے شائع کئے ہوئے رسالوں اور مضمونوں کی اپیل ان کی ارگنائز کی ہوئی آرٹ کی نمائشوں کے ہجوم، ان کی تنظیم کی ہوئی ہڑتالوں اور مظاہروں کی کامیابی۔ ان میں سے بہت سے قید کی مصیبتیں جھیل چکے تھے۔ بہت سے پولیس کی سنگینوں کا مقابلہ کر چکے تھے۔ بظاہر یہ بہت معمولی چیزیں تھیں۔ لیکن انہیں اس سے کتنا سکھ کتنی تقویت محسوس ہوتی تھی۔ ان کے سامنے ایک آدرش تھا ایک تصور تھا۔ ایک خیال تھا۔ اس آدرش کے لئے اب تک بہت خون بہایا جا چکا تھا۔ دنیا کے سامنے نظریں نیچی کرنی پڑتی تھیں۔ عمل اور ردِ عمل کے چکر میں پڑ کر ایک عالم دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ بہت دفعہ ایسے وقت آئے تھے کہ ان کی ہمتیں ان کا ساتھ چھوڑ دیتیں ان کے

جی چھوٹے ہو جاتے۔ یہ اندھیرے، پرسکون کھلے میدانوں کے جلسے، یہ پربھات پھیریوں
کے گیت، یہ پرجوش تقریریں اور بلند ارادے، یہ سب ایک حماقت، ایک فریب معلوم ہوتے
لیکن وہ مٹی کے دئے پھر جل اُٹھتے۔ ان کا جذبہ پھر واپس آجاتا۔ ٹیگور کے گیت کی جھنکار
پر ان کی آنکھیں پھر کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ غالباً یہ شدید قسم کی جذباتیت تھی۔ لیکن جذباتیت
کمزور فانی انسانوں کے لئے بہت بڑا سہارا ہے۔ انسان محض مشین کبھی نہیں بن سکتا

آج کی رات وہ پھر گومتی کے کنارے گھاس پر اکٹھے ہوئے تھے۔ لڑکیاں ایک طرف کو
ٹولی بنائے بیٹھی تھیں۔ کچھ لڑکے ساحل پر پڑی ہوئی ٹوٹی کشتیوں پر جا بیٹھے تھے۔ پچھوا ہوا
دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی اور اس کی زد سے بچانے کے لئے لڑکیوں نے چراغ اپنے
آنچلوں کے نیچے رکھ دئے تھے۔ ان میں سے بہت سے تھکے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں
بے خواب تھیں۔ وہ گاؤں گاؤں گھومے تھے۔ وہ رات رات بھر جاگے تھے۔ جس زہر کو
پھیلنے سے وہ روکنا چاہتے تھے۔ وہ اب بہت اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ ان کی کوششوں
کو غلط روشنی میں دیکھا جاتا تھا۔ ان میں سے بعض کو غدار اور قوم فروش کہہ کر گالیاں
دی جاتی تھیں۔ ان سے پوچھا جاتا تھا۔ بھائی تمہیں ہیڈکوارٹرز سے کتنی تنخواہ ملتی ہے۔
میاں جتنے روپے تم وہاں سے لیتے ہو۔ اس سے دوگنے ہم سے لے لو لیکن خدا را
قوم کو نہ بیچو۔ قوم کو قدم قدم پر دوسروں کے ہاتھ بک جانے کا سخت خدشہ تھا۔

میٹنگ دیر تک جاری رہی۔ پھر یکایک ایک طرف سے ایک نووارد نے کھڑے
ہو کر کہنا شروع کیا۔ "میرے نوجوان رفیقو۔"

"میاؤں"۔۔ ایک آواز آئی

"ارے یہ یونیورسٹی کا اسٹائل کس نے شروع کر دیا۔" ایک لڑکی نے چپکے سے پوچھا

سب نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن مجمع بڑی سنجیدہ شکل بنائے بیٹھا تھا۔
تقریر پھر شروع ہوئی "میرے نوجوان رفیقو۔ آج ہم اس لئے یہاں جمع ہوئے ہیں"
"کہ آپ ہمیں بور کیجئے"۔ کسی نے چپکے سے کہا۔
تقریر جاری رہی۔ "ہم دیکھتے ہیں کہ گو دنیا میں فاشیت کو فی الحال شکست ہوئی ہے۔ لیکن فاشسٹ ذہنیتیں ہمارے درمیان ہمارے خلاف برسر پیکار ہیں۔ لیکن خدا کی قسم رجعت پسندوں کو شکست ہوگی۔ ہمیں ۹ راگست یاد ہے۔ ہمیں بنگال یاد ہے"۔
"ارے ۹ راگست کو تو یہ مسوری میں مکرجی کی لونڈیا کے ساتھ تفریح کر رہا تھا"۔
"یہ کوئی کمیونسٹ معلوم ہوتا ہے"۔
"نہیں کمیونسٹ نہیں ہے۔ ابھی خدا کی قسم کھا رہا تھا"۔
"یہ باہر کے عناصر کہاں سے آگئے۔ انہیں نکالو ــــ"
"بھائی کب تک باہر اور اندر کے چکر میں رہو گے"۔ نوجوان ایک دوسرے سے چپکے چپکے کہہ رہے تھے۔ وہ تھکے ہوئے تھے اور اب تھوڑی دیر کے لئے ہنسنا چاہتے تھے۔
"روشی ڈارلنگ تم کب آئیں؟" لڑکیوں نے بھی اکتا کر آپس میں باتیں شروع کر دیں۔
کچھ دیر بعد غیر ملکی لیڈر نے اپنی تقریر ختم کی۔ مجمع میں بے چینی سی پھیل گئی۔ ٹوٹی ہوئی کشتیوں کے پرے سے ایک اور انسان اندھیرے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"یہ کون ہے؟ جرکٹ معلوم ہوتا ہے۔ بالکل چڑیماروں کی شکل ـ" لڑکیوں نے چپکے سے کہا۔ "ہش ـ سنو تو وہ کیا کہہ رہا ہے"۔
"میں مس عرفان علی سے پھر درخواست کروں گا کہ وہ نیو آیرا کے اس مضمون کے متعلق اپنے پرچے کی آئندہ اشاعت میں معذرت فرمائیں۔ جس میں انہوں نے خاکسار کی

پارٹی پر حملہ کیا ہے۔"

"ارے بھئی آپ کی تعریف؟"

"ارے یہ تو سید افتخار صاحب ہیں۔ تسلیمات عرض کرتا ہوں قبلہ۔"

"سید صاحب فاختہ اڑائیے۔ نیوا براسے آپ کو کیا مطلب"۔ پچھلے منفرر کی تقریر کی وجہ سے وہ سب اپنے آپ کو بیحد بشاش محسوس کر رہے تھے۔

"میں محترمہ اڈیٹر صاحبہ سے خود بات کرنا چاہتا ہوں"۔ وہ گرجا۔

"یہ تو کوئی ففتھ کالمسٹ جان پڑتا ہے"۔ کسی نے آہستہ سے کہا۔

"جی نہیں میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو دشمنوں کا روپیہ لے کر اپنا ضمیر فروخت کرتے ہیں۔"

"اپنے الفاظ واپس لیجیے گا قبلہ۔"

"بھائی تم ہماری میٹنگ میں شرکت کر کے ہم ہی سے لڑنے آئے ہو"۔ کسی اور نے رسان سے اس سے کہا۔

"ٹھہریے بھائی میں سید صاحب سے خود کچھ کہنا چاہتی ہوں"۔ یہ اس لڑکی کی آواز تھی۔ جسے ابھی سید صاحب نے مخاطب کیا تھا۔ وہ مٹی کا چراغ اونچا اٹھا کر مجمع کے سامنے آ گئی۔ سب بالکل خاموش ہو گئے۔

وہ دیر تک جو کچھ اسے کہنا تھا کہتی رہی۔ پھر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنا پسندیدہ نغمہ شروع کیا جس کی لہریں انہیں ہمیشہ محسوس ہوتا تھا۔ اس سکوت میں ستاروں کی موسیقی میں گھل مل کر فضا میں ابد تک لرزتی رہیں گی۔ پھر اپنی اپنی ٹولیوں میں بکھر کر باتیں کرتے ہوئے ان کا مجمع منتشر ہو گیا۔ ہوا کے جھونکوں سے سارے دیئے بجھ گئے اور گرمیوں

کی بھیگتی ہوئی رات کی تنہائی اور سناٹا پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا۔

اور اس رات کروا ہا راج کی سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی رخشندہ بیگم نے خواب میں دیکھا کہ جانے کن انجانی پگڈنڈیوں پر چلتی وہ پھر اخروٹ اور انجیر کے درختوں میں گھری ہوئی اس الف لیلیٰ ایسی وادی میں پہنچ گئی ہے۔ جہاں اس نے اس چھوٹے سے غیر ملکی ہوٹل میں انوکھے اور اجنبی لوگوں کے ساتھ ایک شام گذاری تھی۔ وہاں پر نیز سرخ شعلہ رنگ پھول آگ کی طرح لہلہا رہے تھے اور اندھیرے راستوں پر جھاڑیوں کے پیچھے سبز جگنو چمکتے تھے اور چاند کے سائے میں رات کے پراسرار پرندے پرانے صحرائی کھنڈروں میں چلا رہے تھے۔ رات بہت پرسکون تھی اور انگور اور زرد گلاب کی بیلوں میں چھپے ہوئے شہ نشین میں گٹار اور مینڈولین کی آواز بہت گہری ہوتی جا رہی تھی اور ایک پرانا گیت۔۔۔ جھیل کے کنارے مرغزاروں کے سارے خرگوش ساری گلہریاں، سارے اود بلاؤ سب اکٹھے مل کر ایک پرانا گیت الاپ رہے تھے۔ میں نے اسے کیپری کے جزیرے میں دیکھا۔ میں نے اس سے کہا۔ خاتون، میں تو ایک لاابالی سیلانی ہوں۔ میں تو ایک۔۔۔ خرگوش ہوں۔۔۔ اس کے سارے پیارے ساتھی اس وقت جانے کہاں بھاگ گئے تھے۔ گنی اور ڈائمنڈ اور کرسٹابل اور کرن۔ اور اس کا بھائی پی چو۔ اسے بہت گرمی معلوم ہوئی اور اس نے مسہری کا پردہ اٹھا کر پی چو کو آواز دی۔

"ہوں۔۔۔ ہوں۔۔۔ کیا بات ہے روشی۔۔" برآمدے کے سرے پر لیٹے ہوئے اس کے بھائی نے ایک آنکھ آدھی کھولی اور کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔

باہر رات کے پچھلے پہر کی مدھم چاندنی میں چمپا اور مولسری اور سرو کی قطاریں ساکت

کھڑی تھیں۔ دور اصطبل کے پیچھے ایک بھولا بھٹکا پلّا باریک آواز میں چلّائے جا رہا تھا۔ گرمیوں کی رات کی اس طلسماتی خاموشی میں جبکہ ساری کائنات چاندنی کے گونجتے ہوئے سناٹے میں گہرے گہرے سانس لیتی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنی کالی بڑی بڑی آنکھیں کھولے ہری گھاس کے ٹھنڈے شبنم آلود قطعے کو دیر تک چپ چاپ پڑی دیکھتی رہی۔ بچپن میں گرمیوں کی ایسی ہی چاندنی راتوں میں یکایک آنکھ کھل جانے پر اسے اسی برآمدے کے ستونوں کی آڑ میں طرح طرح کی مزیدار شکلوں والے بھتنے نظر آیا کرتے تھے۔ نیند ہرگز نہیں آ رہی تھی اور وہ چپ چاپ لیٹ کر صبح کا انتظار کرتے کرتے اکتا گئی تھی۔ پی چو، اس کا بھائی گہری نیند سو رہا تھا۔ ورنہ وہ اس سے ہی باتیں کرتی۔ پولو میاں ہجان کے ساتھ پہلو کے برآمدے میں سوتا تھا۔ ممی کی صبح کی نماز میں ابھی بہت دیر تھی۔ مولسری کی قطار کے پرے صحنچیوں میں غفران منزل کی ساری مہریاں اور مغلانیاں خواب خرگوش میں مصروف تھیں سب سو رہے تھے۔ صرف وہ جاگ رہی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے وہ دلچسپ خواب پھر سے دیکھنا شروع کر دینا چاہا لیکن سپنوں کی اس ٹوٹی ہوئی کڑی کو وہ کسی طرح نہ جوڑ پائی۔

تب اس نے دل میں کہا ”بھئی واہ۔ یہ اچھا مذاق ہے“!

پھر گومتی کے خوابیدہ پانیوں پر سے بہتے، مولسری اور رات کی رانی کی ٹہنیوں میں سے گذرتے آدھی رات کی ہوا کے جھونکے آئے اور وہ سو گئی۔

صبح ہوئی اور سورج مولسری کے درختوں پر آ گیا۔ تب شعلہ پری نے صحنچی میں سے گل شبّو کو آواز دی۔ ”بٹیا کو ابھی نہ جگانا۔ رات اپنی میٹنگ میں گئی رہیں۔ بہت تھکی ہوئی ہیں۔ گل شبّو نے باورچی خانے کی طرف جاتی ہوئی زمرد سے کہا ”بٹیا کو نہ جگانا۔ نہیں

بگڑے جھیلیں۔"

زمرد نے برآمدے کی سیڑھیوں پر آکر عباسی خانم کو یہ سنایا

عباسی خانم نے آفتابہ تخت کے نیچے سرکا کر پائنچہ اڑستے ہوئے اندر بڑے کمرے میں آکر کنور رانی کو اطلاع دی۔" بٹیا اور پی چو بھیا اب لگ سووت ہیں۔ آٹھ بجے جاگ کے چاء خاطر شور مچیہیں۔ پھر اتو موڑ برات ہے۔"

کنور رانی نے تخنوں کے بچو کے پر وظیفہ پڑھتے پڑھتے زور سے ہوں کی اور تسبیح سجدہ گاہ کے پاس رکھ کر اعمال کی ایک اور کتاب اٹھالی اور تعقیبات میں مصروف ہوگئیں۔

حالانکہ عباسی خانم کی یہ اطلاع ان کے لئے بے حد پریشان کن تھی کہ آج صبح صبح ہی ان کا موڑ پرا آتا ہے۔ اگر عباسی خانم اپنی ناسازی طبع کی وجہ سے اپنی صحنچی میں جا کر اپنگڑی پر نیم دراز ہو جاتی تھیں تو غفران منزل کا سارا انتظام تھوڑی دیر کے لئے درہم برہم ہو جاتا تھا اور کنور رانی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک روز بھی عباسی خانم کے بنا غفران منزل کی زندگی کے کل پرزے کس طرح چل سکتے ہیں۔

عباسی خانم اپنی صحنچی کی چوکی پر بیٹھ کر کھٹا کھٹ ڈلی کاٹنے میں مشغول ہو گئیں۔ شعلہ پری اور گل شبّو صحن کی نہر کے کنارے کنارے گذرتی ہوئی سرعت سے صبح کے ناشتے کے انتظام میں ادھر ادھر آ جا رہی تھیں۔

رات کی سکون بخش ٹھنڈی چاندنی کے مقابلے میں یکایک سورج کی تیز کرنوں کی چمک اس کی آنکھوں کو بہت تکلیف دہ معلوم ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر ایک لمبی انگڑائی لینے کے بعد۔ پی چو کے پلنگ کی طرف دیکھا۔ وہ اب تک مزے سے سوتا

تھا اور شاید عمدہ عمدہ گھوڑوں اور نئی نئی قسم کے ہوائی جہازوں کے خواب دیکھ رہا تھا۔ رخشندہ کا جی چاہا کہ پھر سے سو جائے۔ دونوں بہن بھائیوں میں اکثر زیادہ دیر تک سونے کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ اگر دونوں میں سے ایک کسی دوسرے کو سوتا دیکھ لیتا تو فوراً خود آنکھیں بند کر کے ولائی میں پھر منہ چھپا لیتا۔ یہاں تک کہ کنور رانی اندر سے آ کر جگاتیں یا عباسی خانم چائے کی کشتی لے کر آ کھڑی ہوتیں۔

پوپو کا ایک کتا باہر مولسری کے پیڑ پر چڑھی ہوئی گلہریوں کی تاک میں درخت کے چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ پوپو کب کا اٹھ چکا تھا اور غسلخانے میں گھسا زور زور سے گا رہا تھا۔

پھر وہ آخر کار اٹھ بیٹھی۔ اس کو جاگتا دیکھ کر فوراً پی چو بھی ایک زوردار انگڑائی لے کر پلنگ پر سے نیچے کود آیا۔

"سلامالے کوم روشی" اس نے بڑے تپاک سے کہا۔ گویا آج ہی مدتوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔

"والے کم" رخشندہ نے جواب دیا۔ گویا آپ سے مل کر مجھے بے حد مسرت ہوئی چھوٹے کنور صاحب۔

وہ دونوں عنقریب کسی مسئلے پر الجھ کر لڑنا شروع کرنے والے ہی تھے کہ شعلہ بی بی چائے لے کر آ گئی۔

"بٹیا کو میاں بلاوت ہیں" اس نے کشتی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ کہدو ہم ابھی آتے ہیں" رخشندہ نے جواب دیا۔

"واللہ مزا آئے گا۔ اب ڈانٹ پڑنے والی ہے تم پر" پی چو نے بیحد خوش ہو کر کہا۔

"تم پر پڑے گی۔ مجھے کیوں ڈانٹنے لگے میاں"
"دیکھ لینا۔ ابھی اوپر سے روتی ہوئی تھوتھنی لئے آؤ گی۔"
"اور تم خود۔ تمہیں تو میاں نے ایک آوپل خرید دینے کا وعدہ کیا ہے جناب"
"اوپل نہیں میاں تو تمہیں ڈیکوٹا پلین خرید کر دیں گے۔ اسپیشل ٹرین چھوڑ دائی
جائے گی آپ کے لیے۔ مجھے تو لگتا ہے۔ وہ جیرکٹ رات والا سید افتخار رنیوا پرا
کا قصہ بے کر میاں کے پاس پہنچ گیا ہے۔" پی چو نے کہا۔
وہ جلدی سے چائے ختم کر کے دوسری منزل پہ پہنچی۔
کروا راج کے کنور عرفان علی خاں اپنے کمرے میں چھت سے لٹکتے ہوئے
صوفے پر بیٹھے قانون شطرنج میں مصروف تھے اور پیچوان گڑگڑاتے جاتے تھے۔
"تسلیم میاں۔" رخشندہ نے دروازے میں پہنچ کر اپنی رفتار کم کرتے ہوئے کہا
"جیو بٹیا۔ تمہارے سر کا درد اب کیسا ہے۔ رات تم لوگ۔ اپنی میٹنگ کی وجہ سے
شاید بہت دیر تک جگتے رہے ہو۔"
وہ کنور صاحب کے پاس صوفے پر آ بیٹھی اور قالین پہ پیر ٹکا کر جھولنے لگی۔ ان کی
موڈ اچھی دیکھ کر وہ اوپل کا تذکرہ چھیڑنے والی تھی کہ کنور صاحب نے قانون شطرنج بند کر کے
تپائی پہ رکھا ہوا ایک لفافہ اٹھا لیا۔
"لالہ یہ پرچہ کل شاہ امبر لیپر ہاؤس سے لائے تھے۔ ان لوگوں نے شاید تم سب
کو کھانے پر بلایا ہے۔ اپنی ممی کو دے دینا۔"
وہ دل میں بے حد خوش ہوئی۔ پی چو کو جلانے کا ایک اور بہت نادر موقعہ ہاتھ سے
آیا تھا۔ لالہ یہ خط لائے ہیں۔ یہ بڑی ہی ڈپلومیٹک بات ہے۔ اس نے زینے پہ

اترتے ہوئے سوچا۔

کنور رانی دعائے مشلول سے فارغ ہو چکی تھیں اور مہریوں کو دوپہر کے کھانے کے متعلق احکامات دینے میں مصروف تھیں۔

"ممی بہرلوامبرپور ہاؤس سے دعوت نامہ آیا ہے" لفافہ تخت پر پھینک کر وہ پی چو کی تلاش میں بھاگ گئی۔

عباسی خانم دعوت نامے کا مضمون سننے کے لئے غرارے کے پائینچے سمیٹتی تخت کے کنارے پر آبیٹھیں۔

کہ مہاراج کی کنور رانی سلطنت آرا بیگم بہت موڈرن آدمی تھیں۔ مہینے میں ایک آدھ بار کسی خلاور شو کی صدارت، یا ضلع کی سالانہ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ کے تقسیم انعامات، یا گورنمنٹ ہاؤس کے ایٹ ہوم کی شرکت اور اسی طرح کے دوسرے بیکار فیشن ایبل سوشل فرائض جوان کے سر آپڑتے تھے۔ وہ بڑے مزے سے انجام دے لیتی تھیں لیکن اس کے باوجود پرانے وقتوں کی وضعداری ان میں اس حد تک موجود تھی کہ دن بھر میں کنور صاحب سے ان کی اوفیشیل قسم کی ملاقات صرف دوپہر کے کھانے کے وقت ہوتی تھی۔ رات کا کھانا کنور صاحب باہر کے بڑے ڈائننگ روم میں مصاحبین اور احباب کے ساتھ کھاتے تھے۔ اس کے علاوہ ضروری بات چیت صرف مہریوں یا کروا ہاراج کے منیجر لالہ اقبال نرائن کے ذریعے کی جاتی تھیں یا پولو پی چو اور رخشندہ میں سے کوئی اس فرض کو انجام دے لیا کرتا تھا۔

دتے بچے میں سے کودکر رخشندہ پی چو کے ڈریسنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھا شیو کرنے کے بعد اپنی رونالڈ کولمین ٹائپ کی مونچھوں کی داہنی نوک

کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا تھا اور گنگناتا جاتا تھا۔

وہ جھرمٹ کے سے جو جب نکلے تو میں اتنا پوچھوں

کُھٹیاں لوگی؟

"ارے پی چو تمہاری سسرال ___" یہ بلند پایہ روح کو تڑپا دینے والا شعر سن کر

رخشندہ کو اتنی ہنسی آئی۔ کہ وہ اپنی اطلاع پوری نہ کر سکی۔

"کیا ہوا میری سسرال کو بھائی؟" پی چو نے آئینے کی طرف سے مڑ کر اپنا نعمہ ادھورا

چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"ارے تمہیں امبر پور ہاؤس بُرد کھوے کے لئے بلایا گیا ہے"۔

"ہزار بار تم سے کہا ہے کہ امبر پور شریف کا نام لینے سے پہلے وضو کیا کرو"۔

"ارے سنو تو۔ کل شام جو لالہ ممی کے سفیر خاص بن کر گئے تھے تو ___"

"پھر کیا ہوا اماں جلدی بتاؤ دیباچہ ختم کرو ___"

"اوفوہ تو تم ذرا شرماؤ تو سہی۔ مارے بیچ میں بولے جاتے ہو ___"

"شرما تو رہا ہوں بھائی یہی تو ہوں ہی اتنا بیشِ فُل"۔ پی چو نے بڑی معصومیت

سے کہا۔

"بالکل تم سے یادہ بیشِ فُل بھلا کون ہو گا۔ چُپ تو۔ لالہ جو یہ خط لائے ___"

"رہنے والله تم نے کیا صبح صبح کوفت کا ذکر چھیڑ دیا"۔ پی چو نے پہلی بار سنجیدگی سے

کہا اور پھر مونچھوں کی داہنی نوک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کوفت ___! بیٹے ہیں جناب کے پیچھے کود رہے ہیں۔ اچھا کون سا سوٹ

پہن کر جاؤ گے۔ میں بتاؤں۔ وہ پہنو ___ وہ والا جو ہے ___"

"میں جاؤں گا ہی نہیں" پی چو نے اسی سنجیدگی سے کہا

"اچھا بنئے مت آپ"

"پولو کو لے جاؤ میرے بجائے"

"باؤلے ہو گئے ہو تم۔ ممی تمہارے کان کھینچیں گی"

"کھینچنے دو۔ ذرا اور لمبے ہو جائیں گے تو زیادہ خوبصورت لگوں گا"

"غفران منزل میں قیامت اٹھے گی۔ یہ سمجھ لو"

"میں قیامت اٹھنے سے پہلے ہی اپنا تبادلہ پرتاپ گڈھ کا کرا لوں گا"

"پی چو بھئی واللہ انتہا ہٹ کی حد ہوتی ہے"

"اچھا اپنا لیکچر ختم کرو تو تمہیں یہ بتاؤں کہ ابھی کرسٹابل کا فون آیا تھا"

"اچھا" رخشندہ نے بلکلمنٹ رک کر کچھ سوچ کر کہا۔

"اور کرسٹابل نے کہا ہے کہ تمہارے اور پوڈی کے ہندوستان واپس آنے کے بعد آج وہ پہلا ڈنر دے رہی ہے۔ لہٰذا اس میں ہم سب کا شامل ہونا بہت ضروری ہے"

"دوسرے الفاظ میں یہ کہ آپ آج رات امبر پور ہاؤس نہیں جا سکتے"

"ظاہر ہے"

"بے وقوف ہیں آپ۔ بالکل"

"بے وقوف آپ خود ہیں"

وہ دریچے سے باہر باغ میں کود کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ایک قیامت صغریٰ تھی جو بلکلمنٹ برپا ہو گئی۔ ایک شورِ محشر تھا جو لگتا تھا کہ امبر پور ہاؤس میں

کے کلا ئیڈ روڈ والے پھاٹک سے لے کر عرش اعظم تلک کے کنگورے ہلائے دیتا ہے
"غفران منزل والیاں آگئیں" — مہریاں بولائی پھر رہی تھیں۔ یہ سن کر اور زیادہ بدحواس
ہوگئیں۔ امبرپور کی بڑی بیگم غفران منزل والیوں کے اب تک نہ پہنچنے سے خاصی پریشان
تھیں۔ ساری مہمان بیویاں جمع ہو چکی تھیں اگالدان و تکیوں سے لگی پان اور زردے میں مشغول
تھیں۔ جب تینی خانم نے جو برابر کے کمرے میں تختوں کے چوکے پر فیرینی کے پیالے
ترتیب دے رہی تھیں یہ سنا کہ سمدھیانے والیاں سچ مچ میں آن پہنچیں تو خوان پوش
اٹھاتے اٹھاتے دہلیز پر انہیں دو دفعہ ٹھوکر لگی اور کئی اگالدان قریب قریب الٹ
گئے۔ تب کہیں جا کر غفران منزل کی پرانی اسٹیوڈی بیکر آہستہ آہستہ امبرپور ہاؤس کی
سرخ برساتی میں داخل ہو کر سیڑھیوں پہ جھکے ہوئے پام کے پتوں سے آلگی۔ بیگمات
ایک ایک کرکے پائینچے سنبھالے ہال میں داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے خاصدان
اٹھائے مہریوں کی قطار اور عباسی خانم تھیں۔ پھر سے لڑکیوں کے ہجوم میں مدھم سا
شور اٹھا۔ رخشندہ بجیا آگئیں۔ رخشندہ بجیا دبلی ہوگئیں۔ نہیں رخشندہ بجیا پہلے سے زیادہ
موٹی لگ رہی ہیں۔ رخشندہ بجیا کو سمندر کی ہوا نے زیادہ خوبصورت کر دیا۔

"اللہ چودھرائن تمہری باٹ نہارت نہارت سویرا ہوگوا۔ ہم تو سوچت رہن
اتنی ابیر کر دہین۔ اب تم نہ آئیہو" امبرپور کی بیگم نے کہا۔

"پی جو موٹر یا کلب لے گئے رہن ابہی ماسے اب لگ ناہیں آئے سکن"
کروا ہا راج کی کنور رانی نے جواب دیا۔

پھر سب بیگمات باتوں میں مصروف ہوگئیں۔ لڑکیاں اپنی ٹولی بنا کر الگ جا بیٹھیں
باہر مہریوں اور خواصوں کی گہما گہمی اور آنے والی بیگمات کے آداب و تسلیمات کا سلسلہ

ختم ہوا اور حالات نارمل ہوئے تو فرنگی محل کی ایک بیگم نے کنور رانی سے پوچھا۔
"اللہ سلطانت باجی اب آپ ماشاءاللہ سے رخشندہ بٹیا کا بیاہ کب کریں گی قسم سے ہم تو اسی انتظار میں پڑے دن گنتے ہیں کہ آپ کے ہاں سمدھن بن کر آویں"
"پہلے پی چو پولو کے بیاہوں سے تو نپٹ لوں زبیدہ بیگم۔ کنور صاحب اپنی بٹیا کی فکر خود کریں گے۔ یہ انہیں کا کام ہے۔" کنور رانی بولیں۔ پی چو کا نام سنکر لڑکیوں نے اپنے کان کھڑے کئے۔

"اے ہے چودھرائن کا ہے نہیں دونوں کو ساتھ لیتی آئیں۔ مدتوں سے دیکھا ہی نہیں انہیں۔ جب مارٹینر میں انور کے ساتھ پڑھتے تھے۔ تب کبھی کبھی آیا کرتے تھے۔" امبرپور کی بیگم کی دیورانی نے کہا۔
"رخشندہ نے صبح پی چو سے چلنے کے لئے کہا تو تھا۔ لیکن انہیں اپنے فلائنگ کلب اور گھوڑوں سے ہی فرصت نہیں جو کہیں آویں جاویں اور اب اتنے دنوں بعد پولو اور رخشندہ لکھنؤ واپس آئے ہیں تو دوست ایک پل کے لئے نہیں چھوڑتے۔" کنور رانی نے کہا۔

"اللہ تو ہمیں کیا دشمن مقرر کیا ہے جو دوستوں سے فرصت نہیں۔ قسم سے رخشندہ بیگم تم اور تمہارے بھائی بہت ہی بے مروت نکلے بڑے ہو کر۔" امبرپور راج کی چھوٹی بہو بیگم نے شکایت کی۔
"بھئی اللہ ہم ابھی پی چو کو فون کئے دیتے ہیں۔" رخشندہ نے کہا۔
"ہاں بٹیا ان سے کہدو کہ سب کھانے پر تم دونوں کی راہ دیکھتے ہیں۔ گھر ہی پر ہوں گے اس وقت؟"

"گھر، دلہن بھابی" اس وقت تو پی چو پولو عموماً دلکشا کلب میں پائے جاتے ہیں"۔ رخشندہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر وہ فون کرنے کے لئے گیلری میں چلی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ سب لڑکیاں بھی باہر آ گئیں۔

کچھ دیر بعد اس نے گیلری میں سے کہا "پی چو کہتا ہے میں امبر پور ہاؤس آ کر کیا کروں گا جب میں وہاں پہنچتا ہوں۔ سب لوگ ایک دم سے پردہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں"۔

لڑکیوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ امبر پور راج کی جمیلہ سلطانہ جھپٹ کے اندر بھاگ گئی۔

"اے لڑکیو ہم بھی آویں؟" امبر پور راج کی چھوٹی بہو بیگم نے گیلری میں آ کر ہنسی میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

"اے لو لڑکیوں کی کانفرنس تو گیلری ہی میں شروع ہو گئی"۔ کسی نے ہال میں آ کر کہا

"ممی پی چو نے کہا ہے کہ میں ابھی آتا ہوں، لیکن زیادہ دیر نہ ٹھہر سکوں گا۔ کیونکہ ممی ہمیں ابھی کرسٹابل کے ہاں "لالہ رخ" بھی جانا ہے"۔ رخشندہ نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد برساتی میں ایک اودی کار زناٹے سے آ کر رکی اور پی چو اور پولو امبر پور ہاؤس کے مردانہ ڈرائنگ روم میں دوسرے لوگوں کے پاس جا بیٹھے۔ لڑکیوں کے نرغے میں بڑی کھلبلی مچی۔ بیگمات نے بھی کھڑکیوں کے شیشے میں سے انہیں برآمدے گذرتے ہوئے ایک جھلک دیکھ لیا۔ پھر کھانا شروع ہوا اور ان آفیشیل طور پر ایک طریقے سے گویا بردکھوا انجام پایا۔

"فوں — فوں" پی چو نے امبر پور ہاؤس کے پھاٹک سے نکل کر جھنجھلاہٹ کے ساتھ کار کی رفتار ایک دم بہت تیز کر دی۔

"اچھا ہوا پی چو تم آ گئے۔ ورنہ ممی بہت بگڑتیں"، رخشندہ نے کہا

پی چو خاموش رہا۔

"لالہ رخ میں زندگی کیسی چل رہی ہے"۔ رخشندہ نے تھوڑی دیر بعد کشن پر سے سر اٹھا کر پوچھا۔

"بالکل فٹ۔ صرف حفیظ احمد کی ناک زکام کی وجہ سے لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ جسکی وجہ سے وہ بے حد انٹلکچوئیل لگنے لگا ہے"۔

"اور کون کون آ رہا ہے آج کرسٹابل کے ہاں"؟ رخشندہ کو حفیظ احمد کا یہ حلیہ سوچ کر ہنسی آ گئی۔

"تمہاری میڈ ہیٹر زپارٹی ان لمٹیڈ تو ساری تشریف لائے گی۔ صرف کرن نہیں ہوگا"۔ پولو نے کہا

"اے روشنی یہ امبر پور والوں کا بھتیجا آج نظر نہیں آیا"۔ پی چو نے بےتکلفی سے کہا۔

"کون بھتیجا"؟ رخشندہ کو امبر پور والوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ آج محض ایک ڈپلومیٹک مشن پر وہاں گئی تھی۔

"ڈون الوز دی گریٹ"۔ پی چو نے کہا۔

"وہ تو آج کل فیض آباد میں فلسفہ حیات پر ریسرچ کر رہا ہے"۔ پولو ہمیشہ ضروری معلومات بہم پہنچا کر پھر خاموش بیٹھ جاتا تھا اور پائپ پیتا رہتا تھا۔

کلائیڈ روڈ پر سے مڑ کر کارلٹن ہوٹیل کے اونچے اونچے دیودار کے درختوں کے سامنے سے گذرتے شاہ نجف روڈ پہ وہ "لالہ رخ" کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ آسمان پہ گرمیوں کی رات کے دھیمے تارے جھلملا رہے تھے اور فضا میں سکندر باغ

کے پھولوں کی مہک اڑنے لگی تھی۔

"ارے ہائے روشی ڈارلنگ تم آگئیں"۔ سرخ بالوں والی کرسٹابل حفیظ احمد لالہ رخ کے برآمدے میں سے اتر کر لان کی طرف بھاگتی ہوئی آئی۔

"ارے ہائے پولو ڈارلنگ تم آگئے"۔ سارنگ پور کے راجہ حفیظ احمد خان نے پی چو اور پولو کے قریب پہنچ کر لڑکیوں کے ایک دوسرے سے ملنے کے انداز کی نقل کی۔ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"اے معزز حاضرین! آج پی چو میاں سلمہٗ کا بردکھوا بخیر و خوبی انجام پایا"۔ رخشندہ نے کھانے کے بعد سب کو بتایا۔ زور زور سے تالیاں بجنے لگیں۔

پی چو ایک دم اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ "روشی اب گھر چلو"۔ اس نے پھر جھنجھلا کر کہا

"یہ کیا وحشت ہے"۔ حفیظ احمد نے پوچھا

"پولس میں رہ کر جنگلوں کی ہوا کھاتے کھاتے پی چو اب بالکل کاؤبوائے ہوتا جا رہا ہے"۔ ڈائمنڈ نے کہا۔ وہ سب باغ کی سڑک پر آگئے۔ یکایک رخشندہ کو کوئی بڑی ضروری بات یاد آگئی۔ وہ حفیظ احمد کو کھینچتی ہوئی برساتی کی روشنی میں لے گئی۔

"ارے حفیظ بھیّا۔ تمہاری ناک —"

سب اس کی ناک کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"پی چو نے اطلاع دی تھی کہ ہماری عدم موجودگی میں تمہاری ناک بہت لمبی ہو گئی ہے۔ لیکن یہ تو بالکل نارمل حالت ہے۔ مجھے اتنی فکر ہو گئی تھی کہ اب کرسٹابل بچاری تمہاری پلاسٹک سرجری کہاں کراتی پھرے گی"۔ سب شب بخیر کہنے کے لئے کرسٹابل کی طرف مڑے۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔

"کرسٹابل شاید نوکروں سے کچھ کہنے اندر گئی ہے۔ اچھا بھئی اب چلتے ہیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ ممی کی ڈانٹ پڑ جائے گی۔" رخشندہ نے کہا

سارے مہمان اپنی اپنی موٹروں میں جا بیٹھے۔

پی چو بہت پہلے سے کار کے اسٹیرنگ وہیل پر بازو رکھے چپ چاپ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

دوسری صبح رخشندہ کنور صاحب کے ساتھ چاء پی کر اوپر سے اترنے کے بعد اپنے ڈریسنگ روم کی کھڑکی میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ آج کے طویل اور اونگھتے اونگھتے دن میں اسے کون کون سے بیکار کام کرنے ہیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں ابھی بہت سی باقی تھیں۔ اب تک نینی تال جانے کا پروگرام نہیں بنا تھا اور ہر نیا دن ایک ہی سا طلوع ہوتا تھا۔ اس نے دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ دنیا یقیناً بہت بشاش تھی۔ زندگی کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ پھولوں کی کیاریوں میں پولو کے کتے تتلیوں کے تعاقب میں مصروف تھے۔ بڑی سہانی صبح تھی۔ کچھ ایسا وقت تھا۔ جس کی فضا سے متاثر ہو کر ایک بار براؤننگ نے لکھا تھا کہ دنیا میں ہر چیز بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور اللہ میاں مزے سے اپنی جنت میں تشریف رکھتے ہیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ بہت ہی خوش ہے۔ دنیا سے اُس کی مکمل صلح ہے۔ اس کا جی چاہا کہ خوب مزے کی باتیں کرے۔ سائیکل پر بنارسی باغ کی خاموش اور سایہ دار سڑکوں کے چکر لگائے۔ ڈائمنڈ کی کہ کرسٹابل ادما اور اپنی دوسری سہیلیوں کی پوری بریگیڈ کے ساتھ اسی وقت نیوانڈیا کافی ہاؤس پہنچ جائے۔ اور وہاں اپنے پسندیدہ کونے میں کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر خوب چلّا چلّا کر باتیں کرے

اور قوالی گائے غسل خانے میں چھپ کر پی چو کے سارے سگریٹ پی ڈالے۔ اپنے سب دوستوں کو فون پر یہ خبر سنائے کہ فی الحال وہ غم دوراں اور غم جاناں کی ہر فکر سے آزاد ہے تب مولسری کی کلیوں کو باغ کی ٹھنڈی، نم زمین پر بکھیرتا پروائی ہوا کا ایک جھونکا کھڑکی کے شیشوں سے آٹکرایا اور باغ کے شبنم آلود سفید شگوفوں کی تیز خوشبو اس کی چھوٹی سی میڈونا کی ایسی ناک میں گھسی اور اسے پچھلی چاندنی رات کا وہ ادھورا دھندلا خواب یاد آیا اور اسے بڑی عجیب قسم کی تکلیف محسوس ہوئی اور وہ زندگی کی بھرپور مسرتوں پر زیادہ دیر تک خوش نہ رہ سکی۔

اسی وقت باہر پولو کا مختصر ترین کتا اپنی نازک آواز میں بھونکا۔ گویا گڈ مارننگ مائی ڈیر ڈیر پی چو، پولو کے سارے کتے انگریزی میں بھونکتے تھے اور دوسرے لمحے کھڑکی میں سے کود کر پی چو اندر آگیا۔ پی چو اور رخشندہ ہمیشہ ایک دوسرے کے کمروں میں کھڑکی کے راستے داخل ہوا کرتے تھے۔

اس نے دیکھا کہ رخشندہ بڑی رنجیدہ شکل بنائے ناخنوں پر کیوٹکس کا بادامی شیڈ لگانے میں مصروف ہے۔ وہ بھی اتنی ہی رنجیدہ شکل بنا کر اس کے قریب دریچے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔

"پی چو تم تو خبطی ہوتے جاتے ہو تھوڑے سے" رخشندہ نے بڑی فکرمندی کے لہجے میں ناخنوں کو روشنی میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اور یکلخت پی چو کی ساری شگفتگی واپس آگئی۔ حالانکہ رات "لالہ رخ" سے واپس آنے کے بعد سے اب تک وہ اپنے کمرے میں پھولے تلے کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا تھا اور صبح کو کنور صاحب کے ساتھ چائے پینے کے لئے اوپر بھی نہیں گیا تھا۔

"کہت کبیر سنو بھئی سادھو" اُس نے بات شروع کی۔

"فرماؤ" رخشندہ نے رنگوں کی شیشیاں ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم یہ اپنا منہ کیوں لٹکائے بیٹھی ہو"

"تم بات تو بتاؤ۔ کوئی پروگرام ہے؟"

"پروگرام نہیں تو میں اپنے کمرے سے اتنی دور چل کر محض آپ کے روئے پر نور کی زیارت کے لئے آیا ہوں"۔

"تو کہو تو سہی"۔

"پہلے تم تیار ہو جاؤ جھٹ پٹ"۔

رخشندہ نے کھڑکی سے نیچے اترنے میں ذرا کاہلی کی۔

"ارے بھئی کرن انڈونیشیا سے واپس آ گیا ہے اور نو بجے دلّی سے یہاں پہنچ رہا ہے"

"کرن آ گیا ہے۔ اوہ۔ گنّی کو پتہ ہے؟" رخشندہ فوراً کود کر نیچے اتر آئی۔

"گنّی کو کیسے معلوم ہوتا۔ رات ہی تو وہ کرسٹابل کے ہاں آئی تھی۔ کرن کا تار تو مجھے ابھی ملا ہے"۔

"ارے تو پھر اسے بتاتے چلیں یہاں سے سیدھے امونسی تھوڑی جائیں گے۔ راستے میں گنّی ڈائمنڈ فیروز سب کو لیتے چلیں گے"۔

"گویا پوری استقبالیہ کمیٹی امونسی پہنچے گی۔ کرن کو اندازہ تو ہو ہی جائے گا۔ کہ چین اور انڈونیشیا ہو آنے سے وہ یکایک کتنی اہم ہستی بن گیا ہے"۔

وہ غسلخانے میں پہنچ چکی تھی۔

کچھ دیر بعد پی جو اور رخشندہ غفران منزل کے پھاٹک سے نکل کر پھر مال پر آ گئے

اتوار کی صبح تھی۔ اس لئے حضرت گنج کی ساری دوکانیں بند تھیں۔ لیکن دونوں قہوہ خانوں کے آگے بہت چہل پہل تھی۔ بادل گھر آئے تھے اور موسم میں کچھ کچھ ٹھنڈک آچلی تھی۔

ایبٹ روڈ کے چوراہے پر پہنچ کر رخشندہ نے کہا۔ "پی چو لیشو دھرا موسی سے کہتے چلو کہ ٹنی کو ہمارے ساتھ اموتسی بھیج دیں"۔

"کیا لیشو دھرا موسی کے ذریعے مجھے پٹواؤ گی؟"

"تو ہم یہ تھوڑی بتائیں گے کہ کرن کو لینے جا رہے ہیں"۔

"جی نہیں"۔

وہ چپ ہو گئی۔ وہ لورٹیو کانونٹ کے آگے سے گذر رہے تھے۔ اسی وقت دلکشا کی طرف سے آتی ہوئی ایک نیلے رنگ کی ٹوسیٹر زن سے ان کے قریب سے نکل گئی۔

"آ گیا ڈون آنور ——" پی چو بولا۔

"دی گریٹ"۔ پوتو نے مصرع طرح مکمل کر دیا۔

"تم دونوں اس قدر کے اینچی ہو خدا کی قسم"۔ رخشندہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ارے بھائی طبیعت گلیاڑ ہو رہی ہے۔ ذرا سوچو کرن سے اتنے دنوں بعد ملیں گے" پی چو نے کہا۔

ایروڈرم پر تھوڑی دیر کے لئے جنگل میں منگل ایسا ہو گیا تھا۔ میدان کی اونچی گھاس میں بہت سی موٹریں اور اسٹیشن ویگن کھڑے تھے۔ وہ تینوں آم کے جھنڈ میں کار کھڑی کر کے فلائینگ کلب کے برآمدے میں جا بیٹھے۔ ان کے بہت سے جاننے والے جو

اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لینے یا پہنچانے آئے تھے۔ ان کے پاس آ گئے۔
کچھ دیر بعد بھارت ایرویز کا ایک طیارہ آسمان پر سے اترا۔ اور گہری کھوئی کھوئی آنکھوں اور گھنگھریالے بالوں والا ایک کشمیری نوجوان اٹیچی کیس سنبھالے اپنی متجسس نگاہوں سے اپنے دوستوں کو تلاش کرتا مجمع سے باہر آیا۔
"ارے ہائے کرن بھیا۔" رخشندہ، پی چو اور لپولو اس کی طرف دوڑے اور اسے اپنے بازوؤں میں گھیر کر کار کی جانب آ گئے۔ سوالات اور جوابات جلدی میں سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔
"چنانچہ یہ یوں ہے۔" کار میں بیٹھتے ہوئے کرن نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔
"اور بتاؤ۔ لکھنؤ کے کیا حال چال ہیں۔" اس نے پوچھا۔
"سب بالکل ٹھیک ہے کرن بھیا۔" رخشندہ نے ہنس کر کہا۔
"لوگ باگ، مزے میں ہیں؟" کرن نے پوچھا
"بالکل۔ بڑا افسوس ہے کہ لوگ باگ اس وقت نہ آ سکے۔ میں نے تو کہا تھا پی چو سے" رخشندہ نے جواب دیا۔
کار اموسی سے لکھنؤ کی طرف کانپور روڈ کے سایہ دار راستے پر بڑی آرام دہ رفتار سے آ رہی تھی۔
"روشی تم تو اب بہت ہی بڑھیا ڈرائیو کرنے لگی ہو۔" کرن نے کہا۔
"تسلیم"
"اور کچھ نئی خبریں سناؤ۔ تم لوگ آج کل کاہے میں مصروف ہو؟"
"ہم لوگ؟ مقامی سیاست میں۔"

"مقامی سیاست؟"

"ہم تمہیں پتہ نہیں دلّی سے ایک لیڈرانِ قوم آئے ہیں۔ انہوں نے اپنا اسٹڈی سرکل قائم کیا ہے۔ کل میاں سے ملنے بھی تشریف لائے تھے کہ انہیں کچھ عطیے سے نوازا جائے۔"

"یہ اسٹڈی سرکل کاہے کے لئے ہے؟"

"یہاں کی ملّت بیضا میں قومی جوش پیدا کرنے کے لئے۔ کیونکہ ہماری قوم کو اکثریت سے پس جانے کا سخت اندیشہ لاحق ہو گیا ہے۔"

"ان لیڈرانِ قوم کا نام کیا ہے؟"

"سید افتخار علی اور میں نے ان سے کہا۔ آپ اپنے یہ ایڈونچر کسی اور جگہ کے لئے اٹھا رکھئے تو وہ کہنے لگے کہ آپ کی پارٹی اور آپ کا رسالہ شیشے کے گھروں میں محفوظ ہے۔ آپ کی زمینیں اور آپ کی زندگیاں صرف ہمارے رحم و کرم پر منحصر ہیں۔ کیونکہ الحمد للہ ملّت اب ہماری آواز پر لبیک کہنے کو تیار ہے اور انہوں نے نیا ایرا کے مقابلے میں ایک اردو رسالہ "ملّت بیضا" بھی جاری کیا ہے۔" پھر وہ چپ ہو گئی۔ کرن بھی خاموش رہا۔

"سنا ہے تمہارے ہندوستان واپس آنے کے سفر میں پچھلے دنوں بڑے ایڈونچرز رہے۔" کچھ دیر بعد کرن نے موضوع تبدیل کرنے کے لئے پوچھا

"بہت ـــ" رخشندہ نے جواب دیا اور کار کی رفتار اس سے ایک دم بہت تیز ہو گئی۔

تھوڑے وقفے کے بعد امو تی سے واپس آنے والی موٹریں گرد

اڑاتی ان کے برابر سے نکل جاتی تھیں اور پھر خاموشی پھیل جاتی تھی۔ ان چاروں کا
جی چاہ رہا تھا کہ بہت سی باتیں کریں۔ لیکن اتنی ڈھیروں باتیں تھیں کہ سمجھ میں نہیں
آرہا تھا کہ کہاں سے شروع کی جائیں۔

اپنے جھولتے ہوئے صوفے پر سے اتر کر کنور صاحب نے قانون شیخ یند کی اور لالہ
اقبال نرائن کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی۔ لالہ اقبال نرائن نچلی منزل کے دفتر کے
کمرے میں صبح سے ریاستی معاملات کے کاغذوں پر جھکے رہنے کے بعد اپنے منشیوں
کو چند ہدایتیں دے کر اندر تشریف لے جا چکے تھے۔ جہاں کنور رانی اپنی صحنچی میں خس
کی ٹٹیوں کے پیچھے بیٹھی ان سے مشورہ لیتی تھیں کہ پی چو بھیا کی نسبت اگلے چاند
امبرپور والوں کے ہاں کردی جائے۔ یا ابھی آئندہ ربیع الاول کا انتظار کیا جاوے۔
لالہ مونڈھے پر بیٹھ کر ٹانگ پر ٹانگ رکھنے اور زردہ پھانکنے کے بعد اپنی رائے
سے کنور رانی کو مطلع کرنے ہی والے تھے کہ اپنا پڑاتے کی اودی گوٹ کا لہنگا گھماتی
شعلہ پری برآمدے میں آکر بولی "لالہ تم کا میاں بلاوت ہیں"۔
"بہت خوب۔ ان سے عرض کرو کہ ابھی حاضر ہوا"۔ لالہ پھر زیر غور مسئلے کی
طرف متوجہ ہو گئے۔

نشست کے ایوان میں گھڑیال نے گیارہ بجائے۔ بچے ابھی کار لے کر نہ
لوٹے تھے اور کنور صاحب کو فیض آباد جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ اسٹیشن ویگن خراب
ہو کر کئی دن سے ایلین بری کے ہاں پڑی تھی اور ریل کے سفر کے گرمیوں کے موسم
میں کنور صاحب قائل نہ تھے۔ خاصے کے وقت میں بھی ابھی بہت دیر تھی۔ کنور صاحب

نے لالہ اقبال نرائن کے انتظار میں پھر کتاب اٹھا لی ۔ انہیں معلوم تھا کہ لالہ اس وقت کنور رانی کی پیشی میں ہیں ۔ بہت دیر میں وہاں سے چھٹکارا پاسکیں گے ۔

نیچے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں ۔ اندر ہال میں سجے ہوئے سنگ مرمر اور تانبے کے مجسموں اور پرانی روغنی تصویروں کے نقوش دوپہر کے اندھیرے میں زیادہ گہرے، زیادہ پراسرار نظر آرہے تھے ۔ فضا پر وہ خواب آگیں سناٹا چھاتا جا رہا تھا جو گرمیوں کی بھرپور دوپہروں میں کائنات کے ذرے ذرے میں سما کر دھیرے دھیرے دھڑکتا رہتا ہے اور خیال آتا ہے کہ اگر دنیا یہی ہے تو بری نہیں ۔

کنور صاحب نے دوبارہ گھنٹی بجائی اور پیچوان گڑگڑانے میں مصروف ہو گئے ۔ وہ شیشوں سے بنے ہوئے اس رنگ محل میں اسی طرح بیٹھے قانون شیخ پڑھتے اور چاندی کا پیچوان گڑگڑاتے رہتے تھے جو ان کے بزرگ صدیاں گذریں ۔ ان کے لئے تیار کر گئے تھے ۔ وہ بلا وجہ اس جگہ پر تھے ۔ جہاں آنکھ کھول کر انہوں نے خود کو موجود پایا ۔ گومتی کا جانے کتنا پانی چھتر منزل کی سیڑھیوں کے نیچے سے بہہ گیا تھا لیکن کروا ہاراج والوں کی زندگیوں میں کوئی فرق کوئی انقلاب نہ آیا تھا ۔ کنور صاحب سال کا زیادہ حصہ اپنی ریاست کے قصبے مانا ٹھیر میں گذارتے ۔ جاڑوں میں لکھنؤ آجاتے گرمیوں میں وائلڈ فلاور ہال نینی تال یا سوائے ہوٹل مسوری کو زینت بخشتے ۔ ان کے مشغلے تعداد میں بہت کم تھے ۔ سال میں چند مرتبہ قیصر باغ کی بارہ دری کے اعلیٰ پیمانے کے مشاعروں کی صدارت، برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا سالانہ ڈنر، گورنمنٹ ہاؤس کے ایٹ ہوم اور یونیورسٹی کے کورٹ کی میٹنگ جس کے وہ ممبر تھے ۔ کیونکہ اودھ کے دوسرے تعلقداروں کی طرح ان کے والد بڑے کنور صاحب مرحوم نے بھی کیننگ کالج

کی سر بفلک اور شاہانہ عمارتوں کی تعمیر کے لئے گرانقدر عطیئے دیئے تھے اور اس کا ذ
یونیورسٹی کے سینیٹ ہال کے پورچ میں ایک سنگ مرمر کے ٹکڑے پر مرقوم تھی
اور سینیٹ ہال کی اونچی، شاہ بلوط کی لکڑی سے مزین دیواروں پر صوبے کے سابق گ
اور دوسرے مہاراجاؤں اور نوابوں کی تصاویر کے ساتھ بڑے کنور صاحب مرحو
کی قدآدم روغنی تصویر بھی موجود تھی اور اس سینیٹ ہال اور اس یونیورسٹی میں جس کا
ذرہ ان کے پرکھوں کے روپے کا مرہونِ منت تھا۔ ایک احسان فراموش نس
نسل جاگیردارانہ نظام کے خلاف نعرے لگاتی تھی اور تجویزیں پاس کرتی تھی۔ کنو
خاموشی سے یہ سب دیکھتے تھے اور قانون شیخ اور مولانا روم کا مطالعہ کرتے رہ
تھے اور شام کو انڈین سول سروس کے معمر انگریز افسروں کے ساتھ شطرنج کھیل
چھتر منزل کلب چلے جاتے تھے۔ وہ ایک پرسکون نظام زندگی کا بے ضرر سا پرزہ
ان کی ذات سے نقصان کسی کو نہ تھا۔ فائدہ ہزاروں کو تھا۔ ان کے چند خاص اص
تھے۔ خاص عقیدے اور نظریئے تھے۔ روایات وضعداری اور آن کا تحفظ ان
نزدیک ان کا عزیز ترین فریضہ تھا۔ انہیں چند چیزوں سے بے پناہ نفرت تھی
وہ ان حقیر نو دولتوں کا ناقابلِ معافی وجود کسی طرح برداشت نہ کر سکتے تھے جنہیں
تکلفاً اوپری یا متوسط طبقہ کہا جاتا ہے۔ انہیں متوسط طبقے سے چڑ تھی۔ اس
نے ہر ملک میں ہر جگہ، ہر زمانے میں بڑی گڑبڑ پھیلائی ہے۔ بڑی بڑی گستاخانہ حر
کی ہیں۔ اس لڑتی جھگڑتی، خود غرض، کاروباری بورژوا دنیا میں سب سے الگ
صرف اپنے طبقے کے مٹھی بھر افراد کے ساتھ وہ پرانی تہذیب، پرانی روایات
ورثے کو لئے بیٹھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مخالف ہوائیں بہت تیز ہیں۔ کہاں

تہذیب اور کہاں کی وضعداری۔ یہ چراغ جو دو قوموں کے ثقافتی سنگم، تمدنی ہم آہنگی
نے صدیوں سے روشن کر رکھا ہے۔ کوئی دم میں بجھا چاہتا ہے۔ لیکن اس چراغ کی مدھم
روشنی نے ان رنگ محلوں میں جو دھندلا سا اجالا بکھیر رکھا تھا۔ وہی بہت بڑا جذباتی سہارا
تھا اور اسی لیئے چند سال قبل جب پی چو نے جو ریاست کا چھوٹا بیٹا ہونے کی وجہ
سے محض گذارے دار تھا۔ دفع الوقتی کے خیال سے نوکری کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ تو
کنور صاحب بہت بگڑے تھے۔ تاریخ میں آج تک ان کے خاندان میں کسی نے بھی
انگریزی سرکار کی ملازمت نہیں کی تھی۔ ان کے بزرگوں نے اودھ کی سلطنت کے
دم توڑنے کے زمانے میں نواب کی طرف سے کمپنی بہادر سے ٹکر لی تھی۔ جنرل ہیولاک
کی توپوں کا سامنا کیا تھا۔ مٹیا برج میں قید فرنگ کی صعوبتیں جھیلی تھیں۔ مانا ٹھیر میں
مہاراج کی حویلی کے تہ خانوں میں اب تک غدر کے وقتوں کے میگزین کا گولہ بارود
دفن پڑا تھا اور اُن کا بیٹا اسی انگریزی سرکار کی غلامی کرے۔ یہ ناممکن تھا۔ ان دنوں
جنگ نئی نئی چھڑی تھی۔ پی چو نے چپکے سے ایر فورس میں درخواست بھیجدی۔ پھر
الہ آباد جا کر انڈین پولیس کے مقابلے میں بیٹھ گیا اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ کنور
صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔ لیکن برابر کی اولاد تھی اور چہیتا بیٹا تھا۔ چُپ ہو گئے۔
مرادآباد کی ٹریننگ ختم کرنے کے بعد وہ کچھ عرصے تک اضلاع میں رہا اور پچھلے
سال بھر سے خوش قسمتی سے لکھنؤ ہی کی ملٹری پولیس میں اس کا تقرر ہو گیا تھا۔ پولو
ایک قسم کا چھوٹا موٹا پرنس آف ویلز تھا۔ خاموش طبیعت، سنجیدہ، کم سخن، اس کی
ساری دلچسپیاں فلائینگ کلب اور کتوں تک محدود تھیں۔ اس کی نسبت لڑکپن
ہی میں بڑی دھوم دھام سے اس کے ماموں کے ہاں کر دی گئی تھی۔ اور اس کے

بعد سے اس نے اس کے متعلق کچھ سوچنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ پی جو البر
کنور صاحب اور کنور رانی دونوں کے لئے "پرو بلم چائلڈ" ثابت ہوا تھا۔

کنور صاحب ایک حد تک بڑے وسیع النظر تھے۔ اپنی جوانی کے زمانے میں
یورپ گھوم چکے تھے۔ ایک زمانہ کے سرد و گرم سے واقف تھے۔ انہوں نے
تینوں بچوں کو ایسی تربیت دی تھی کہ ان میں خود اعتمادی، وسیع النظری اور عقید
کی پختگی پیدا ہو سکے۔ انہوں نے رخشندہ کو مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ کیونکہ
جانتے تھے کہ وہ اس کا غلط استعمال نہیں کرے گی۔ اس نے میرس کالج
پانچ سال کا کورس ختم کر کے بیچلر آف میوزک کی ڈگری لی تھی۔ اس نے ا
کے کلچر سینٹر میں رقص سیکھا تھا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ دلکشا
جاکر انگریزی ناچ میں شامل ہوتی تھی۔ وہ پی جو کی کار یا اپنی سائیکل پر جب چا
اور جہاں چاہتی آ جا سکتی تھی۔ اس کے ان گنت دوست تھے اور وہ سو
میں بے حد ہر دلعزیز تھی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ ایسی زندگی نہیں گ
تھی جس طرح کی زندگی "خوش قسمت اونچے طبقے" کی عورتیں گرمیوں میں مسور
جاڑوں میں بمبئی یا نئی دہلی میں بسر کرتی نظر آتی ہیں۔ کنور صاحب زندگی کے
میں جس ضبط و توازن، وضعداری کی جس آن کے قائل تھے۔ اس کا اثر رخشند
فطرتاً اس لئے کہ وہ عورت تھی سب سے زیادہ قبول کیا تھا۔

لیکن کنور رانی اور رخشندہ کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ بچپن
نینی تال کے اسکول کے بورڈنگ میں رہنے کی وجہ سے وہ ان سے زیادہ مانو
نہیں تھی۔ جب سینئر کیمبرج کے بعد وہ گھر واپس آئی تو اس نے غیر محسوس طر

خود کو کنور رانی سے بہت زیادہ اجنبی پایا۔ کنور رانی اپنے بیٹوں کو زیادہ چاہتی تھیں جس کا لازمی نفسیاتی ردِّ عمل یہ تھا کہ کنور صاحب رخشندہ کو دیکھ کر جیتے تھے۔ کنور رانی کی طبیعت بہت مختلف تھی۔ وہ بے تحاشا اونچے حسب نسب والی، مغرور، خود پسند سر تا پا کنور رانی ہی کنور رانی تھیں۔ مانا گھیر میں اور زعفران منزل میں محض ان کا حکم چلتا تھا۔ کنور صاحب کرو آہا راج کے صرف اس حد تک مالک تھے کہ لالہ اقبال زائن جب فیض آباد سے آئیں تو ان سے زمینداری کے جھگڑوں کے متعلق دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر لیں۔ ریاست کا کوئی ادق معاملہ آن پڑتا تو کنور رانی بڑے دلکش انداز سے سر ہلا کہ کہتیں — "ای کا جانت ہیں۔ لے بس اب رہے دیو" اور کنور صاحب وہیں معاملے سے دست بردار ہو کر اپنے مطالعے کے کمرے میں چلے آتے۔ کنور رانی اب کوئی نینتا لیس چوالیس برس کی رہی ہوں گی۔ لیکن اب تک غضب کی دلکش تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ رخشندہ نواں کے پاسنگ بھی نہیں۔ اب بھی وہ جہاں بیٹھ جاتی تھیں محفل جگمگا اٹھتی تھی۔ خاص خاص لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ کنور صاحب سے ان کی کبھی نہیں بنی۔ لیکن کنور صاحب خاموش طبیعت اور مرنجان مرنج آدمی تھے۔ اس لئے گذرے جاتی تھی۔

یوں اس گھرانے کی زندگی ایک نرم رو ندی کے مانند تھی جو سکوں سے بہہ رہی تھی اس میں تیز دھارے اور بھنور نہیں تھے۔ طوفانوں اور آندھیوں کا خطرہ نہ تھا۔ غفران منزل کے باغ کی ڈھلوان سے پرے شاہ نجف کے امام باڑے کی سیڑھیوں کے نیچے جس طرح گومتی صدیوں سے اسی آہستہ خرامی سے بہتی آ رہی تھی۔ اسی طرح غفران منزل کے باسیوں کی زندگی گذرے جاتی تھی۔ مولسری کے جھنڈ کے پیچھے

بعد سے اس نے اس کے متعلق کچھ سوچنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ پی چو البتہ
کنور صاحب اور کنور رانی دونوں کے لئے "پرابلم چائلڈ" ثابت ہوا تھا۔

کنور صاحب ایک حد تک بڑے وسیع النظر تھے۔ اپنی جوانی کے زمانے میں
یورپ گھوم چکے تھے۔ ایک زمانہ کے سرد و گرم سے واقف تھے۔ انہوں نے اپنے
تینوں بچوں کو ایسی تربیت دی تھی کہ ان میں خود اعتمادی، وسیع النظری اور عقیدے
کی پختگی پیدا ہو سکے۔ انہوں نے رخشندہ کو مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ کیونکہ
جانتے تھے کہ وہ اس کا غلط استعمال نہیں کرے گی۔ اس نے میرس کالج
پانچ سال کا کورس ختم کر کے بیچلر آف میوزک کی ڈگری لی تھی۔ اس نے الم
کے کلچر سینٹر میں رقص سیکھا تھا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ دلکشا کل
جا کر انگریزی ناچ میں شامل ہوتی تھی۔ وہ پی چو کی کار یا اپنی سائیکل پر جب چاہ
اور جہاں چاہتی آ جا سکتی تھی۔ اس کے ان گنت دوست تھے اور وہ سوسا
میں بے حد ہر دلعزیز تھی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ ایسی زندگی نہیں گذا
تھی جس طرح کی زندگی "خوش قسمت اونچے طبقے" کی عورتیں گرمیوں میں مسوری
جاڑوں میں بمبئی یا نئی دہلی میں بسر کرتی نظر آتی ہیں۔ کنور صاحب زندگی کے ہر
میں جس ضبط و توازن، وضعداری کی حس آن کے قائل تھے۔ اس کا اثر رخشندہ
فطرتاً اس لئے کہ وہ عورت تھی سب سے زیادہ قبول کیا تھا۔

لیکن کنور رانی اور رخشندہ کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ بچپن
نینی تال کے اسکول کے بورڈنگ میں رہنے کی وجہ سے وہ ان سے زیادہ مانو
نہیں تھی۔ جب سینئر کیمبرج کے بعد وہ گھر واپس آئی تو اس نے غیر محسوس طر

خود کو کنور رانی سے بہت زیادہ اجنبی پایا۔ کنور رانی اپنے بیٹوں کو زیادہ چاہتی تھیں جس کا لازمی نفسیاتی ردِ عمل یہ تھا کہ کنور صاحب رخشندہ کو دیکھ کر جیتے تھے۔ کنور رانی کی طبیعت بہت مختلف تھی۔ وہ بے تحاشا اونچے حسب نسب والی، مغرور، خود پسند سر تا پا کنور رانی ہی کنور رانی تھیں۔ مانا ٹھیر میں اور غفراں منزل میں محض ان کا حکم چلتا تھا۔ کنور صاحب کرو آہا راج کے صرف اس حد تک مالک تھے کہ لالہ اقبال زائن جب فیض آباد سے آئیں تو ان سے زمینداری کے جھگڑوں کے متعلق دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر لیں۔ ریاست کا کوئی ادق معاملہ آن پڑتا تو کنور رانی بڑے دلکش انداز سے سر ہلا کہ کہتیں ــ "ای کا جانت ہیں۔ لے بس اب رہے دیو" اور کنور صاحب وہیں معاملے سے دست بردار ہو کر اپنے مطالعے کے کمرے میں چلے آتے۔ کنور رانی اب کوئی تینتالیس چوالیس برس کی رہی ہوں گی۔ لیکن اب تک غضب کی دلکش تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ رخشندہ نواں کے پاسنگ بھی نہیں۔ اب بھی وہ جہاں بیٹھ جاتی تھیں محفل جگمگا اٹھتی تھی۔ خاص خاص لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ کنور صاحب سے ان کی کبھی نہیں بنی۔ لیکن کنور صاحب خاموش طبیعت اور مرنجان مرنج آدمی تھے۔ اس لیے گذرے جاتی تھی۔

یوں اس گھرانے کی زندگی ایک نرم رو ندی کے مانند تھی جو سکوں سے بہہ رہی تھی اس میں تیز دھارے اور بھنور نہیں تھے۔ طوفانوں اور آندھیوں کا خطرہ نہ تھا۔ غفراں منزل کے باغ کی ڈھلوان سے پرے شاہ نجف کے امام باڑے کی سیڑھیوں کے نیچے جس طرح گومتی صدیوں سے اسی آہستہ خرامی سے بہتی آ رہی تھی۔ اسی طرح غفراں منزل کے باسیوں کی زندگی گذرے جاتی تھی۔ مولسری کے جھنڈ کے پیچھے

سے سورج ایک ہی طرح کے دنوں پر طلوع ہوتا تھا۔

چنانچہ رخشندہ نے اموسی سے واپسی پر کرن سے کہا "سب بالکل کُشل ہے
اور کرن بھی خوش ہوگیا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ غفران منزل کے بہن بھائی جہاں
اپنے ساتھ آفتاب کی خوشگوار کرنیں بکھیرتے جاتے ہیں اور گھنگھریالے بالوں
کرن بہادر کا ٹجو خود کو ان پیارے اچھے دوستوں کے درمیان ایک بار پھر موجو
کچھ دیر کے لئے اپنے سارے رنج بھول گیا۔ اسے یاد نہ رہا کہ اتنے مہینوں تک
صحافتی مشن پر چین اور انڈونیشیا رہ کر وہاں کی خونریزیاں دیکھتے دیکھتے وہ زند
کتنی نفرت کرنے لگا تھا۔ اسے اس کا خیال بھی نہ رہا کہ کرشن نرائن کول آئی
ایس کی اکلوتی بھوری آنکھوں والی لڑکی گیتی سے جسے وہ مستقل ساڑھے تین سا
سے برابر اور بیکار چاہے جا رہا ہے۔ اس کی کسی طرح بھی شادی نہیں ہو سکتی
وہ چاروں غفران منزل کے باغ کی سایہ دار، سُرخ بجری والی سڑک پر پہ
گئے۔ پی چو کے سٹنگ روم میں ڈائمنڈ اور راوما اور وِمل پہلے سے آچکے تھے
اتوار کا دن تھا اور سب پر چھٹی منانے کی موڈ سوار تھی۔
"ارے بھائی یہاں تو پوری پنچایت جمع ہے"۔ رخشندہ نے خوش خو
برآمدے میں پہنچتے ہوئے کہا۔
"ارے کرن بھیّا"۔ سب اپنی اپنی جگہ سے اُچک پڑے۔
"افوہ بھئی کرن۔ اب ہم اترائیں گے"۔ پی چو نے کہا۔
"کرن بھیّا سنو تو۔" ڈائمنڈ نے بات شروع کرنی چاہی۔

"ٹھہرو۔ کرن بھائی اب صرف انٹرویو دیا کریں گے۔ پائنیر میں چھپے گا۔ کل شام کرن بہادر کالچو نے کارلٹن ہوٹل میں پریس کو ایک بیان دیتے ہوئے کہا:۔

—"کہ چونکہ مجھ سے زیادہ چغد آدمی گورنمنٹ آف انڈیا کو انڈونیشیا بھیجنے کے لئے نہ مل سکا۔ اس لئے —" پی چو نے رخشندہ کا جملہ مکمل کر دینا چاہا۔ لیکن قہقہوں کا شور سب پر غالب آ گیا۔

"ڈائمنڈ ہمارے پیچھے لکھنؤ میں کیا کیا سانحے گذرے۔ سب مفصّل بیان فرماؤ"۔ کرن نے دیوان پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

ڈائمنڈ نے جو اسکنڈلز کی انسائیکلوپیڈیا اور ہواز ہُو کی تازہ ترین جلد تھی اپنی رپورٹ شروع کی۔ قہقہوں کے شور سے کمرہ گونج اُٹھا۔ تھوڑی دیر بعد گل شبّو نے اندر آ کر کہا "بھیا بٹیا۔ سب لوگ چلئے کھانا ٹھنڈا ہوتا ہے"۔ وہ سب ڈائننگ روم کی طرف چلے گئے۔

دوپہر کا خوشگوار سنّاٹا گہرا ہوتا گیا۔

غفران منزل میں اتوار کی سہ پہریں اور چھٹی کے دن اسی طرح گذرا کرتے تھے۔ ان سب کو غفران منزل سے بڑی محبت تھی۔ اس کے آرام دہ اندھیرے کمروں سے، اس کے خوبصورت باغ سے، اس کی بیحد گھریلو فضا سے، اس کے ہرے درختوں کے سائے میں انہوں نے ایسی کتنی ہی دوپہریں اکٹھی گذاری تھیں۔ وہ جاڑوں میں لان پر سن شیڈز کے نیچے بیٹھ کر نیو ایرا کے لئے اڈیٹوریل اور مضمون لکھتے۔ و مل ریڈیو پر جو انگریزی ڈرامے پروڈیوس کرنے والا ہوتا۔ اس کی ریہرسلیں وہیں لان پر کی جاتیں۔ وہاں سب جمع

ہوجاتے۔ ڈائمنڈ، گنی، کرسٹابل، فیروز سب بحثیں کرتے۔ ریڈیو ڈرامے کی
ٹکنیک پر ہر ایک اپنی اپنی ٹانگ اڑاتا۔ کرن کی انگریزی نظموں پر تنقید کی جاتی
وہ سب موسیقی کے دیوانے تھے۔ ان کی میوزک پارٹیاں پہروں ختم نہ ہوتیں۔ دوستو
نے عفران منزل کا نام جنرل ہیڈ کوارٹرز رکھ چھوڑا تھا۔ ان سب کو ایک دوسرے
کی رفاقت پر، خلوص کے جذبے پر بھروسہ تھا۔ اور یہ بھروسہ، یہ یقین بہت سی زندگیوں
کے لئے بہت بڑا سہارا تھا۔ وہ سب ذہین، بشاش طبیعتوں کے مالک تھے
وہ زندگی میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ لڑکیاں چوکلیٹ کھاتے کھاتے فلسفہ حیات
پر لمبی لمبی بحثیں کرتیں۔ "تم جنگلی خرگوشینو زیادہ باتیں نہ بناؤ"۔ کرن کہتا۔ "جو
پہلا گنجا موٹا بے ڈکا کنوارا آئی سی ایس تمہیں آج ہی شام کو کلب میں ٹکرائے گا
اس سے شادی کرکے ہندوستان کے کسی اور دلکشا یا چھتر منزل کلب کی برج
کھیلنے والی اور ڈنر پارٹیاں دینے والی تیسرے درجے کے ذہن کی مکمل میزبان
مسز فلاں، بن کر رہ جاؤ گی۔ دیکھ لینا کوئی دن جاتا ہے کہ تمہارے سارے ارادوں
کسی آئی سی ایس کے ڈرائینگ روم میں خاتمہ بالخیر ہو جائے گا۔" "کرن تمہاری
اس ساری CYNICISM کی سائیکلوجی یہ ہے کہ"۔ رخشندہ ایک اور بحث
شروع کر دیتی۔ یا فیروز گاندھی بیچ میں اپنا ایک لطیفہ ٹپکا دیتا۔ فیروز کے لطیفے
بہت مزیدار ہوتے تھے۔ اکثر پی جو بیٹھے بیٹھے تجویز کرتا کہ تم لڑکیاں ذرا بہت سارا
ناشتہ تیار کر کے بارہ بنکی چل دو جھٹ پٹ۔ آم کے باغوں میں سفیدے کھا
لکھنؤ سے باہر نکل کر بارہ بنکی جانے والی سایہ دار سڑک پر رخشندہ یا گنی اپنی مرضی کے
مطابق نہایت تیز رفتار سے کار چھوڑ دیتی۔ تو پی جو بے حد سنجیدگی سے سب کی

لائف انشورنس کمپنیوں کے پتے نوٹ کرتا رہتا۔ ڈنر کے بعد پارٹیاں اگر ڈل ہونے لگتیں۔ تو پی چو بڑے کمال سے موقعے کو سنبھال لیتا۔ اگر کبھی بار کرن کی موڈ خراب ہو جاتی تو وہ ایسے مزے مزے کی باتیں کرتا کہ سب بے اختیار ہنس پڑتے۔

چھٹیوں کی ایک سہ پہر رخشندہ اور ڈائمنڈ نے انکشاف کیا کہ "آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے" والی قوالی کے ریکارڈ پر بہترین والز ہو سکتا ہے۔ رخشندہ بھاگی بھاگی گئی اور پی چو اور کرن کو باہر سے بلا لائی۔ جہاں وہ بڑی سنجیدگی سے کسی مسئلے پر جھگڑ رہے تھے۔ "پی چو اب تم ہمارا ڈیمانسٹریشن ڈانس دیکھو"۔ رخشندہ اور ڈائمنڈ کمرے کا قالین ایک طرف ہٹا کر ریکارڈ پر والز کرنے لگیں۔ پی چو ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔ "مانتے ہیں سلیمان۔ تم لوگ ورسٹائل ۔۔ کیا کرن؟"

"ورسٹائل جینیس" ۔۔ کرن نے مدد کی "حق ہے"۔ پی چو کہتا۔ "اچھا اب "علی بابا" بجاؤ"۔ یہ پی چو کا ایک پسندیدہ باڈلا سا رمبا کا ریکارڈ تھا۔ اس کا نام بہت دلچسپ تھا۔ "رمبا مسلمانا"۔ اس میں ایک عورت انتہائی باریک آواز میں کارمن میرانڈا کے گانوں کی طرح کا ایک عجیب سا گیت جانے کون سی زبان میں گاتی تھی اور کرن کہتا تھا۔ بھئی یہ کیا قصہ ہے۔ نینی تال کے اسکول اور الہ آباد اور لکھنؤ کی یونیورسٹیاں سپر انٹلکچوئل سے کم کچھ پروڈیوس ہی نہیں کرتیں۔ ہماری بہنوں کو دیکھ لیجئے۔ خدا کی عنایت سے سب کی سب ایک سے ایک۔ ورسٹائل جینیس چلی آ رہی ہیں۔ سب خوب ہنستے۔

جاڑے کی راتوں میں جب ردولی، سندیلے اور فیض آباد سے رشتے دار لڑکیاں آجاتیں تو اندر صحنچیوں میں گھنٹوں ڈھولک بجتی۔ عباسی خانم سے پرانے قصے اور داستانیں سنی جاتیں۔ پھر برسات کا زمانہ آتا۔ باغ پر گھٹا جھکی کھڑی ہے۔ برآمدے میں

آموں کی کھانچیاں رکھی ہیں۔ جامن میں جھولا پڑا ہے۔ جامنیں ٹپ ٹپ گرتی جاتی ہیں۔ لڑکیاں تانیں اڑا رہی ہیں۔ ساون اور بارہ ماسے اور کجریاں الاپی جا رہی ہیں ساون جھرلا گے ہو دھیرے دھیرے ۔۔۔ اور ۔۔۔ اونچی اٹریا بچھوا باجے۔ رُوم جھوم بدروا برسے ۔۔۔ برکھا کے مہینوں میں باغ کے پتے پتے پر نکھار آجاتا تھا اور فضا میں مہک امنڈتی تھی۔ غفران منزل کا خاصا بڑا باغ تھا اور رنگ برنگے شیشوں والے دروازے اور کھڑکیوں کے بڑے بڑے اندھیرے کمرے تھے۔ جن کی دیواروں پر منقش فریموں والے قدِ آدم آئینے لگے تھے۔ ان آئینوں نے گذرتے ہوئے وقت کی جانے کتنی پرچھائیاں بکھی تھیں اور چھت گیریوں سے جھاڑ فانوس ٹنگے تھے۔ کوٹھی کے پچھلے حصے میں ڈیوڑھی سے اندر جا کر ایک اور باغ تھا جس میں زیادہ تر لیموں، مولسری، انار اور فالسے کے پیڑ تھے اور بیچ میں ایک لمبی اور پتلی نہر تھی جس کی منڈیر پر بیٹھ کر مہریاں خوش گپیاں کیا کرتی تھیں۔ اوپر کی منزل پر منقش، جالی دار شہ نشین تھے اور گیلریاں تھیں اور لکڑی کے زینے تھے۔ جن پر بچھے ہوئے قالین اب بالکل گھس چکے تھے۔

غفران منزل اگلے وقتوں کی کوٹھی تھی۔ آج کل کے مکانوں میں ایسا آرام ایسی کشادگی اور خوبصورتی کہاں۔ اب تو سب لوٹا کر سیمنٹ کے ایسے ایسے بے تکے گھر بنانے لگے ہیں جیسے جیومیٹری کی شکلیں آڑی۔ ترچھی، کانی، بے ہنگم۔ رخشندہ کو ہر پرانی بات کی طرح اپنا یہ پرانا گھر بہت پسند تھا۔ اسے خوشی تھی کہ کنور صاحب نے فیشن میں آکر چھاؤنی یا لالاپلاز میں اپ اسٹارٹس جیسی سیمنٹ کی کوٹھی نہیں بنوا ڈالی اسے اپنے ہاں کا پرانی وضع کا بھاری آبنوسی فرنیچر پسند تھا اور پرانے جھاڑ فانوس۔ ان رنگ برنگے وزنی جھاڑ فانوسوں پر عموماً گرد اٹی رہتی تھی۔ کیونکہ غفران منزل میں نہ تو اتنے فالتو اور مستعد

نوکر تھے جو قدر کے وقتوں کے جھاڑ جھنکاڑ کی صفائی میں اپنا سر کھپاتیں اور نہ کسی کو انکی پرواہ تھی۔ یہی کافی تھا کہ ٹنگے تو ہیں۔ پرانے اچھے وقتوں کی یادگار۔ وہ پرانے اچھے وقت جب اتنی کم عمری میں نہ غم روزگار سے سابقہ پڑتا تھا نہ غمِ دل سے۔

ہائے وہ بھی کیا زمانے تھے جو گذر گئے۔ عباسی خانم کہا کرتیں جب غفران منزل غفران منزل تھی کہ رات کا وقت ہے۔ چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ بیلا پھول رہا ہے رات کی رانی بڑی مہک رہی ہے۔ بڑے کنور صاحب خلد آشیانی مہتابی پہ بیٹھے پیچوان گڑگڑاتے ہیں محفل جمی ہے۔ شعر و شاعری کی باتیں ہو رہی ہیں کہ اتنے میں پھاٹک پہ گھوڑا گاڑی آکر رکتی ہے اور ٹوپ لگائے ایک صاحب بہادر اترتے ہیں۔ انہیں قریب آتا دیکھ کر کنور صاحب خلد آشیانی آرام کرسی پر لیٹے لیٹے ہاتھ پھیلا کر فرماتے ہیں "اے اللہ بھائی ملکو میاں اتنے دنوں بعد یہ کیا جی میں آئی جو صورت دکھائی۔ قسم جناب امیرؑ کی عید کا چاند ہو کر رہ گئے ہو میاں تم تو۔ اور احباب کیا دیکھتے ہیں کہ صاحب گورنر بہادر سر میلکم ہیلی گاڑی سے اترے چلے آتے ہیں۔ ہائے کیا شاندار لوگ تھے۔ کیا محبتیں کیا وضعداریاں تھیں۔ ایک زمانہ وہ بھی عباسی خانم نے دیکھا تھا اور اب یہ دیکھتی تھیں کہ باہر خاک اڑتی ہے گھوڑوں کی سفید جوڑیوں اور بگھیوں کی جگہ ایک حماقت زدہ سی موٹر یا برساتی میں کھڑی ہے۔ دوسری کے انجن کے نیچے ہاتھ منہ میرا نیلا کئے پی چو بھیا لیٹے جانے کیا سٹر پٹر کر رہے ہیں۔ روشی بٹیا بالوں کی مینڈھیاں گوندھنے کی بجائے دوپٹہ اڑاتی سائیکل پر بیٹھ یہ جا وہ جا۔ کہاں گئی ہیں کہ بھئی ٹینس کھیلنے جا رہی ہیں۔

ریاست کی ماہانہ آمدنی گھٹتے گھٹتے پہلے سے آدھی بھی نہ رہی تھی۔ ملازمین کا اتنا بڑا عملہ رکھنے کی اب نہ ضرورت تھی نہ اس کا خرچ پورا ہو سکتا تھا۔ لیکن کنور صاحب پرانے

نمک خواروں، بوڑھے سربراہکاروں، منشیوں اور سپاہیوں کو وظیفے دئے جاتے تھے
پہلے لکھنؤ کے ہر خاندانی رئیس کے گھرانے میں جلشنیں ملازم ہوا کرتی تھیں جو محرم کے
دنوں میں اعلیٰ درجے کی سوزخوانی کرتی تھیں اور ماتم تو اس قدر زوروں کا کرتی تھیں کہ
دیکھنے والوں کو غش آجائے۔ غفران منزل میں بھی ایک زمانے میں درجنوں جلشنیں موجود تھیں
زمرد اور الماس ان کی آخری یادگار رہ گئی تھیں۔ غفران منزل کوئی چالیس بیالیس برس
پہلے بڑے کنور صاحب مرحوم نے صاحب لوگوں کے کہنے سے شہر کے باہر چیڑیا جھیل
میں اس لئے بنوائی تھی کہ یہاں سکندر باغ کی عمدہ مٹی میں بہت نفیس باغ تیار ہوگا۔ ہائے
چیڑیا جھیل کے نام سے سینے پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ عباسی خانم کہتیں۔ کیا
دن تھے۔ جب لکھنؤ لکھنؤ تھا۔ ارے اب یہ کونوں شہروں میں شہر ہے۔ موا دیس دیس
کا جنادر آکے بھر گیا ہے۔ مارا یکو ایک بنگالی، پنجابی، سندھی، دلی والے۔ سب ہی آ بسے، یہ
زبان یہاں کی بگاڑ دی۔ ہوا کہ یہاں کی گندا کر دیا۔ ایک زمانہ تھا کہ بھینسا کنڈا اور چیڑیا جھیل
اور بندریا باغ، سکندر باغ، دلکشا سب جگہ صرف صاحب لوگوں کی کوٹھیاں تھیں۔ یہ
حضرت گنج جہاں شام کو لڑکوں اور لڑکیوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تو بٹیا یہاں
پر نہ یہ نگوڑے تمہارے کافی ہاؤس تھے نہ یہ انگریزی بائیسکوپ۔ بس مرے کمپنی اور
وائٹ وے کی دوکان تھی اور ایسی دو چار اور انگریزوں اور پارسیوں کی دوکانیں تھیں
اور صرف صاب میم لوگ باہر گھومتے تھے۔ ٹھنڈی سڑک پر جب اندھیرا پڑے سفید
جوڑیوں والی گاڑیاں نکلتی تھیں تو شام اودھ کا سماں دیکھنے والا ہوتا تھا۔ پہلی موٹر
لکھنؤ میں لاٹ صاحب کے بعد بڑے کنور صاحب جنت مکانی کی آئی تھی۔ کلکتے
منگوائی گئی تھی اور اس پر بیٹھ کر وہ لاٹ صاحب سے ملنے گئے تھے۔ کبھی کبھی کلکتے

بمبئی کی تھیٹر کمپنیاں آکر تماشے دکھاتی تھیں اور سب لوگ کس شوق سے جاتے تھے۔ کلکتے والی گوہر ہائے کیا غضب کا گاتی تھی اور شکل تو خدا نے اس کی اپنے ہاتھ سے ایسی بنائی تھی کہ یہ تمہاری نگوڑی سینما والیاں جو پوڈر سرخی کے زور پر چمکتی ہیں۔ اس کے آگے پانی بھرتیں۔ بڑے کنور صاحب مرحوم نے اس کا مجرا کروایا تھا۔ سب بڑے بڑے صاحب لوگ تلک سننے کے لئے آئے تھے۔ بڑے کمرے کی شہ نشینوں میں چلمنوں کے پیچھے بیگمات بیٹھی تھیں۔ چھوٹے کنور صاحب کی اس وقت شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ ولایت میں تھے۔ ہائے لکھنو۔ ہائے لکھنؤ کی باتیں۔ شاہ میناؒ صاحب کے ہاں کی قوالی عیش باغ کے میلے۔ درگاہ حضرت عباسؓ کی مجلسیں۔ بیلی گارد۔ دلکشا محل۔ مارٹین کوٹھی۔ خورشید منزل کی ولائتی قلعہ جیسی عمارت جس میں اب انگریز لڑکیوں کے لئے لا مارٹینز اسکول ہے۔ چپے چپے سے پرانی یادیں وابستہ ہیں۔ یہاں یہ تھا۔ وہاں وہ تھا۔ شاہی کے زمانے ہی میں بہت سے جدت پسند امراء و نوابین نے جن میں سے چند ایک ولایت اور بہت سے کلکتے ہو آئے تھے۔ شہر کے باہر بندریا باغ اور دلکشا میں یہ کوٹھیاں بنوالی تھیں۔ شاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ جو بے حد انگریزیت پسند تھے۔ انہوں نے مارٹن صاحب فرانسیسی سے مارٹین کوٹھی خرید لی تھی۔ انہیں مارٹن صاحب کا قائم کیا ہوا لا مارٹینز اسکول اور لڑکوں کا لا مارٹینز کالج ہے جس کے انگریز لڑکوں نے غدر کے زمانے میں لکھنؤ کے محاصرے کے وقت اپنی قوم کے لئے کس بہادری سے اپنی جانیں دی تھیں۔ ہائے اگلے وقتوں کی ہمتیں۔ وفاداریاں۔ آن پر جان دیتے تھے جب گومتی میں بڑی بھیا آئی ہے۔ اس وقت تمہارے موتی محل کے پل پر کشتیاں چلتی تھیں اور یہ کیننگ کالج جو اب انورسٹی کہلاتا ہے جس میں روز ایک نہ ایک دنگا

فساد ہوتا رہتا ہے۔ اس کے لڑکے جانے کون کون ماؤں کے لال اپنی جان جوکھوں
میں ڈال کر ان کشتیوں میں ڈوبتوں کو بچاتے پھرتے تھے۔ آج کل کے چھوکرے ایسا
کر سکتے ہیں؟ مصیبت پڑے گی تو خود ہی چلائیں گے کہ لوگو دوڑنا ہمیں بچانا۔ جب
بڑے کنور صاحب نے شہر سے باہر کمپو میں غفران منزل بنانے کا ارادہ کیا تو ان کی
بڑی بہو صاحب نے انکار کر دیا تھا کہ میاں صاحبزادے میں تو آغا میر کی ڈیوڑھی
باہر تو ہرگز نہ جاؤں گی۔ مرنے سے پہلے تو نکلنے کی نہیں۔ ہاں جب مجھے عیش باغ یا
ملکہ جہاں کے قبرستان میں ڈال آئیو۔ اس کے بعد جہاں چاہنا رہنا۔ چاہے سکندر باغ
میں رہنا چاہے ولایت میں۔ لو غضب خدا کا لڑکا باؤلا ہوا ہے۔ کہتا ہے شہر کے باہر
چل کر کوٹھی میں رہو۔ کل کہے گا سایہ پہن کر میز کرسی پر بیٹھو۔ شہر کا باہر موا اجاڑ رمنا جنگل
بیابان۔ اور پھر وہاں ہر جمعرات کو میری مجلسیں کون کروائے گا۔ کیا تمہاری نگوڑی فرنگن
میری مجلسیں پڑھنے آویں گی۔ غفران منزل بن گئی۔ لیکن بڑی بہو صاحب نے اپنے جیتے جی
آغا میر کی ڈیوڑھی سے قدم باہر نہ نکالا۔ صرف کبھی کبھی مانا کھیر ہو آتی تھیں اور دینص آباد
تک جانے کے لئے مہینوں پہلے سے کیا کیا انتظام ہوتے تھے۔ ایسی چہل پہل ہوتی
تھی جیسے ماشاء اللہ سے گھر میں شادی ہے۔ اب کیا ہوتا ہے کہ روشی بٹیا ولایت جا رہی
ہیں اور ایک چھوٹا سا بیگ کندھے سے لٹکا کر جیپ پر ممی کہتی ہوئی کھٹ سے ہوائی جہاز
میں جا بیٹھیں۔ عباسی خانم یہ بھی بتایا کرتی تھیں کہ فونوگراف باجا سب سے پہلے غفران منزل
میں آیا تھا۔ کیا کیا ریکارڈ تھے۔ چھپن چھری اور کلکتے والی گوہر کے۔ کہ ایک ایک شعر پر
دل لوٹ جاتا تھا اور اب کیا دیوانے گانے نکلے ہیں کہ چڑیوں کوؤں سے سوال کئے
جا رہے ہیں۔ کوئی پنچھی اڑا رہا ہے۔ کہیں چھک چھک ریل گاڑی چلی جاتی ہے۔ تو

ہے ۔۔!! عباسی خانم بھی کیا بلبل ہزار داستان تھیں۔ اپنی جوانی کے دنوں میں کیا ممولے کی طرح ادھر سے اُدھر چہکتی پھرتی ہوں گی۔ اب بھی جاڑوں کی راتوں میں گاؤ تکئے سے لگ کر ڈلی کاٹتے ہوئے جب وہ پُرانے وقتوں کے قصے سنانے پر آتی تھیں تو سب انتہائی اشتیاق سے بیٹھے ان کی شیریں آواز سنتے رہتے تھے۔

زندگی اسیطرح گذرتی جارہی تھی۔

رات کو گومتی کے کنارے سے واپس گھر پہنچ کر سید افتخار علی سوچ رہے تھے کہ یہاں کا بھی عجیب ہی حساب نظر آتا ہے۔ انہوں نے اندازہ لگانا چاہا تھا کہ اس شہر کے تعلیم یافتہ ترقی پسند نوجوان حلقے کی اکثریت کس طرف جارہی ہے اور انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہورہا تھا کہ ان راجاؤں اور تعلقداروں کے لڑکوں اور لڑکیوں سے لے کر متوسط طبقے اور پڑھے لکھے نچلے متوسط طبقے تک سبھی اپنے آئیڈیلز کے لئے متحد ہیں - ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ فرقہ دارانہ پارٹیوں اور گروہوں کی وہاں پر بھی کمی نہ تھی اور وہ خوب زور پکڑ چکے تھے۔ لیکن یہ حلقہ ان سب سے الگ تھلگ دوسروں کو گالیاں دینے اور اپنا پروپگنڈہ کرنے کے بجائے خاموشی اور خلوص سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ ملک کی ایک بڑی قومی جماعت کے ترقی پسند عناصر سے ہمدردی رکھنے والے اس گروہ میں سرمایہ دار بھی تھے، بورژوا بھی اور پرولتاری بھی۔ لیکن کوئی پوزیئر نہ تھا۔ فریب دینے والا نہ تھا۔ یہ لوگ 'برلاز' اور 'ڈالمیاز' کو گالیاں دینے کے بعد صوفوں پر نیم دراز ہوکر سگریٹ سلگانے کے بجائے اپنی موٹروں میں بیٹھ کر کسانوں کے لئے کام کرنے کے واسطے دور دراز کے علاقوں تک جاتے تھے اور کلب کی لاؤنج میں بیٹھ کر سیاسیات

پر بحث کر لینا ہی کافی نہ سمجھتے تھے۔ بڑے عجیب لوگ تھے۔ سید افتخار نے نیوایرا کے فائل اٹھا کر دیکھے۔ یہ بھی بے حد انوکھا رسالہ تھا جسے "راجکماریاں" اور دھوپ میں پیدل گھومنے والے "فن کار" اکٹھے مل جل کر شائع کرتے تھے۔ لیکن اس میں بھی ان کا ذاتی پروپگنڈہ کہیں نہ تھا۔ بہرحال ایک رات ان کی مجلس میں شامل ہو کر اور اپنے ساتھی رحمت اللہ خاں سے ایک تقریر کروا لینے کے بعد اب سید افتخار نے اندازہ لگایا کہ ان نوجوان دیوانوں سے الجھنا اور ٹکر لینا زیادہ آسان کام نہ تھا لیکن رحمت اللہ خاں اب ملت بیضا شائع کر رہا تھا اور یہ یقین تھا کہ یہ اخبار نیوایرا کے مقابلے میں موجودہ حالات اور ذہنیت کو دیکھتے ہوئے کہیں زیادہ کامیاب رہے گا۔ اگلے ہفتے وہ اضلاع کے دورے پر جانے والے تھے۔ ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے انہیں دیہاتوں اور قصبوں اور ضلعوں کے چھوٹے چھوٹے دور افتادہ شہروں میں جہاں اب تک قومی اور سیاسی شعور کی لہر بدقسمتی سے نہ پہنچی تھی اسٹڈی سرکل قائم کرنے اور پروپگنڈے کی رفتار دوگنی کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ان کی جماعت کی تحریک اپنی زبردست جذباتی اپیل کی وجہ سے ملک کے گوشے گوشے میں بے حد کامیابی اور تیز رفتاری کے ساتھ پھیل چکی تھی۔ یہ صوبہ اس تحریک میں سب سے پیش پیش تھا۔ کروا ہا راج اودھ کے ترقی پذیر مسلمان تعلقوں میں سے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے کنور صاحب کی اولاد میر جعفروں میں شامل ہو گئی تھی۔ راجکماری تو اکثر پیشانی پر سُرخ بندی تک لگائے دیکھی گئی تھی۔ نہرو خاندان کے افراد سے کروا ہا راج والوں کی بہت گہری دوستی تھی۔ "ایسے ہی لوگ تو قوم کو فروخت کر رہے ہیں" — سید افتخار نے قلم اٹھا کر ملت بیضا کے لئے ایڈیٹوریل لکھنا شروع کیا۔

"کیوں بھئی — کیا رخشندہ بیگم کو خط لکھا جا رہا ہے؟" رحمت اللہ خان نے کمرے

میں داخل ہوتے ہوئے ان سے پوچھا۔
"اماں ہٹاؤ بھی۔ ان سب کے دماغوں میں تو فناس بھرا ہے۔" سید افتخار نے قلم ایک طرف رکھتے ہوئے جواب دیا۔
"لیکن اب کے الیکشن پر مزا دیکھ لینا رجاویں گے کہاں۔ ان کے حلقے کے سارے ووٹرز تو ہمارے ہاتھ میں ہیں"۔ رحمت اللہ خاں نے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ کرواہار لج کے سارے علاقوں میں جو فیض آباد سے لے کر ترائی کے جنگلوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا پروپیگنڈہ کامیاب ہوتا جا رہا تھا۔
سید افتخار نے اپنی ڈائری اٹھائی اور دیکھنے لگے کہ آئندہ ہفتہ ان کا کس حد تک مصروف ہے۔ قومی راہنماؤں کی ساری ٹی پارٹیوں میں ان کی شرکت بیحد ضروری تھی۔ ایک رہنما خاتون کے ایٹ ہوم کا دعوت نامہ ان کے سامنے پڑا تھا جو رحمت اللہ خاں کے ذریعے انہیں بھیجا گیا تھا۔ دلچسپ ایٹ ہوم ہوگا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے انہوں نے سوچا۔ ان ٹی پارٹیوں میں قوم کی رہنما خواتین کی شرکت جو قوم کے پلیٹ فارم پر لاکھوں، کروڑوں، غریب، ان پڑھ پردہ دار عورتوں کے گلوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ پیرس کی تازہ ترین فیشن پریڈ سے کم اہمیت نہ رکھتی تھی ان کے جگمگاتے ہوئے غرارے اور ساریاں، ڈرائینگ روم پولیٹکس کے مکالمے چمکیلی موٹریں، یہ سب بہت شاندار، بہت نظر فریب معلوم ہوتے تھے۔ یہ قوم کی لیڈر شپ تھی۔ ان کے وہاں روز ایٹ ہوم ہوتے تھے۔ ان کی تصویریں اخباروں میں چھپتی تھیں۔ جب تک قوم کے رہنما اور ان کی خواتین شاندار نہ ہوں۔ قوم کیا خاک ترقی کر سکتی ہے اور اس میں قومی جوش اور سیاسی شعور کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے۔

اور ان کے مقابلے میں وہ پوزئیرز کہاں ٹھہر سکتے تھے۔ جن کی خواتین اور لڑکیاں سفید یا
اور سیدھے سادے غرارے پہن کر باہر نکلتی تھیں اور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف
رہتی تھیں" — ہونہہ — " سید افتخار نے اڈیٹوریل میں آگے لکھنا شروع کیا۔ "کھدر یا
مرشد آبادی ریشم کی ساریاں پہن لینے سے ملک کیا آزاد ہو جائے گا۔ اندر چاہے جو
کچھ بھی کرتی ہوں۔ باہر سفید ساریاں پہن کر نکلتی ہیں۔ سینکڑوں لونڈوں سے تو عشق
ہی کر کے چھوڑ دیا ہوگا۔ جیل جا کر بھی ان لوگوں نے کیا تیر مار لئے ہیں۔ اے
کلاس میں ٹھاٹھ سے بجلی کے پنکھوں کے نیچے بیٹھے ہیں۔ پبلسٹی ہو رہی ہے وہ الگ اور
ساتھ ساتھ عشق لڑائے جا رہے ہیں وہ الگ۔ کبھی کبھار انگریز پولس افسروں سے
پٹ لئے اور لہو لگا شہیدوں میں داخل۔ اور ایک عالم ان کے نام پر مرا جاتا ہے۔
یہ سب پروپیگنڈہ ہے، بھائی پروپیگنڈے میں بڑی طاقت ہے۔ مجھے تم آج نیو یارک
بھیج دو۔ دیکھو کیا کر سکتا ہوں محض روپیہ چاہئے میاں روپیہ۔" انہوں نے رحمت اللہ
خاں سے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو بھائی"۔ رحمت اللہ خاں نے جواب دیا۔ اخبار کے نئے مضمون
کے لئے ان کے دماغ میں بھی کافی مسالہ جمع ہو گیا تھا۔

وقت اپنی روانی سے گذرتا گیا۔ گرمیاں گئیں۔ برسات نکلی۔ گلابی جاڑے آن پہنچے
جاڑے، جب مشاعروں اور کانفرنسوں اور نمائشوں کا زور ہوتا ہے۔ شکار پارٹیاں
گھنے جنگلوں کا رخ کرتی ہیں۔ کرسمس کی چھٹیوں کے پروگرام بنائے جاتے ہیں۔ آتشدان
کے گرد بیٹھ کر گپیں اڑتی ہیں اور دور دور کی کھینچی جاتی ہے۔

نومبر کا مہینہ آیا اور دیوے کی سالانہ نمائش کے لئے سارے لکھنؤ نے نکل گھر سے راہ جنگل کی لی۔ نمائش کے میدان سے ذرا ہٹ کے، اس سمے امرودوں کے جھرمٹ میں وقت گذاری کے خیال سے انور اعظم اور جمیل بہت دیر سے ایک منڈیر پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب انہوں نے لڑکیوں کے ایک غول بیابانی کو اس طرف آتا دیکھا۔ تو سگریٹ پھینک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلو یار واپس چلیں"۔ انور اعظم نے کہا

وہ سب ٹہلتی ہوئی امرودوں کے جھنڈ سے آگے نکل آئیں۔

"بجیا کا تم ان کا چینہت ہو"؟ قمر آرا نے منڈیر پر سے کودتے ہوئے انور اعظم کو دیکھ کر چپکے سے رخشندہ سے پوچھا

"چینہت کاہے ناہیں"۔ رخشندہ نے کہا۔ وہ ڈون انور دی گریٹ کو کئی بار لکھنو میں اپنی نیلی ٹوسیٹر پر گھومتا دیکھ چکی تھی۔

جنگل کی ہوا میں خنکی آچلی تھی۔ ارہر کے کھیتوں کے اس پار ندی کا پانی ستاروں کی روشنی میں جھلملا رہا تھا۔ وہ سب شالیں اور اوورکوٹ اپنے شانوں پر لپیٹ کر اسی منڈیر پر جا بیٹھیں جس پر سے وہ دونوں بھاگے تھے۔ وہاں پر نسبتاً سکون تھا۔ دور دور تک چھپروں اور سائبانوں کے نیچے لالٹینوں کی روشنی میں بیٹھے ہوئے کسان ناریل پی رہے تھے اور بہت خوش تھے۔ بیل گاڑیاں درختوں کے نیچے کھڑی کر دی گئی تھیں اور جگالی کرتے ہوئے بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ آم کے باغ کے بیچ حکام ضلع کے خیمے تھے جن کے چاروں طرف سرخ بجری والی سڑکیں بنی تھیں، اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پام کے گملے رکھے تھے۔ نمائش کے میدان کے وسط میں میوزک

کانفرنس کے پنڈال پر رنگ برنگی کاغذی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ نمائش کے میدان اور صاحب لوگوں کے کیمپ سے کوئی ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر مٹی کے کھلونوں اور رنگ برنگی چُنریوں اور گوٹے لچکوں کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں تھیں۔ جن پر لالٹینیں ٹمٹما رہی تھیں اور ہنڈولے چرخ چوں کر رہے تھے اور آدھی عورت اور آدھی لومڑی کا تماشہ تھا۔ جگمگاتی ہوئی فیشن ایبل نمائش گاہ سے بہت پرے ہٹ کر یہ غریب مسلمان کسانوں کی اپنی نمائش تھی۔ امرودوں کے باغ کے دوسری طرف مویشیوں کا میلہ لگا تھا۔ اَن گنت گھوڑے، بکریاں اور گائے بیل درختوں کے نیچے کھڑے جگالی کر رہے تھے۔ نیواڑیوں کی دوکانوں پر پر پھریرہ نسیم اور گھوڑے پر سوار ہاتھ میں تلوار لئے غازی انور پاشا اور گاما پہلوان کی رنگین تصویریں جگمگا رہی تھیں۔

انور اعظم اور جمیل ٹہلتے ہوئے ادھر آنکلے۔ ان کے سامنے ایک بالکل نئی دنیا بکھری ہوئی تھی۔

ایک بہت بڑے ہجوم کے سامنے چبوترے پر چڑھے ہوئے ایک صاحب دریافت فرما رہے تھے: "رس گلا کھائیے گا؟"

"یار مجھ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وارث علی شاہ کے عرس میں رس گلّوں کا لنگر بھی ہوتا ہے" جمیل نے کہا۔ وہ دونوں چبوترے کے قریب سے گذرے۔ انہیں دیکھ کر کسانوں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ پتہ چلا وہ صاحب فرماتے ہیں۔ "رسول اللہ کا ہے گا"۔ یعنی وہ بھورا سا پرانا کمبل جس کی زیارت کروا کے دو دو آنے پیسے وصول کئے جا رہے تھے۔

"وجو بناؤ بھئی وجو" — دوسری طرف سے آواز آئی۔ ایک بزرگوار مٹی کے لوٹے لئے سب مومنین کا وضو بنانے کو مستعد بیٹھے تھے۔ ایک درخت کے نیچے چراغوں

کی روشنی میں قوّالوں کی چوکیاں ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ کسانوں کا میلہ تو یہی تھا۔ وہ کسان جو کوسوں دور سے پیدل یا بیل گاڑیوں پر ہر سال حضرت وارث علی شاہؒ کے عرس کے لئے کس ذوق و شوق سے وہاں آتے تھے۔ ان کے بچے ہنڈولوں پر بیٹھتے تھے۔ ان کی بیویاں اور لڑکیاں چنریوں اور فیروز آباد کی رنگین چوڑیوں کی خریداری کرتی تھیں اور وہ خود سال بھر کی محنت سے بچائے ہوئے کچھ روپوں سے ایک دو بیل یا گائیں خرید کر خوش خوش اپنے گاؤں کو واپس چلے جاتے تھے۔ باغ کے اس پار دیوے کی جو مشہور سالانہ نمائش برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ وہ ان کے لئے نہیں تھی۔

بارہ بنکی سے دیوے شریف آنے والی سڑک پر موٹروں، لاریوں، تانگوں، یکّوں اور سائیکلوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ امرودوں کے جھنڈ کے پرے اس میدان میں کتنی رونق، کتنی چہل پہل تھی۔ ایک عالم وہاں سمٹ آیا تھا۔

رخشندہ امرود کے سہارے کھڑی ہو گئی۔ "رات کا وقت ہے۔ ورنہ امرود چراتے" اُس نے ایک ٹہنی جھکا کر کہا۔

قمر آرا خاموش تھی۔ وہ اپنی اس چچا زاد بہن اور اس کی الٹرا فیشن ایبل سہیلیوں کے درمیان کچھ عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ ندی کے پرے چھوٹی لائن کی کھلونا ایسی ٹرین گڑگڑاتی شور مچاتی سیتاپور کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ فضا بھیگی بھیگی تھی اور لگتا تھا جیسے بہت دور اندھیرے میں گنار کی ڈوبتی ہوئی گونج کے ساتھ ساتھ کوئی اختر پیا کا گیت الاپتا ہو۔ — کبھی بولے چھن کبھی بولے چھن کبھی بولے چھن تیرے گھنگھرو"

"روشی اب واپس چلو۔ بہت دور نکل آئے ہم لوگ۔" ڈائمنڈ نے کہا۔

"چلو ریل کی پٹری اور ندی کے کنارے تک ہی ہو آئیں کم از کم۔ راستے میں جو جناتو
کی حویلی ہے اسے دیکھتے چلیں گے۔"

"خاکسار تو جائے گی نہیں۔" ڈائمنڈ نے فیصلہ کیا۔

"ارے کتنا ڈرتی ہو تم۔ چپراسی تو ہمارے ساتھ ہے۔"

"بھئی بندے خاں تو واپس جاتے ہیں اور اب میوزک کانفرنس شروع ہی ہونے والی ہے۔" ڈائمنڈ نے منڈیر پر سے کودتے ہوئے کہا۔

"واللہ کیا بات دماغ میں آئی ہے۔ قسم خدا کی۔ پوچھو کیا؟" رخشندہ بولی

"فرماؤ۔" ڈائمنڈ نے اکتا کر کہا۔

"اب اتنی دور آ گئے ہیں تو چلو درگاہ شریف کی زیارت کرتے چلیں۔"

وہ پگڈنڈی پر آ گئیں۔ چپراسی جو اب تک ایک طرف کو کھڑا اپنی سُرخ مونچھوں کی نوک مروڑ رہا تھا۔ آگے آگے بھاگا گیا تاکہ درگاہ پر سے زائرین کا مجمع ہٹ جائے کیونکہ کلکٹر صاحب کے ہاں کی بابا لوگ زیارت کے لئے آتی ہیں۔

چپراسی آگے نکل گیا اور وہ اندھیرے میں راستہ بھول کر پگڈنڈی پر سے تتر بتر ہو گئیں۔

"جناتوں کی حویلی تو میں ضرور دیکھوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو۔" رخشندہ نے دل میں طے کیا

ڈائمنڈ، گنی، قمر آرا اور دوسری لڑکیاں کھیت میں سے گذر کر آم کے باغ تک پہنچ چکی تھیں۔ وہ ایک چھلانگ لگا کر منڈیر کی دوسری طرف اتر گئی۔ ایک بہت بڑے برگد کے درخت کے پیچھے غازی الدین حیدر کے وقتوں کے ایک کھنڈر کی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ کھنڈر کی محرابوں میں سے ندی کا ٹھنڈا پانی جھلک رہا تھا

ہمت کر کے وہ آگے بڑھی۔ کیونکہ اب واپس جانا بزدلی تھی۔ اسے یقین تھا کہ کسی کونے کھدرے میں بیٹھا ہوا کوئی دیہاتی چلم پیتا ضرور مل جائے گا اور اسے ساتھ لے کر وہ واپس چلی جائے گی۔

"ارے ہائے جنّات" — بے اختیار اس کے منہ سے نکلا لیکن دوسرے لمحے اسے ہنسی آگئی۔ کیونکہ اس کے سامنے سیڑھیوں پر حویلی والے جنّاتوں کے بجائے سیاہ شبروانیوں میں وہی دونوں کھڑے تھے جو کچھ دیر پہلے منڈیر پر سے بھاگ گئے تھے۔

امبرپور راج کے انور اعظم نے ایک لحظے کے لئے اسے بالکل اپنے سامنے کھڑا دیکھا جو اندھیرے جنگلوں میں ڈولنے والے پراسرار سایوں کی طرح درختوں کی تاریکی میں سے نکل کر اکیلی جانے کس طرح وہاں پہنچ گئی تھی۔

"ارے پارٹنر غول بیابانی تو یہاں بھی پہنچ گیا" جمیل کہہ رہا تھا جمیل اس کے بالکل قریب کھڑا تھا لیکن اس کی آواز لگ رہا تھا جیسے کہیں بہت دور سے آرہی تھی۔ لیکن وہ حماقت انگیز طلسم بہت جلد ٹوٹ گیا۔

"ارے بھئی واہ" اس نے چپکے سے اپنے آپ سے کہا اور زنبرکی سی تیزی سے مڑکر پگڈنڈی پر جھکے ہوئے ارہر کے لمبے زرد ڈنٹھلوں کو ہٹاتی پھر منڈیر پر پہنچ گئی۔

"روشی"۔ دور سے گنّی کی آواز آئی۔

"روشی"۔ ڈائمنڈ نے پکارا

"ارے ہم جناتوں سے ملاقات کر بھی آئے" بھاگنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی

"واللہ — کون؟"

"ڈوَن الونڈی گریٹ"۔

"ارے وہ گلیمر بوائے"؟

"وہی جو پچھلے سال ریڈیو اسٹیشن پرومل کے پروگراموں میں حصہ لینے کے لئے آتا تھا"؟

"فرائیڈے ایوننگ؟ وہی جو ہر ہفتے نئی پکچر شروع ہونے پر پہلی شام کو نظر آتا ہے"۔

"ہُو از ہُو" کے باب کھل گئے۔

درگاہ میں خوب تیز روشنی پھیل رہی تھی۔ پھولوں کی چادروں کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ انہوں نے غیر ارادی طور پر آنچلوں سے سر ڈھک لئے اور فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھالئے۔ رگنی اور راوما ایک طرف کو کھڑی رہیں۔

"بھئی اب دعائیں مانگی جائیں۔ قبولیت کا وقت معلوم ہوتا ہے"۔ ڈائمنڈ نے کہا۔

"کیا دُعا مانگی جائے"۔ رخشندہ سوچنے لگی۔ اسے کسی چیز کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ آخر کاہے کے لئے اللہ میاں سے دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

مانا ٹھیر کی قمر آرا مزار کے ایک طرف ہاتھوں میں مُنہ چھپائے کھڑی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "اللہ بھائی میاں واپس آجائیں"۔ وہ روز عشا کی نماز کے بعد یہی دعا مانگتی تھی۔ اس وقت اس جگمگاتے مجمع میں بھی اسے یہی دُعا یاد آئی۔

"چلو بھئی"۔ رخشندہ نے کہا۔ وہ سب نمائش کا میدان پار کر کے اپنے کیمپ کی طرف آگئیں۔

میوزک کانفرنس کا پہلا سشن شروع ہونے میں ابھی بہت دیر تھی۔

"کس احمق نے اس سال نمائش کا انتظام کروایا ہے جو کہیں بھی ڈھنگ کی چائے نہیں ملتی۔ سارے ریسٹوران ایک سے ایک پھٹیچر۔" انور اعظم اور اس کا دوست جمیل کچھ دیر سے ایک ریسٹوران کے خیمے میں آئے بیٹھے تھے اور پیالیوں میں چمچے بجا رہے تھے۔

"کہیں زور سے کہہ بھی نہ دینا۔ یہ جو ابھی ایک غول بیابانی دوسری طرف سے ریسٹوران میں داخل ہوا ہے۔ اس میں حاکم ضلع کی بھانجی صاحبہ تشریف رکھتی ہیں" دوسرے دوست نے کہا۔

"اچھا یہی وہ کلکٹر صاحب کی شہرہ آفاق بھانجی کہ مہاراج کی رخشندہ بیگم ہیں جو دوسری بابا لوگ کے ساتھ لکھنؤ سے نمائش دیکھنے تشریف لائی ہیں"؟ تیسرے نے ناک سکیڑ کر دریافت کیا۔

"یار تمہیں تازہ ترین اطلاعات پہنچتی رہتی ہیں۔ یہ سب تفصیلات کیسے معلوم ہوئیں" جمیل نے پوچھا

"بھئی ایک تو کلکٹر صاحب کے کیمپ میں غفران منزل کی اسٹوڈی بیکر کھڑی ہے اور یہ اسٹوڈی بیکر جانتے ہو کب کی ہے؟ اسی پر سوار ہو کر بابا آدم جنت سے تشریف لائے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابھی یہ سرخ وردی والا طرہ باز خاں چپراسی کر سیاں لگاتا ریسٹوران میں گھسا تھا اور منیجر سے کہہ رہا تھا کہ کلکٹر صاحب کے ہاں کی بابا لوگ چائے پینے آتی ہیں۔ ادھر کسی کو نہ آنے دینا" اسی دوست نے بتایا۔

"بھئی جانے یہ کونسی ادا ہے کہ ابھی ساری نمائش کا چکر لگا کر آ رہی ہیں اور یہاں پردہ کیا جا رہا ہے" چوتھے دوست نے کہا۔

"ہئی ہئی — ہائے علیگڑھ کی نمائش کے کباب پراٹھے" — جمیل نے ایک

سرد آہ بھری۔

"ان کا یہاں کیا تذکرہ؟" انور اعظم نے پہلی مرتبہ اس مکالمے میں حصہ لیا۔ وہ ا
چپ چاپ بیٹھا سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے بنا رہا تھا۔

پارٹنر ابھی سامنے سے ایک سیاہ برقعہ گذرا تھا۔ اسے دیکھ کر اپنے علی گڈھ کی
یاد آگئی۔ واللہ کیا خیال ہے اب کی فروری میں آؤ علی گڈھ۔"

"کوئی نیا رومان چل رہا ہے؟" ایک دوست نے پوچھا

"پارٹنر ان دنوں بی ایس سی کی ایک لونڈیا کو فزکس پڑھا رہا ہوں۔ و
کیا چین کی گذرتی ہے۔" جمیل نے جواب دیا۔

"لاحول ولا۔" انور اعظم کو ہنسی آگئی۔

پام کے گملوں کے پرے قناتوں کی دوسری طرف لڑکیاں اپنی باتوں میں مص
تھیں۔ ریسٹوران میں خوب گھما گھمی تھی۔ لکھنؤ سے آئی ہوئی خواتین خریداری کے
سے لدی پھندی آکر بیٹھتیں اور چاء سے تازہ دم ہو کر پھر نمائش گاہ کی طرف چ
جاتیں۔ باہر لاوڈ اسپیکر پر فلمی گانوں کے ریکارڈ چیخ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد پی چو بھی وہاں آگیا۔ "ارے بھئی تو تم کیا کر رہی ہے؟" اس
اپنی بہنوں کی میز کی سمت آتے ہوئے کہا۔

"پی چو تم بھی کمال کرتے ہو۔ تم نے ہم سب کو مدعو کیا تھا کہ چاء پلاؤ گے۔
سب بھاگے بھاگے آئے کہ پی چو خاں سے اپوائنٹمنٹ ہے اور آپ غائب
رخشندہ نے بگڑ کر کہا۔

"بھئی روشنی ماموں میاں نے پکڑ لیا تھا۔ ان کے خیمے میں جانے کون کون جمع

سب کی میزبانی کرنی پڑ رہی تھی۔ اچھا بتاؤ کیا نوش فرماؤ گی تم لوگ"۔ اس نے پوچھا
"چاٹ"۔ سب نے یکزبان ہو کر کہا
"ارے بس لڑکیوں کی اوقات! چاٹ پر جان نکلتی ہے!!" پی چو بولا۔
"اور پی چو ٹنڈے کے کباب"۔ رخشندہ نے لالچی بلی کی طرح فرمائش کی۔ ٹنڈا اپنی دوکان لے کر ہر سال لکھنؤ سے دیوے شریف آتا تھا۔
اسی وقت ادھر سے نواب چھتاری اسٹائل کی مونچھوں والے حاکم ضلع گذرے "روشی بٹیا یہاں پر ہیں"۔ ان کی گرجدار آواز آئی۔
"جی ماموں میاں ہم ابھی آتے ہیں"۔ رخشندہ نے کہا اور وہ سب جلدی جلدی چاٹ اور کباب صاف کر کے پی چو کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ کیمپ میں شاید رات کے کھانے پر ان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔
انور اور اس کے ساتھی پام کے گملوں کے ادھر اسی طرح کانفرنس شروع کرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سرخ اور سنہری وردی اور سرخ مونچھوں والا طرہ باز خاں چپراسی ان کی طرف آیا۔
"امبر پور راج کے صاحبزادے یہاں تشریف رکھتے ہیں"۔ اس نے بے حد مؤدبانہ لہجے میں دریافت کیا۔
"ارشاد؟" انور نے لاپروائی سے پوچھا
"حضور کو کلکٹر صاحب یاد فرماتے ہیں"۔
"اچھا جاؤ۔ کہدو ہم ابھی آتے ہیں"۔
کلکٹر صاحب کے ڈرائینگ روم والے خیمے میں اچھا خاصا دربار لگا تھا۔

ایک صوفے پر مہاراجہ صاحب عالمگیر آباد اور ایڈمنڈ واٹیلے ایس پی کے سا
کلکٹر صاحب بیٹھے مونچھیں ہلا ہلا کر باتیں کر رہے تھے اور یہ موٹا سگار پیتے جاتے
تھے اور بہت سے مقامی حکام اور رؤساء اور حوالی موالی چاروں طرف بیٹھے تھے
طرّہ باز خاں نے خیمے کا پردہ اٹھایا اور انور داخل ہوا۔ انور کو انہوں نے اوپر
سے نیچے تک اس طرح دیکھا جیسے وہ بھی میلے میں آئے ہوئے انعام کے مستحق مویشیوں
میں سے تھا۔ "جیتے رہو میاں۔ بیٹھو۔ کہو اب تمہارے چچا کی طبیعت کیسی ہے"۔ انہوں
نے فرمایا۔
انور ایڈمنڈ وائلے سے اودھ جم خانہ کے اگلے ٹینس ٹورنامنٹ کے متعلق
باتوں میں مصروف ہوگیا۔
سگار پیتے پیتے کلکٹر صاحب نے یکلخت بے حد سنجیدگی سے فرمایا "میاں
سُنا ہے تم کو نمائش کے انتظام سے کچھ شکایت ہے کہ کسی ریسٹوران میں
چاء اچھی نہیں"۔
انور کو ہنسی آگئی۔ "چچا میاں آپ کو کیسے پتہ چلا۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ
نے بہت مستعد جاسوسوں کو بھی مقرر کر رکھا ہے"۔ اس نے کہا۔
اس دروازے کے پردے کو جنبش ہوئی جو خیمے کے دوسرے حصے میں
کھلتا تھا اور چوڑیوں کی مدھم سی جھنکار گونج اُٹھی۔ پھر بہت سی لڑکیوں کی دھیمی
دھیمی ہنسی کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ کلکٹر صاحب کے ڈرائینگ روم میں باتیں
بڑی شدت کی تندہی سے کی جا رہی تھیں۔ اس لئے اس طرف کسی کا دھیان
نہیں گیا۔

کچھ دیر بعد کلکٹر صاحب کو یاد آیا کہ ٹھیک آٹھ بجے سے میوزک کانفرنس کا پہلا سشن شروع کر دیا جائے گا۔ اس لئے اب کھانے کے لئے چلنا چاہئے سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ برابر کے خیمے میں اس نے کھسر پھسر سُنی "چپراسی صاحب کو کھانا دکھاؤ، نہیں پہلے لے جا کر ٹہلاؤ۔ ویسے آپ عموماً کہاں بندھتے ہیں؟ — اچھا آپ کو پانی دکھاؤ۔ جناتوں کو کھانا کھانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی صرف پھیچڑ ریسٹورانوں کی چاء سونگھ کر زندہ رہتے ہیں۔ ارے مگر یہ گلیمر بوائے کتنا ہینڈسم لگ رہا ہے اس وقت — ذرا بھی نہیں۔ رسی ہے بالکل —"

کلکٹر صاحب کے ڈرائنگ روم والے خیمے سے واپس آنے کے بعد فوراً رے کے قریب الوز کو اپنے ساتھی مل گئے اور وہ سب کانفرنس کے پنڈال کی طرف چلے گئے۔ جدھر ساری دنیا امڈی جا رہی تھی۔

پنڈال میں اگلے صوفوں پر مہاراجہ صاحب عالمگیر آباد، ان کا اسٹاف، کلکٹر صاحب، ضلع کے دوسرے بڑے حکام اور لکھنؤ سے آئے ہوئے "بڑے آدمی" اور ان کی خواتین آ آ کر بیٹھ رہی تھیں۔ اسٹیج کے دونوں طرف چلمنوں کے پیچھے پردہ نشین خواتین کے لئے نشستیں تھیں۔ باہر بے شمار موٹریں کھڑی تھیں۔ ایک خیمہ گرین روم کا کام دے رہا تھا۔ اس کے قریب اختری فیض آبادی کی پیکارڈ کھڑی تھی۔ اسٹیج کے پیچھے کی قناتوں سے گھنگھروؤں کا مدھم شور اور طبلہ اور بایاں ٹھکنے اور سازوں کے سر ملائے جانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فٹ لائٹ کے لیمپ اور مائیکروفون کے تار ٹھیک کئے جا رہے تھے۔ ایک طرف کو آل انڈیا ریڈیو کا ایک یونٹ ریلے کے لئے اپنا ساز و سامان لئے بیٹھا تھا۔ ومل اور مسعود

ہیڈ فون لگائے تاروں سے اُلجھے جانے کس چکر میں لکھنؤ اسٹوڈیوز سے باتیں کر
کی کوشش میں مصروف تھے۔ پنڈال کے اندر زرد بیج لگائے آرٹ کے خد
ورضا کار ادھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے اور معزز خواتین کو لا لا کر اگلی کرسیوں پ
بٹھا رہے تھے۔

آل انڈیا میوزک کانفرنسوں میں عموماً یہی سب ہوتا ہے۔ جب سارا مجمع پ
اُٹھنے کا انتظار کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔ تب اگلی صفوں پر سے اٹھ کر ایک
آدھ خان بہادر صاحب یا مہارانی صاحبہ مائیک پر آ کے جو اکثر فیل ہو جاتا ہے
خطبہ صدارت عطا فرماتی ہیں جس میں ہندوستانی کلاسیکل موسیقی کی شاندار روایا
اور موجودہ زبوں حالی اور ہندوستانی سوسائٹی کی فنونِ لطیفہ کی طرف سے مجرما
غفلت پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور کانفرنس کے منتظمین کو جن کی اس عظیم ا
خدمت پر جس کی وجہ سے آرٹ اور کلچر کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے
مبارکباد دی جاتی ہے۔ مجمع اس خطبے سے اور بھی زیادہ اکتا جاتا ہے۔ تب اونکار
ٹھاکر یا نارائن راؤ ویاس الہیا بلاول کا خیال شروع کرتے ہیں ۔ "ناری دید
اپنے گھر کی ۔ پرم پریت اُپ جاؤں" ۔ سب سے پچھلی قطاروں میں اب تک ج
چھوٹے پیمانے پر ہڑبونگ مچی ہوتی ہے۔ اس میں زیادتی ہو جاتی ہے اور وہا
سے ارشاد ہوتا ہے۔ ارے یار نالی دیدے اپنے گھر کی۔ اماں یہ کیا گلا پھاڑ
ہے بڈھا۔ اماں کلکٹر صاحب اختری بائی کو بھیجو۔ یہ کسے بٹھا دیا۔ ہمارا روپیہ ہ
سوارت جاوے۔ اس کے بعد دو تین چھوٹی چھوٹی کا تستھ بچیوں کے کتھک ناچ
یا کاتستھ اور بنگالی لڑکیوں کا رادھا کرشنا یا شیو پاروتی ڈانس ہوتا ہے۔

کوئی صاحبزادی ہاتھ میں تھالی اور جلتے ہوئے دئے لے کر تشریف لاتی ہیں اور یہ پوجا ڈانس کہلاتا ہے یا عمر خیام کے ٹیبلو کی قسم کے لباس میں صراحی تھامے ایک خاتون اسٹیج پر آرکسٹرا کی فلمی دُھن کے ساتھ چہل قدمی فرمانے لگتی ہیں۔ یہ گویا "اورنٹیل ڈانس" ہوتا ہے اور اس طرح ہندوستانی رقص کی مٹی خراب کی جاتی ہے۔ یا پھر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ منتظم صاحب گھبرائے ہوئے مائیک پر آکر اناؤنس کرتے ہیں کہ الٰہ آباد سے کماری آشا اوجھا کسی وجہ سے تشریف نہیں لا سکیں۔ اس لئے افسوس کہ ان کا رقص نہیں ہو سکتا۔ اب آپ لاہور کی مشہور فلم اسٹار مس ریوا اور جان سے ایک نغمہ سنئے۔ کوٹھے اتے اِل ماہیا۔

(اہلِ پنجاب غالباً اپنے گیتوں کے ہرے کنجوں میں کوئلوں یا بلبلوں کا چہکنا بیکار کا تکلف اور خرافات اور شاید حقیقت پسندی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لہذا ان کے محبوب کے مکان کی منڈیر پر چیل جیسا شاعرانہ پرند آکر بیٹھتا ہے) اور مس ریوا اور جان اپنا نغمہ سناتی رہتی ہیں۔

اسی طرح جب اس روز دیوے شریف کی سالانہ آل انڈیا میوزک کانفرنس میں بمبئی کی روشن آرا بیگم اور آگرے کی زہرو اور خوبصورت انوربائی جو بچاری بعد میں مرگئی اور آفتاب موسیقی استاد فیاض خاں کو لاتے لاتے بہت دیر ہوگئی اور پچھلی قطاروں کے حاضرین جمائیاں لینے لگے۔ تب لاؤڈ اسپیکر میں سے یہ روح افزا اطلاع آئی۔ کہ اب آپ کو مِس زہرہ اور ان کے بھائی جم مک گریگر کا رقص ملاحظہ فرمائیے۔

سارے شامیانے میں ہلکی ہلکی پُر اشتیاق کھسر پھسر ہونے لگی۔ پردہ ایک طرف کو سمٹا اور سازوں کی دھمک کے ساتھ ایک بھورے بالوں والی اینگلو انڈین لڑکی ناچتی ہوئی

مجمع کے سامنے آگئی۔

"یار ہم تو گیتا مانھر کے ناچ کے انتظار میں تھے اور یہاں لے کے کسی اینگ
کو کھڑا کر دیا" پیچھے سے کسی نے آہستہ سے کہا۔ لیکن سبھی منہ کھولے ناچ دیکھنے
مصروف تھے۔

لال باغ کی اینگلو انڈین اور عیسائی بستی میں چند لڑکیاں ایسی بھی ہیں۔ جن
کے دروازوں پر ہندوستانی ناموں کے بورڈ لگے ہیں۔ پرمیلا رانی۔ ابینہ بیگم۔ اُو
بظاہر وہ محض ہندوستانی رقص کرتی ہیں۔ ایک آدھ نے تخیل کی بلند پروازی سے
لے کر "اکیڈمی آف اورنٹیل ڈانسنگ" بھی کھول رکھی ہے۔ جہاں آس پاس کی لڑ
جمع ہو کر گراموفون کے ریکارڈوں پر اچھل کود میں مصروف رہتی ہیں اور بالکنی میں
ہو کر چوئینگ گم کھاتی جاتی ہیں۔ یہ کوئین روز بھی قطعی وہیں سے آئی تھی۔

وہ ناچتی رہی۔ بے حد معمولی قسم کا ناچ۔ عام سی دھن۔ پھر اس کے بھائی ا
سولہ سترہ سالہ خوش شکل اینگلو انڈین لڑکے نے سیاہ شیروانی اور سفید چوڑی دار پاج
میں کتھک ناچ کیا۔ وہ کافی اچھا لگا۔

رات گہری ہوتی گئی۔ اگلے صوفے پر بیٹھے ہوئے مہاراجہ صاحب، عالمگیر آ
جمائیاں لینے لگے۔ دوسری صف میں کلکٹر صاحب، کے ہاں کی بابا لوگ کو نیند آنے
تیسری صف میں انور اعظم اور اُس کے ساتھی سونے کا ارادہ کر رہے تھے۔

اتنے میں اسٹیج پر اختری بائی فیض آبادی نے الاپنا شروع کیا ـــ اکیلی جن جیہ
رادھے جمنا کے تیر۔

لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنس پڑیں۔

جمیل نے انور کو دیکھا اور وہ بھی ہنس پڑا۔

"روشنی اب ایک بج رہا ہے"۔ ڈائمنڈ نے آہستہ سے کہا

"چلو اُٹھتے ہیں"۔ رخشندہ نے نیند سے جھپتی ہوئی آنکھیں بمشکل پوری طرح چیر کر کہا

چپراسیوں اور رضاکاروں نے فوراً ان کے لئے راستہ چھوڑ دیا اور وہ اپنے اوورکوٹ اور شالیں سنبھالتی اپنے خیموں کی طرف چلی گئیں۔

کانفرنس کے اختتام پر جب انور اعظم پنڈال سے باہر آ رہا تھا تو اُس نے کوئین روز کو شامیانے کے رسّوں کے سہارے جھولتے ہوئے اپنے باپ سے باتیں کرتے دیکھا۔ اس کی سفید انگلیوں میں سگریٹ جل رہا تھا اور اس کے بھورے بالوں میں مصنوعی ستارے جگمگا رہے تھے۔ کانفرنس کا سکرٹری ایک مقامی پی۔ سی ایس جگدیش چندر ان لوگوں کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"اجی میں نے کہا سرکار ذری ادھر تشریف لائیے گا"۔ جگدیش نے انور اعظم کو آواز دی۔

"ہلو جگدیش"۔ انور اعظم نے اس کے پاس جا کر کہا۔

"بھئی امبرپور راج کے کنور انور اعظم۔ مس کوئین روز۔ ان کے ڈیڈی مسٹر چارلس مک گریگر"۔ جگدیش نے ملوایا۔

"ہاؤ ڈو یو ڈو"۔

"ہاؤ ڈو یو ڈو"۔

انور اعظم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جگدیش کو اس قسم کے تعارف کرانے کا شوق کب سے ہو گیا ہے۔

"انور یار تم لکھنؤ کب جا رہے ہو واپس؟"

"بھائی اگر تمہاری اس زبردست میوزک کانفرنس کا یہی رنگ رہا تو خیال ہے کل صبح ہی کھسک لوں گا۔"

"بالکل ٹھیک۔ کام بن گیا۔ بھئی قصہ یہ ہے کہ مسٹر اور مس مک گریگر کو کل ہی واپس جانا ہے۔ انہیں پہنچانے کے لئے کوئی موٹر خالی نہیں ہے۔ اگر تم ہی یار میرے انہیں اپنی کار میں لیتے جاؤ تو کیا بات ہے۔ جُگ جُگ جیو۔"

انور اعظم ابھی کچھ کہہ نہ پایا تھا کہ جگدیش پھر بولا "تو بس طے ہے۔ ہاں تم ہم بھی مل لو۔ ماسٹر مک گریگر۔ کنور انور اعظم۔ اچھا بھئی شب بخیر۔" اور دوسرے لمحے وہ پنڈال سے نکلتے ہوئے مجمع میں کھو گیا۔

انور اعظم اپنے خیمے کی سمت جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یا اللہ یہ کیا مصیبت سر پڑ گئی۔ یہاں سے تو صبح صبح نکل جاؤں گا۔ لیکن لکھنؤ کی سڑکوں پر پہنچ کر لوگ کیا دیکھیں گے کہ انور اعظم صاحب ان لوگوں کو موٹر میں ساتھ لئے گھومتے ہیں۔ پھر جگدیش سے کہلوائے دیتا ہوں کہ بھائی تم کچھ اور انتظام کر لو۔ مجھے تو اس سعادت سے معاف ہی رکھیو۔

لیکن تھوڑی دیر بعد صبح ہو گئی اور وہ جگدیش سے کچھ نہ کہلوا پایا اور پھر اس کی کار دیوے شریف کی اس سوتی ہوئی دنیا کو پیچھے چھوڑتی لکھنؤ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ راستے بھر اس سے باتیں کرے گی۔ اس کا سگریٹ لائٹر استعمال کرے گی۔ بہت ممکن ہے۔ فرینڈ بھی ہو جائے۔ بہت ممکن ہے اپنے فلیٹ پر پہنچ کر صبح کی چائے میں اسے شرکت کے لئے مدعو بھی کر لے۔ لیکن وہ خاموش رہی

ہوا کی زد سے بچنے کے لئے اس نے اپنے بھورے بال جالی میں سمیٹ لئے اور پیروں پر کمبل ڈال کر تیزی سے گذر جانے والے درختوں اور کھیتوں کو دیکھتی رہی۔ جم راستے بھر چلتے چلتے انگریزی گانے گنگناتا اور سیٹیاں بجاتا رہا۔ بوڑھا مک گریگر اپنا چقندر ایسا منہ لئے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بے تحاشا موٹی مسز مک گریگر جسے فیل پا کی بیماری تھی۔ اپنی پتلی ٹانگ موٹی ٹانگ پر رکھے سگریٹ پر سگریٹ ختم کرتی رہی۔

"آپ کا گھر کس جگہ پر ہے؟" لکھنؤ میں داخل ہو کر مال پر پہنچنے کے بعد کار کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے پہلی بار انور نے بات کی۔ تب وہ خاندان اپنے اپنے خیالوں سے چونکا

"آیوری کورٹ۔ بیر ورڈ۔" جم نے جلدی سے بتایا۔

لال باغ میں پہنچ کر ایک نئی وضع کی دو منزلہ عمارت کے آگے اس نے کار روک لی۔

"تھینکس ایور سو مچ۔" اٹیچی کیس اور کمبل سنبھال کر باہر کودتے ہوئے بوڑھے نے کہا۔

"چیریو۔" جم ایک چھلانگ لگا کر برآمدے میں چڑھتے ہوئے چلایا۔

آخر میں وہ اتری۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کا ٹکڑا پھینکا اور بے پروائی سے پرس اٹھاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

آس پاس فلیٹوں کی بالکنیوں میں شوخ رنگوں کے جاپانی ڈریسنگ گون اور تولئے دھوپ میں پھیلائے جا رہے تھے اور ایک عمارت میں سے وائلن کی آواز بلند ہو رہی تھی

قمر آرا نے کہا۔ "بابا ہم ہو لکھنؤ جاتے کے پڑھبا۔"

چوہدری اصغر علی خاموش رہے قمر آرا کو لکھنؤ بھیجنے کے معنی تھے خرچ اور

زیادہ خرچ۔ ان کی ماہانہ آمدنی تین سو بھی نہیں پڑتی تھی اور اسکول کے بورڈنگ
کا خرچ اٹھانا بڑی ہمت کا کام تھا۔ لیکن قمر آرا اس وقت تخت کے کونے پر بیٹھی
چپ چاپ دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ پتہ نہیں بابا جانے دیں گے یا نہیں
آنکھیں بھی خورشید کی آنکھوں کی طرح بڑی بڑی تھیں۔ وُہ بھی جب ان سے کوئی
منوانا چاہتا تھا تو اسی طرح بھیگی بھیگی پلکیں جھپکاتا رہتا تھا۔ لیکن خورشید کو ان کی
سے اوجھل ہوئے اب اتنے برس ہو گئے تھے اور قمر آرا اس وقت ان کے سا
بیٹھی تھی۔ اس کے گلابی دوپٹے کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا اور وُہ ابھی
آنگن کی دیوار کی کھڑکی پھلانگ کر کنور رانی کی حویلی سے واپس آئی تھی۔ اور بہت
خوش معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اب اس کی پلکیں آنسو گرانے پر آمادہ تھیں۔ کنور رانی اور ا
خاندان دیوے شریف کے میلے کے بعد بارہ بنکی سے لکھنو واپس جانے کے بج
چند روز کے لئے سیدھا مانا ٹھیر آگیا تھا۔ قمر آرا بھی ان سب کے ساتھ اپنے گا
واپس آئی تھی اور رخشندہ بجیا کی تجویز پر لکھنؤ چل کر مسلم گرلز کالج میں داخل ہونے کی
ہمت کر رہی تھی۔

کنور رانی سال میں دو تین بار مانا ٹھیر ضرور آتی تھیں اور اس زمانے میں قصبے
میں بے انتہا رونق ہو جاتی تھی۔ حویلی میں دن بھر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا
رہتا تھا۔ ڈیوڑھیوں میں چوپہلے، پالکیاں اور ادھے کھڑے رہتے۔ باہر دیوان خانے
کے مکان میں کنور صاحب اور پی چو اور لو لو کے پاس لوگ جمع رہتے۔ باہر اور ا
صبح و شام بیسیوں آدمیوں کے لئے دسترخوان بچھتا۔ حویلی کے اندر میراثنیں اور
ناونیں جمع رہتیں۔ رخشندہ کے کمرے میں برادری بھر کی لڑکیاں آ بیٹھتیں اور رات گئے

تک ڈھولک بجتی۔ لوگ کچھ عرصے کے لئے بھول جاتے کہ کال اور لڑائیوں کا اور دکھوں کا زمانہ ہے۔ کروا ہا راج والوں کی روایتی شان و شوکت اس چہل پہل سے کچھ عرصے کے لئے دوبارہ زندہ ہو جاتی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہو لیتے کہ سونے کے پھولوں والے ہاتھی اور سر میلکم ہیلی کو ملکو میاں پکارنے والے بڑے کنور صاحب گو اب زندہ نہیں لیکن عفران منزل کی موٹروں پر کروا ہا راج کے نام کے سفید چمکدار حرفوں والی سرخ پلیٹیں تو اب بھی موجود ہیں۔ انہیں فخر تھا کہ ان کے باپ دادا صدیوں سے جن آقاؤں کی زمینوں سے وابستہ تھے۔ وہ خود بھی اب تک ان ہی کے ساتھ ہیں۔ کروا ہا راج کی طلسماتی روائتوں اور الف لیلوی داستانوں سے ان کا تعلق بھی رہا ہے۔ وہ پی چو بھیا اور رخشندہ بٹیا کے نام پر جان دیتے تھے۔ جب کروا ہا راج کی موٹریں گھاگرا کے کنارے کنارے چلتی ہوئی آکر مانا ٹھیر میں رکتی تھیں تو وہ کھیتوں اور باغوں میں سے دوڑ دوڑ کر سڑک کے دونوں طرف آکھڑے ہوتے تھے اور "بندگی بھیا" "بندگی بٹیا" چلاتے تھے۔

"چودھرائن کے ہاں تو ابھی دربار لگا ہوگا۔ تم اتنی جلدی کیسے آگئیں" چودھری اصغر علی نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد تخت پر سے نیچے اتر کے جوتے تلاش کرتے ہوئے پوچھا

"بابا ہم اس لئے آگئے تھے کہ رخشندہ بجیا پرسوں تک لکھنو واپس جانے کو کہہ رہی ہیں۔ کیونکہ ان کے کالج کی چھٹی ختم ہونے والی ہے۔ ان کے ساتھ اب کے سے ہم بھی چلے جاتے۔ بابا ہم ——" پھر اس کی آواز رندھ گئی۔

آنگن کے چبوترے پر تلسی اور چنبیلی کی جھاڑیوں کے قریب نماز کی چوکی پر امان بیگم اب تک "تحفتہ العوام" کھولے بیٹھی تھیں۔ دھوپ املی کے درخت تک آگئی تھی اور

اور زوال کے وقت میں ایک دو گھڑی دن باقی تھا۔ لیکن جب سے خورشید گھر سے
ہوا تھا وہ پہروں اسی طرح نماز کی چوکی پر بیٹھی رہتی تھیں کہ ممکن ہے خورشید اب بھی
آوے۔ تہواروں کی راتوں میں محلے اور برادری کی لڑکیوں کے ساتھ ڈھولک بجا
بجاتے قمر آرا دفعتہً سوچنے لگتی۔ بھائی میاں کو یہ گیت اتنا پسند تھا۔ پھر ا
خیال آتا۔ شاید بھائی میاں اب بھی واپس آجائیں۔ لیکن خورشید کو گئے اتنا
نکل گیا تھا اور چودھری اصغر علی کی چھوٹی حویلی اسی طرح سنسان پڑی تھی اور اس
یہ بے رنگ دن یونہی گذرتے جا رہے تھے۔

اور اب کنور صاحب کی حویلی میں تین چار دن کے لئے رخشندہ بجیا آگئی تھیں
ان کی وہ ہر وقت شور مچانے والی سہیلیاں ان کے ساتھ تھیں اور وہ سب دن
گراموفون بجاتیں۔ دور دور کھیتوں کی سیر کو نکل جاتیں اور گھاگرا میں کشتی رانی کر
کرتے فیض آباد کے گپتار گھاٹ تک پہنچ جاتیں۔ وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ ا
اچھے دن تھے۔ قمر آرا بہت خوش تھی۔

دوپہر ہو گئی۔ بڑی حویلی کے باغ میں بارہ کا گجر بجا۔ کنور صاحب خاصے
بعد دیوان خانے میں سے اٹھ کر آرام کے لئے اپنے کمرے کی طرف چلے گ
رخشندہ اور ڈائمنڈ اور گنّی نیو تھیٹرز کے پرانے ریکارڈ جو انہوں
دیوان خانے کی کسی الماری میں سے ڈھونڈ نکالے تھے۔ بجاتے بجاتے اکتا
سہ پہر کی چائے کے وقت تک کے لئے سو گئیں۔ دوپہر کا سناٹا رفتہ رفتہ گہ
ہوتا گیا۔ وہی سناٹا جو گرد و نواح کے ہرے علاقوں کی پرسکوں فضاؤں پر ہمیش
چھایا رہتا تھا۔ آم کے جھنڈ کے پرے گھاگرا بڑی آہستہ خرامی سے بہہ رہی

ہزاروں برس سے اسی طرح بہتی آئی تھی۔ جب سیتا مہارانی اور رام چندر جی کے کنول ایسے پیروں نے اس کے ساحل کی ریت کو چھوا تھا۔ جب کرشن بھگوان اس کی لہروں میں گپت ہوتے تھے۔ جب نواب بہو بیگم کی کشتیاں اس کے پانی میں تیرتی تھیں، جب کرو امہاراج کے بجرے اس کی موجوں پر ڈولتے تھے۔ یہ سب مناظر اُس نے دیکھے تھے اور ہمالیہ کے رشیوں کی سی بے تعلقی سے یونہی بہتی رہی تھی مانا ٹھیر کا ہرا بھرا قصبہ سینکڑوں برس سے اسی طرح اُس کے کنارے خوابیدہ تھا اور اپنے اس ابدی سکوت سے مطمئن اور قانع تھا۔ اُس کے آس پاس میلوں تک ہرے جنگل پھیلے تھے۔ جن میں شکار کے لئے ڈھیروں نیل گائیں اور بارہ سنگھے اور مرغابیاں ملتی تھیں اور ارہر اور گیہوں کے کھیت اور ایکھ کے جھنڈ تھے اور ٹھاکروں کی بستیاں تھیں۔ آبادی کے باہر ندی کنارے ٹیلے پر کرو امہاراج کے چودھریوں کے پُرکھوں کی ایک بہت پرانی خانقاہ اور درگاہ کھڑی تھی جو سمرقند و بخارا سے گھوڑوں کی تجارت کرتے وہاں آئے تھے اور انہیں بیچ کر سوتے تھے۔ اس کی بھوری اور شکستہ دیواروں کے گمٹوں میں سے اُگ کر پیپل کے پودے اور لمبی لمبی خودرو گھاس باہر کو جھک آئی تھی۔ آبادی کے وسط میں کنور صاحب کی حویلی تھی۔ اس کے ایک مکان کے صحن میں فصل پر غلّہ آ کر بھرا جاتا تھا اور اسی صحن کے دالان میں لالہ اقبال نرائن تخت پر بیٹھے بیٹھے دن بھر بستی کے چودھری کے فرائض انجام دیا کرتے تھے اور کنور صاحب کی مقدمے بازیوں کی کارروائی میں مشغول رہتے تھے اور بیچوان کے لئے لکھنؤ سے خمیرے کے پارسل منگوایا کرتے تھے۔ دالان کے سامنے آنگن کی کچی زمین میں ایک بہت بڑا ترازو نصب تھا جس میں

اناج کا وزن کیا جاتا تھا وہ ترازو اتنا بڑا تھا کہ اس کے پلڑے میں سر آغا خاں آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔

حویلی کے احاطے میں کھڑے ہوئے بڑے بڑے اصطبل اور مسجدیں اور امام باڑے اور حمّام اور پرانے وقتوں کی جتنی چیزیں اب تک باقی رہ گئی تھیں۔ وہ رفتہ رفتہ ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہوتی جا رہی تھیں۔ پرانے حمام اور بھول بھلیاں اور تہ خانے جو رخشندہ اور پی جو اور پولو کے بچپن میں آنکھ مچولی کھیلنے کی بہترین جگہیں ثابت ہوتے تھے۔ اب ان کے گموں اور سیڑھیوں اور طاقوں میں جنگلی گھاس اور خود رو پودے اگ آئے تھے۔ اس وقت تک صرف ایک ہاتھی بچا تھا جو بارود خانے کے اجاڑ پھاٹک میں کھڑا کان ہلاتا رہتا تھا۔ کہتے ہیں اگر ہاتھی لٹ بھی جائے تو سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ ولایت جاتے وقت کنور صاحب نے اسے فروخت کرنا چاہا۔ لیکن اس بچارے بوڑھے ہاتھی کو کسی نے مفت میں بھی نہ پوچھا اور ایک روز وہ یوں ہی گنے اور امرود کھاتے کھاتے اور اپنی ننھی منّی آنکھوں سے گذرے وقتوں کے خواب دیکھتے دیکھتے ختم ہو گیا۔

مانا ٹھیر کی آبادی میں ٹھاکروں اور کائستھوں کے محلے اور چودھریوں کی بستی شامل تھی اور سفید پوشوں اور شرفا کی آبادی سے ذرا آگے بڑھ کر حجاموں، قصائیوں اور جولاہوں کے محلے تھے اور قصبے کے خاندانی نسابوں کے گھر تھے۔ یہ لوگ جو ذات کے بھاٹ تھے۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ بستی کے دولتمند اور معزز سادات کی شادیوں میں مراسمِ نکاح کے وقت حاضرین کو خاندان کے نسب نامے پڑھ کر سنائیں۔ عجیب و غریب نسب نامے جو حضرتِ آدم کے نام سے چل کر خاندانِ

رسالتؐ کے سلسلے کو ناموں کی طویل فہرست میں سمیٹتے ہوئے فلاں ابن فلاں کے سپوت جاتے یعنی نوشہ میاں کے اسم مبارک پر آ رکتے تھے۔ پھر آبادی کے سرے پر قصبے کی پانڑوں کے خوبصورت دو منزلہ و سہ منزلہ مکانات تھے۔ ان لوگوں کے ہاں ان کی اپنی کھیتی باڑی ہوتی تھی اور ایک زمانہ تھا کہ شام کے وقت اپنے شان دار رنگ برنگے رتھوں اور ادھوں میں ٹھسّے سے بیٹھ کر وہ ہوا خوری کے لئے نکلتی تھیں اور محرم، عید، بقرعید، ہولی اور دیوالی اور دوسرے تہواروں پر بڑی حویلی میں سلام کے لئے حاضر ہوا کرتی تھیں۔ آج بھی آپ اگر کسی پرانی قسم کی قصباتی شادی یا کسی اور تقریب کی مردانہ محفل میں تشریف لے جایئے تو آپ کو چند مہکتی، لہکتی خواتین کا تعارف اس طرح کروایا جائے گا۔ کہ یہ چھوٹے نواب صاحب کا شوق ہیں اور یہ بڑے بھیّا صاحب یا منجھلے کنور صاحب کا شوق ہیں۔ ان مکانات کے علاوہ مانا ٹھیر کی سڑک کے شروع میں ایک بہت بڑی عمارت تھی جو پہلے کسی ہندو ٹھاکر یا زمیندار کی حویلی رہی ہوگی۔ لیکن اب اس میں شکر کا کارخانہ تھا۔ مشرقی اضلاع سے گنے کے ڈھیر چھوٹی لائن پر لڑھکتی ہوئی ننھی منّی مال گاڑیوں پر لد کر وہاں پہنچتے تھے اور راب اور کھانڈ اور شکر تیار کی جاتی تھی۔ مانا ٹھیر بہت موڈرن ہوتا جاتا تھا۔ وہاں بجلی کی روشنی اور ریڈیو پہنچ چکا تھا۔ ایک ٹاؤن ایریا کمیٹی تھی۔ دو ہسپتال تھے۔ ایک سرکاری اور ایک امریکن مشن کا۔ کئی مڈل اسکول اور پاٹھ شالے تھے سینما ہاؤس کھولنے کی تجویز کی جا رہی تھی۔ سید افتخار کا پروپگنڈہ سنٹر اور اسٹڈی سرکل قائم ہو چکا تھا۔

دھوپ ڈھلنے لگی۔ ہوا کا ایک خنک جھونکا انار کے پتوں کو سرسراتا رخشندہ

کی صحنچی میں آن گھسا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ شال لپیٹ کر اُٹھ بیٹھی۔ شام کی چائے میں ابھی دیر تھی۔ اور گِنّی اور ڈائمنڈا اور راد ما مہمان خانے کے کمرے میں خواب خرگوش میں مصروف تھیں۔ اسے یہ سوچ کر بڑی کوفت ہوئی کہ چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں اور پھر کالج جانا ہے۔ کالج کے خیال پر اسے قمر آرا یاد آ گئی۔ جو صبح اس سے کہہ رہی تھی کہ اگر وہ بھی اس کے ساتھ چلی چلے تو کتنا اچھا ہو۔

"اے عباسی خانم ـــ" اس نے انگڑائی لے کر آواز دی۔

"ارے بٹیا جاگ گئیں ـــ کیا چاء منگواؤں بٹیا۔" عباسی خانم نے اپنی پلنگڑی پر سے ہڑبڑا کر اُٹھتے ہوئے دالان میں سے پکارا۔

"نہیں عبّاسی خانم ذرا گل شبّو کو چھوٹی حویلی بھیج کر قمر آرا سے کہلوا دیجئے کہ بٹیا بلاتی ہیں۔" اس نے مسہری پر لیٹے لیٹے کاہلی سے جواب دیا۔

گل شبّو اپنے پڑاقنے کی گوٹ کے اودے غرارے کے پائنچے سنبھالتی ہوئی صحنچی میں سے کودتی چنبیلی کی کیاریوں پھلانگتی آن کی آن میں آنگن کی دیوار پر جا پہنچی اور کھڑکی میں جھانک کر چلائی ـــ "کمر بٹیا ـــ اے کمر بٹیا ـــ چلیئے آپ کو ہمری بٹیا بلاوت ہیں۔"

"اچھا چلو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔" قمر آرا نے اپنے کمرے میں سے جواب دیا۔

بیگم اصغر علی نے دالان کے تخت پر لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر آنکھ کھولی۔

"اے واہ ری رخشندہ بٹیا ـــ" انہوں نے سوچا۔ "کھن پیری کہیں کی ـــ گھر کا گھر دوا کر دیا کنور رانی کی لاڈلی نے۔ کھا گئی میرے بیٹے کو۔ دماغ لوٹا دیا اس کا۔ بولا دیا میرے لال کو ـــ جانے کون جنگلوں کی خاک چھانتا پھرتا ہوگا دکھیا۔ اور اب

راجکماری کی شان دیکھنے کہ چلو بیٹیا بلاتی ہیں ـ" انہوں نے دھوپ سے بچنے کے لئے پھر دوپٹہ چہرے پہ ڈال لیا اور دیوار کی طرف کروٹ کرلی۔

قمر آرا نے جلدی جلدی بال سنوارے اور دوپٹہ کندھے پہ ڈال کر آنگن کی کھڑکی کی طرف بھاگ گئی۔

بیگم اصغر علی اسی طرح منہ لپیٹے پڑی رہیں۔ پھر ظہر کی نماز کے لئے اٹھ بیٹھیں سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے اور آنگن میں املی کا درخت ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہا تھا۔

پولو کار لے کر کسی کام سے لکھنؤ واپس جا چکا تھا۔ پی چو اپنی بہنوں کے ساتھ چاء پینے کے لئے دیوان خانے سے اندر آ گیا تھا۔

"تم لوگ لکھنؤ کب جا رہی ہو؟" اس نے چاء بناتے ہوئے پوچھا۔

"کل۔ کیوں کیا تم ہمارے ساتھ چلوگے؟" رخشندہ نے دریافت کیا۔

"نہیں بھئی قصہ یہ ہے کہ پولو کار لکھنؤ لے جا چکا ہے۔ تم سب کو ٹرین سے جانا پڑے گا۔"

"ٹرین سے؟ ہولی میکرل۔ بڑا مزا آئے گا۔" ڈائمنڈ نے اچھل کر کہا۔

"قمر آرا بیگم کیا تمہارے ساتھ جاویں گی؟" پی چو نے پوچھا۔ سب قمر آرا کو دیکھنے لگے۔ اس کا رنگ جاڑوں کی ڈھلتی ہوئی دھوپ میں جو محرابوں کی جالی میں چھن چھن کر اندر آ رہی تھی اور گلابی ہو گیا۔

"انہوں نے چچا میاں سے کہا تو ہے۔" رخشندہ نے کہا۔ "تم اتنی دیر سے باہر بیٹھے کیا کر رہے تھے پی چو۔ ذرا پہلے آجاتے تو ہم لوگ ستانے کے بجائے برج کھیلتے"

"بھئی چودھری شمیم اپنا تازہ ترین سوٹ پہنے آئے بیٹھے تھے۔ ان سے سر کھ
اب چھٹکارا ملا ہے"۔

"چودھری شمیم یہاں کیا کر رہے ہیں۔ وہ تو فیض آباد میں تھے"۔ رخشندہ نے پوچھ
"ممی سے ملنے تشریف لائے ہیں۔ جانتی نہیں ہو ممی کے بیحد چہیتے بھائی بھتیج
ہیں۔ پھر یکلخت پی چو نے محسوس کیا کہ چودھری شمیم کا ذکر قمر آرا کو بہت ناگوار گذ
رہا ہے۔ اس نے موضوع فوراً تبدیل کر دیا۔ "اچھا چلو برج کھیلیں"۔ قمر آرا برج
نہیں جانتی تھی۔ اس کی دوسرا نھ کے لئے رخشندہ صحنچی ہی میں بیٹھی رہی۔ پی چو
اور دوسری لڑکیاں اندر جا کر کھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔

قمر آرا تخت کے کونے پر بیٹھی ریکارڈوں کا البم الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔
اس کی جھکی ہوئی کالی پلکیں دیکھ کر دفعتہً رخشندہ کو بڑی تکلیف دہ شدت سے
کوئی بہت پرانی بات یاد آگئی۔ قمر آرا کی آنکھیں۔ خورشید کی آنکھیں متجسس، خوفزدہ،
وحشی کالی آنکھیں۔ ان آنکھوں نے کہا تھا۔ تم ہمیں بہت جلد بھول جاؤ گی۔ اس لئے
زیادہ رنجیدہ نہ ہو۔ وہ زیادہ کیا ذرا بھی رنجیدہ نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ خورشید مدتوں سے
غائب تھا۔ خورشید جو کانپور میں مزدوروں کے ساتھ رہتا تھا۔ مئی اور جون کی گرمیوں
میں ٹین کے تپتے سائبانوں کے نیچے لیٹتا تھا۔ نل کا گرم پانی پیتا تھا اور ترقی پسند
شاعری کرتا تھا جسے پی چو اور پولومبر آجی کے "کالے کلمو ہے کوٹے" اسکول کی
شاعری کہا کرتے تھے۔ وہ سب خوب ہی اس پر ہنستے تھے۔ انڈر گراؤنڈ ہونے سے
پہلے وہ عرصے تک پچیس روپے ماہوار پر جو اسے پارٹی کی طرف سے ملتے تھے بمبئی
جیسی جگہ میں گذر کرتا رہا تھا۔ ساٹھ روپے ماہوار تو رخشندہ کے شوفر کی تنخواہ تھی۔

خورشید۔ خورشید — اس کے پاس اس کے اپنے کپڑے کبھی نہ ہوتے تھے کسی نے کوٹ دے دیا وہ پہن لیا۔ کسی کا کمبل یا شال اوڑھ لی۔ کسی کی چادر لپیٹ لی اور کامریڈ خورشید غفران منزل چلے آ رہے ہیں۔ اپنی ذاتی ضروریات سے زیادہ جو چیز بھی اس کے پاس ہوتی وہ فوراً پارٹی کے دوسرے ساتھیوں کو دے دی جاتی۔ وہ بچوں کی طرح ہنس پڑتا تھا اور اپنے حلقے میں بہت مقبول تھا۔ لمبی سی سرخ رنگ کی لاری میں جس پر سرخ جھنڈا لہرایا کرتا تھا۔ وہ اکثر ڈاکٹر محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں اور ان کے رفیقوں کے ساتھ جانے کا ہے میں مصروف گھومتا نظر آتا تھا۔ اس کے بوہیمین انداز اور یہ حرکتیں رخشندہ کو بہت دلچسپ معلوم ہوتیں رخشندہ نے ایک دفعہ کہا تھا۔ بھئی خاندان میں ہر قسم کی مخلوق ہونی چاہئیے۔ مثلاً خورشید میاں ہمارے گھر کے قومی ہیرو نمبر وَن۔ اس کے اور غفران منزل والوں کے سیاسی خیالات میں بڑا زبردست اختلاف تھا۔ وہ پہروں ان بہن بھائیو کے ساتھ الجھتا رہتا اور وہ اس کی ہر بات مذاق میں اڑا دیتے اور آخر میں اسے اپنے ہمراہ جم خانہ یا دلکشا کلب لے جانے کی دعوت دے دیتے "کہو بھئی تمہارے وطن روس کی حکومتِ عامّہ کیا کہتی ہے۔" پی چو بات شروع کرتا۔ "اماں کا کیا ذکر تھا۔" پوٹو بیچ میں کود پڑتا۔ "پوٹو بچارے خورشید کو تنگ نہ کرو۔ رخشندہ ڈانٹتی "ارے تم زوال پذیر زمیندار لوگ۔ کیا کہا کہ ہمیں تنگ کرو گے۔" وہ بچوں کی طرح ہنس کر کہتا۔ کہا جاتا تھا جس روز وہ غائب ہوا۔ وہ دس بجے رات کو غفران منزل آیا۔ رخشندہ کالج کا کام ختم کرنے کے بعد لیمپ بجھا کر سونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اس کے ڈریسنگ روم کا پچھلا دروازہ کھلا اور ہوا کے ایک

تیز جھونکے کے ساتھ وہ دفعتہً اندر آ گیا۔ اس کے گھنگھریالے بال الجھے ہوئے تھے۔ اور اس کی کالی آنکھوں سے لگتا تھا۔ وہ کئی راتوں کا جگا ہوا ہے۔ وہ چند لحظوں تک اسے غور سے دیکھتا رہا۔ رخشندہ پریشان ہو کر دروازے کی طرف بڑھی۔ لیکن وہ اس کے سامنے آ گیا اور بڑی عجیب آواز میں کہنے لگا۔ "رخشندہ تم — تم بلّی ہو"۔ رخشندہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "افوہ۔ صرف یہ اطلاع دینے کو تم اس وقت ہمارے کمرے میں آئے ہو۔ چلو کھانا کھا لو"۔ اس نے عباسی خانم کو آواز دینی چاہی۔ لیکن خورشید نے پھر اسی انداز سے دہرایا۔ "تم بلّی ہو — بلّی ہو — سمجھیں"۔ "افوہ کتنی پٹی ہوئی تشبیہہ دی ہے۔ تم تو جدید شاعری کرتے ہو۔ بھائی کوئی نئی بات کہی ہوتی"۔ لیکن وہ بہت خوفزدہ تھی کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ پھر چیخا — "رخشندہ بیگم اب تم میرا انداق نہیں اڑا سکتیں"۔ خورشید رخشندہ نے اسے چپ کرانا چاہا۔ اس نے محسوس کیا کہ واقعی اس کا دماغ چل گیا ہے۔ بیچارہ خورشید۔ اس کی آواز اونچی ہوتی گئی۔ "میں تمہیں مار ڈالوں گا جان سے تم سب کو۔ غفران منزل کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ کرو اہا راج تباہ ہو جائے گا کرو اہا راج کس کا ہے کسانوں کا۔ غفران منزل کس کی ہے مزدوروں کی — انقلاب زندہ باد"۔ — "پی چو"۔ رخشندہ چلّائی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ ریوالور نکالے گا۔ کرسیاں اٹھا کر اس پر پھینکے گا۔ کوئی اور اسی قسم کی حرکت کرے گا۔ پھر پولیس آئے گی۔ اخباروں میں قصے چھپیں گے۔ رپورٹر آن پہنچیں گے۔ ایک لحظے میں یہ ساری باتیں اس کے دماغ میں آئیں۔ اس نے پھر پی چو کو آواز دی۔ "اس طرح مت چیخو۔ جیسے کوئی دیوانہ تمہارے کمرے میں آ گھسا ہے۔ نوکروں کو مت بلاؤ۔ اگر تم خود مجھ سے کہدو کہ چلے جاؤ تو میں چلا جاؤں گا۔ کبھی یہاں نہ آؤں گا"۔ اس نے یکلخت سنبھل کر کہا۔ "خورشید باہر جاؤ۔ اسی

وقت نکلو۔ چلو باہر" رخشندہ نے دیوار کی طرف ہٹتے ہوئے کہا۔ دوسرے لمحے وہ دفعتہً بالکل خاموش ہو کر آہستہ سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ باہر اماوس کی رات کی مکمل تاریکی تھی اور ہوائیں یوکلپٹس کے درختوں میں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔

اس وقت قمر آرا کو چپ چاپ اپنی کالی پلکیں جھپکاتا دیکھ کر دفعتہً اسے یہ سب پرانی، حماقت انگیز باتیں یاد آئیں۔ بچارہ خورشید۔ جانے آج کل کس چکر میں پھرتا ہوگا اُس نے بڑی ہمدردی سے دل میں سوچا۔

"کٹ تھروٹ" سے اکتا کر پی چو نے رخشندہ کو آواز دی" ارے بھئی روشی تم بھی آؤ۔ چلو قمر آرا بیگم کو بھی کھیلنا سکھا دیں۔"

وہ سب کھانے کے وقت تک کے لئے برج میں مشغول ہو گئے۔

پھر رات کا اندھیرا چھا گیا۔ کھانے کے انتظام سے چھٹی پا کر عباسی خانم آنگن کے پرے اپنے ڈیرے کی صحنچی میں دوسری مغلانیوں اور خواصوں کے ساتھ آبیٹھیں ڈلی کاٹی جانے لگی۔

"کل شبو کہت رہی چھوٹی حویلی والی بٹیا ہو نکھلو جائے کا چاہت ہیں" شعلہ پری نے زردہ پھانکتے ہوئے اس روز کا اہم ترین موضوع سخن چھیڑا۔ سب عباسی خانم کی طرف بیحد اشتیاق اور عقیدت سے متوجہ ہو گئیں۔ تاکہ وہ اس مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کریں اور اس سے متعلق دوسرے حالات و واقعات پر تبصرہ فرماویں۔

عباسی خانم پچھلے تین روز سے، جب سے وہ بارہ بنکی سے مانا ٹھیر آئی تھیں یہ غور کر رہی تھیں کہ رخشندہ بٹیا نے تو قمر بٹیا سے اتنی دوستی کر رکھی ہے۔ لیکن کنور رانی ایکو بار بھی کھڑکی پار کر کے چھوٹی حویلی والی بیگم سے ملنے نہیں گئیں۔ نہ وہ خود ہی یہاں

آئیں"۔ ہائے کیا زمانہ آلگا ہے"۔ انہوں نے کہنا شروع کیا"۔ چھوٹی حویلی والوں پر گھڑی پہر ہے۔ کوئی ان کا ساتھی نہیں۔ کہاں کے رشتے کہاں کی عزیز داری۔ ایک رخش بٹیا ذری ہنس کر بات کر لیتی ہیں تو قمر بٹیا کیسی دوڑ دوڑ کر ان سے ملنے آتی ہیں۔ اگلے زمانے کی محبتیں اور اخلاص تھا۔ کیا آغا اور کیا خادم۔ کیا بھائی بھائی اور کیا رشتے دار سب ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ عباسی خانم کی اس زمانے میں نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ اپنے سسرال کے گاؤں روشن آباد میں تھیں۔ عباسی خانم کے میاں آدھی رات کو چل کے روشن آباد کے موضع سے جو علی گنج سے آگے ہے جس کے راستے میں اب ازابلا تھوبرن کالج کی نو آبادی ہے۔ گومتی پار کر کے صبح ہوتے ہوتے زعفران منزل پہنچتے تھے تاکہ صبح صبح بڑے کنور صاحب مرحوم کی دوائیں اپنے ہاتھ سے تیار کر کے ناشتے کے وقت تک دے سکیں۔ ایک بار جب بڑی بہیا آئی ہے اور گومتی کا کاٹھ کا پل ٹوٹا ہے تو وہ مولا انہیں جنت نصیب کرے۔ پانی ہیر پیر کر زعفران منزل پہنچے تھے۔ لیکن کام میں دیر نہ ہونے دی تھی۔ کنور صاحب خلد آشیاں نے بیسیوں مرتبہ کہا کہ آغا چھمن کیوں بیکار میں اتنی دردسری کرتے ہو کہ صبح سویرے اتنے کوس پیدل چل کر فرض کر کے آتے ہو۔ تمہاری دلہن جب تک روشن آباد سے زعفران منزل نہ آویں۔ تم بھی ذرا دیر کر کے آیا کرو تو انہوں نے دست بستہ عرض کی تھی۔ سرکار مجھے آپ کی دواؤں کے معاملے میں ہیں کسی دوسرے پر بھروسہ نہیں۔ اب بھی دیکھ لو (عباسی خانم نے کہا) انہیں قمر بٹیا کے پردادا رخشندہ بٹیا کے پردادا کے چھوٹے بھائی تھے۔ چھوٹے بھائی گذارے دار تھے اور رنڈوے ہو گئے تھے۔ کمپنی بہادر کی سرکار کی آنکھوں کا تارا تھے۔ شان سے صاحب لوگ کے ساتھ شکاری

کتے لئے دوروں پر گھومتے تھے اور کلکتے جا کر میم لوگ کے ساتھ کالا پانی پیتے تھے۔
جب تباہی مچی ہے تو اس وقت رخشندہ بٹیا کے پردادا نے قلم اٹھا کر معافی کی جتنی
جاگیریں اور پٹی داری کے جتنے علاقے ترائی تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان سب کے نام
فہرست سے کاٹنے شروع کر دیئے کہ برا زمانہ آ لگا ہے۔ جانے کل تک کیا سے کیا
ہو جاوے۔ اتنی بڑی ریاست رکھ کر کیا کریں گے۔ گذارے بھر کے خیال سے سوڈیڑھ
سو گاؤں رکھ لئے اور اس سے پہلے کہ فرنگی کا پروانہ آن پہنچے۔ اپنی عزت بچانے
کے خیال سے باقی سب خود ہی کمپنی بہادر سے کہہ دیا کہ بھائی شوق سے ضبط کر لو۔
اس پر بھی جب فرنگیوں نے لکھنو میں بیگمات کے محلوں کا محاصرہ کیا ہے اور نواب
کے نہتّے وفادار اپنی جان لڑا کر چھتر منزل کی بیگمات کی حفاظت میں لگے ہیں۔ اس وقت
دشمنوں نے خبر کر دی کہ کروا ہا راج کے کنور صاحب جان عالم سے ملے ہوئے
ہیں۔ کنور صاحب بڑے جری آدمی تھے۔ انہوں نے حویلی میں پورا پورا انتظام کر رکھا
تھا۔ بندوقیں اور بھائی میرے اس کا نام لیجئے۔ فلیتے اور گولہ بارود سبھی کچھ تھا۔ اب
ادھر کی سنو کہ چھوٹے بھائی جو تھے۔ قمر بٹیا کے پردادا، وہ بڑی مستعدی سے انگریزوں
کی مدد کر رہے تھے۔ ۵۶ میں جب سلطان عالم اور ان کے خاندان والے مٹیا برج
گئے ہیں اور اودھ کی حکومت کا خاتمہ ہوا ہے تو اس کے کچھ روز بعد ہی کلکتے کی
بڑی عدالت نے حکم دیا کہ کروا ہا راج کے کنور صاحب کو بغاوت کے جرم میں تو
بیلی گارد ریذیڈنسی کی توپ کے منہ سے باندھ کر گولی سے اڑا دیا جاوے اور چھوٹے
کنور صاحب کو وفاداری کے صلے میں گھاگرا کنارے کی ساری معافی کی زمینیں
بحال کر دی جاویں۔ ذری سوچئے کہ حالانکہ دونوں بھائیوں میں کتنی بڑی دشمناگی تھی اور

مدتوں سے ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھی تھی۔ لیکن موقع پر خون نے جوش مارا۔
چھوٹے کنور صاحب نے صاحب گورنر بہادر سے عرض کی کہ حضور میری جاگیر
انعام اکرام سب مجھ سے واپس لے لیجئے۔ فقط بھائی صاحب کی جان بخشی کردی
اس زمانے کا فرنگی بھی بڑا شریف ہوتا تھا۔ اُس نے فوراً حکم دیا کہ کنور صاحب کی
کی جائے۔ سب زمینیں بھی انہیں واپس مل گئیں اور کہ داہا راج کی شان چھوٹے
کی قربانی کی وجہ سے ویسی ہی قائم رہی۔ ایک وہ زمانے تھے اور اب کوئی جانتا
نہیں کہ چھوٹی حویلی والوں نے ان کے لئے کیا کیا تھا۔ چھوٹی حویلی والوں کے
اب کچھ نہ رہا تھا۔ ان کا علاقے قحط زدہ تھے۔ ان کی فصلیں خراب رہتی تھیں۔
رعایا جس میں زیادہ تر جنگجو ٹھاکر تھے۔ ان کے بس کی نہ تھی۔ ان کا اکلوتا
سے بھاگ گیا تھا۔

عباسی خانم یہ قصہ پہلے بھی بیسیوں مرتبہ سنا چکی تھیں۔
لیکن قمر آرا کو ان باتوں سے کچھ مطلب تھا۔ اس نے ان قصوں پر کبھی دھیان
دیا تھا۔ وہ کبھی کبھی صرف یہ سوچا کرتی تھی کہ رخشندہ بجیا نے ایسے کون سے ثواب
ہیں جو دنیا کی نعمتیں انہیں حاصل ہیں اور اس وقت رات کے کھانے کے بعد
حویلی سے واپس آکر اسے پتہ چلا تھا کہ بابا ابھی اسے لکھنؤ نہیں بھیج سکتے۔ لکھنؤ
گرلز کالج کہیں بھاگا تھوڑا ہی جاتا ہے۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ رخشندہ بجیا دوسرے
روز صبح ہی صبح لکھنؤ روانہ ہونے والی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب خوب رو
آخر وہ ایسا ہی بدقسمت کیوں تھی اور ایک چودھری شمیم تھے جو اس طرح اس سے
کرنے کو تلے بیٹھے تھے۔ گویا بنسی لئے مچھلی کا شکار فرمانے ہیں۔ صرف کانٹا حلق میں

ں دیر ہے۔

دالان کے پردے گرا کر وہ اپنی مسہری پر جا گری اور کچھ دیر بعد سو گئی۔

پھر گھاگرا کے ساحلوں پر سے گذرتا۔لیموں کی ڈالیوں کو ہلاتا جاڑوں کی صبح کا ٹھنڈا
ہونکا سہ دری کے شیشوں سے آ ٹکرایا اور گہنی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھڑی پر نظر
الی۔چار بج رہے تھے۔ ارے بھئی اٹھو میم لوگ۔ اس نے آواز دی۔سب ہڑبڑا کر اٹھ
بیٹھے۔مہریوں نے جلدی جلدی غسلخانوں میں گرم پانی رکھا۔ اسباب لالہ اقبال نرائن کی
رانی میں دیوانخانے میں پہنچایا گیا۔کنور رانی کے کمرے میں جمع ہو کر انہوں نے جلدی جلدی
ختم کی۔پی چو نیلے رنگ کا گرم ڈریسنگ گاؤن پہنے سگریٹ کا دھواں زخشندہ کے
رے پر چھوڑتا اپنی بہنوں کو سوار کروانے کے لئے دیوانخانے کے بڑے پھاٹک تک
ا۔اسٹیشن تک موٹر کی سڑک نہیں تھی۔اس لئے ریل پر جانے کے لئے بہلی یا ادھے کی
واری کی جاتی تھی۔شالوں اور کمبلوں میں لپٹ کر وہ سب بہلی میں جا بیٹھیں۔ اس کے
رخ پردے جن پر سفید کٹاؤ کا کام بنا تھا۔چاروں طرف گرا دیئے گئے۔ لالہ اقبال نرائن
د سپاہیوں کے ساتھ آگے بیٹھ گئے اور ٹن ٹن کرتی بہلی چل پڑی اور کرواہا راج کی
لی اور مانا ٹھبر کے خوابیدہ پرسکون قصبے اور آم کے باغات کو اپنے پیچھے چھوڑتی
ڑی کچی سڑک پر دوڑنے لگی۔

کہر آلود دھندلکے میں مانا ٹھبر کا اسٹیشن دور سے ایسا لگتا تھا جیسے کسی دیو نے ان
رے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹا سا لکڑی کا گھروندا کہیں سے لا کر وہاں رکھ دیا ہے
ر چھوٹی لائن پر اٹھلاتی، شور مچاتی ننھی منی سی ٹرین آکر دو تین منٹ کے لئے رک جاتی
کہ دوڑ بھاگ مچا کر بے حد انتظام سے بیگمات کو سوار کروا لیتے اور ہرے کھیتوں اور

جنگلوں میں سے گذرتی گھاگرا کو عبور کرتی ہوئی وہ ٹرین بھر شہروں کی طرف چل پڑتا
ہوتا کہ لالہ ہانپتے کانپتے گارڈ کے پاس پہنچتے "اے قبلہ گارڈ صاحب اک ذی
منٹ اور ٹھہر جائیے گا۔ کروا ہا راج کی سواریاں تشریف لائی ہیں" اور ٹرین ال ج
کھڑی رہتی۔ بالکل گھریلو معاملہ لگتا۔ ایک خوبصورت لطیفہ یہ تھا کہ لالہ کا کنبہ
رخشندہ اور دوسری بیگمات سے کروا ہا راج میں اوفیشیل قسم کا پردہ رہتا تھا۔
دادا پردادا پشتوں سے کروا ہا راج میں مختارِ عام رہے تھے۔ پرانی وضعداری ب
نبھانا تھا۔ ورنہ لالہ خوب دیکھتے تھے کہ شہر میں پردہ تو دور کی چیز ہے بٹیا ہے
پر سائیکلوں تک پہ گھومتی ہیں۔

دوسری ریل آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ آسمان کے مدھم ستارے دن
سنسان پلیٹ فارم کے ایک کنارے پر سوٹ کیس ایک طرف رکھے لیمپ
کھمبے سے ٹیک لگائے وہ دیر سے کھڑا پریشان ہو رہا تھا۔ اتنا کہ ایک آدمی
سامنے سے گذر رہا تھا۔ اس نے آواز دی "ارے بھئی یہاں تانگہ وانگہ نہیں ہے"
"تانگہ نہیں صاحب یہاں بہلی چلتی ہے۔ یا چاہے اکہ لے لیجئے۔ کہاں
چودھریوں کی بستی یا ٹھاکروں کی"؟ اس آدمی نے کمبل کا بکل مار کے منہ
چلم کریدتے ہوئے پوچھا۔ پھر اس نے قریب سے گذرتے ہوئے لالہ اقبال کو
پکارا "لو بھئی لالہ! ای صاحب بہادر جان پڑت ہے۔ تمہرے ہیاں جائے کا چاہت
ہیں۔ اپنے لگے ہی بٹھلائے لئے جاؤ"۔ یہ فیصلہ کر کے وہ ناریل کے کش بھرتا ہوا
پھلانگ کر کھر کے دھندلکے میں غائب ہو گیا۔

وہ انتہائی اکتاہٹ اور بیزاری کے ساتھ کھمبے کے پرے ٹہلنے لگا۔

اسٹیشن ماسٹر کی کھڑکی کے آگے مال گودام کے ایک اونچے سیاہ صندوق پر
ٹوٹی لڑکیوں نے کھسر پھسر شروع کر دی "ہولی اسموک۔ کتنا ہینڈسم آدمی ہے۔"
ہمیں ملیبن کا بھائی"۔ "ارے چُپ تو لالہ سُن لیں گے۔" "لالہ پوچھتے کاہے نہیں۔ کیا
سے ملنا چاہتے ہیں آپ۔"

لالہ کھنکارتے ہوئے بے حد اہتمام سے آگے بڑھے۔ "تسلیمات عرض کرتا ہوں
کہاں تشریف لے جائیے گا۔ بہلی حاضر ہے۔ بندہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ
کروا ہاراج کے کنور صاحب سے ملاقات کا قصد رکھتے ہیں یا ——"

لہ ٹرین آگئی اور لالہ اپنی تمہید چھوڑ چھاڑ کر ہڑبڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔

وہ سب بہت تھکے ہارے غفران منزل واپس پہنچے۔ کالج کی ایک ہفتے کی چھٹی
نے والی تھی اور ڈائمنڈ، گنی اور اُوما غفران منزل سے اپنے اپنے گھروں کو
کی فکر میں تھیں۔ وہ سب ہمیشہ کی طرح بہت خوش اور مطمئن تھیں۔ انہوں
استے میں چلا چلا کر گیت گائے تھے۔ چنے کے کھیتوں کو روندا تھا۔ گھاگرا کی
یں مچھلیاں پکڑی تھیں اور اب وہ پی چو کے سٹنگ روم میں سہ پہر کی چائے کی
تھیں۔

اس تیز گام زندگی میں جس کا ہر لمحہ ہمیں اس زناٹے سے مستقبل کی ان دیکھی اندھیری
ں کی طرف دھکیلتا آگے نکل جاتا ہے۔ ایسے وقتوں کی جنہوں نے ہمیں تھوڑی سی
لئے بھی مسرت بخشی اور ایسے ساتھیوں کی جو ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں ہمارے
رہے۔ ہمیں قدر کرنی چاہئیے۔ جی چاہتا ہے۔ ان ساری نعمتوں کے لئے تہ دل

سے خدائے قدوس کا شکر ادا کیجئے۔

تو گویا یہ یوں ہے۔ نیو آیرا کے نئے پرچے کے کنارے پر بے ربط سطریں
لکھتے اور پکاسو کی قسم کی تصویریں بناتے بناتے اکتا کر رخشندہ نے کشن پر سر رکھ
سوچنے لگی۔ کہ اب کیا کروں۔ موڈرن آرٹ میں یہ ہے کہ جتنی بھی آڑی ترچھی لکیریں
کھینچئے گا۔ اتنا ہی زیادہ موڈرن آرٹ ہو گا۔ نہایت شوخ رنگوں سے کاغذ کی
دوسرے میں اُلجھے ہوئے پُھندنے بنا دیجئے اور رنگ کے دھبوں کو خلط ملط کر
بعد فن کے نقادوں کو ان میں انتہائی گہرے معنی تلاش کرنے کے لئے چھوڑ دیجئے اور
برن جونز اور جوزف ٹرنر اور کانسٹبل تھے۔ یہ سب بیوقوف تھے۔ رخشندہ کو اس
آیا بھئی واہ۔ زندگیوں کا چکر ہے کہ چلے جا رہا ہے۔ اس میں جانے کتنے دل
کتنی مایوسیاں اُٹھانی پڑیں گی کتنے انقلاب آئیں گے۔ پچھلا ہفتہ بارہ بنکی اور
میں کس قدر دلچسپی کا گذرا۔ وہ دور دور تک جنگل کی پگڈنڈیوں پر گھومی۔ "گلیمر
والے ایڈوینچر پر قہقہے لگائے۔ میوزک کانفرنس کی تنقیدیں کیں۔ بیل گاڑیوں
گنے کھائے اور اب یہاں پھر وہی پرانی زندگی شروع ہو جائے گی۔ کالج کی
دلکشا کلب کی شامیں۔ زندگی فی الحال بڑی بھرپور تھی۔ بڑی مکمل۔ وہ ان لمحوں
خدائے قدوس کی شکر گذار تھی۔ کیوں نہیں دنیا میں سب لوگ اسی طرح بشاش
لیکن دفعتہً اس کے من میں جانے کہاں چھپے ہوئے ایک چور نے اچک کر
رخشندہ بیگم یہ غلط ہے۔ تم کبھی بھی خوش نہیں رہیں۔ تم تو ہمیشہ اپنے آپ کو
رہتی ہو۔ تم زندگی سے قانع تو کبھی بھی نہیں ہو تیں "دہشت"۔ رخشندہ نے
سر ہلا کر کہنا چاہا۔

گنتی کمرے کے سرے پر جلدی جلدی نئی انگریزی کتابوں پر وہ تبصرہ مکمل کر رہی
ں جو وہ پچھلے ہفتے رخشندہ کے ساتھ لکھنؤ سے باہر چلے جانے کی وجہ سے اب تک
کر براڈکاسٹ کے لئے دِل کو نہ دے سکی تھی۔ ڈائمنڈ رخشندہ کے پیانو پر وہ گیت
نے کی کوشش کر رہی تھی جو اس نے پچھلے ہفتے میوزک کانفرنس میں طلعت محمود
ے سُنا تھا۔ پی چو کا سب شدت سے انتظار کر رہے تھے۔

رخشندہ بہت دنوں بعد ایک دم پھر سے رنجیدہ ہوگئی۔ انسان کی موڈھی کیا
متیں کرتی ہے۔

باہر ڈرائیو پر ایک کار آکر رکی۔ ایک بالکل اجنبی ہارن بجا اور بجری پر کسی کے
وں کی رگڑ کی آواز آئی۔

”کون آیا ہے جنے۔ گیتی ڈارلنگ تم دروازے کے قریب بیٹھی ہو۔ ذرا دیکھنا تو سہی“
شندہ نے کاہلی سے کہا۔

”ارے روشی ڈارلنگ ذرا تم ہی اٹھ کر دیکھ لو۔ میرے دماغ میں اس قدر بہترین جملہ
ت آیا ہے۔ وہ نکل جائے گا۔ گیتی پھر کاغذوں پر جھک گئی اور لکھنے لگی۔ ”اسٹیلن بک
ن کی عظمت —“

رخشندہ اکتاہٹ کے ساتھ اٹھی اور کمرے کی لمبان طے کر کے باہر برآمدے میں آئی۔
ر ریلنگ پر جھک کر اس نے دیکھا کہ وہ سانولا، انوکھا، مغرور، سیاہ آنکھوں اور لمبی
ں والا اجنبی اس کے سامنے کھڑا بڑی بے نیازی سے چاروں طرف دیکھ کر شاید
ی نوکر کو آواز دینے والا ہے۔

اوہ — یہ وہی ہے۔ یہ وہی ہے۔ یہ وہی ہے۔

وہ تو اسے جانتی تھی۔ اسے ہمیشہ سے معلوم تھا۔ وہ کبھی نہ کبھی آئے گا۔ وہ کبھی نہ کبھی ضرور اس سے دوبارہ ملے گا۔ صوبے کے گزٹ میں دو تین روز ہوئے۔ اس نے اس کا نام بھی دیکھا تھا۔

"اوہ"۔ رخشندہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اوہ"۔ اس نے اتنا ہی مختصر سا گویا اسے جواب دیا۔

"آپ ڈاکٹر سلیم ہیں"۔ رخشندہ نے سیڑھیوں پہ آکر اسے اطلاع دی۔

"جی۔ اوپر آجاؤں؟"

"ضرور۔ پی چو باہر گیا ہوا ہے۔ ابھی آتا ہوگا"۔

"—؟؟"

"پی چو میرا بھائی ہے"۔

"جی۔ اور یہ غفران منزل ۲۴ اوڈرم روڈ، لکھنؤ ہے"۔ اس نے اسی لہجے میں کہا۔ رخشندہ کو باوجودیکہ اس وقت وہ اتنی رنجیدہ تھی ہنسی آگئی۔ "اندر تشریف لائیے" اس نے ریلنگ پر سے اترتے ہوئے کہا۔

وہ سٹنگ روم میں آکر چپ چاپ ایک گوشے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

گنتی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گئی۔

ڈائمنڈ طلعت محمود کا گیت بجاتی رہی۔

رخشندہ نے پکاسو پر پھر سے ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

چند منٹ اسی طرح گذر گئے۔ وہ خاموشی سے دریچے کے باہر مولسری کے درخت کو دیکھتا رہا۔

پھر زناٹے سے ایک موٹر سائیکل باہر آکر رکی اور کرن اندر آیا۔
"ہلو کرن" گنتی نے کاغذوں پر سے سر اٹھائے بغیر کہا۔
"ہلو کرن" ڈائمنڈ پردوں پر زور سے انگلیاں مار کر بولی
"ہلو کرن" رخشندہ نے بیحد مری ہوئی آواز میں کہا۔
"پی جو کیوں نہیں آیا؟ کورس ہوا۔ پھر سب چپ ہو گئے
کرن چند لمحوں تک بغیر جواب دیئے ہونٹوں سے اپنا نارنجی پائپ لٹکائے کھڑا رہا۔
"ثابت ہوا کہ تم لوگ ایک ہفتے تک جنگلوں کی ہوا کھانے کھاتے بالکل جنگلی بلیاں بن گئی ہو۔ روشی کیا تم ان بزرگوار کو نہیں جانتیں" اس نے پوچھا
"ہُم۔ اوفیشیل طور پر تو نہیں" رخشندہ نے جواب دیا
"ملو بھئی میجر سلیم۔ کروا ہا راج کی رخشندہ بیگم"
"آداب عرض"
"تسلیمات"
"ارے ہائے" ڈائمنڈ دفعتہً چلائی۔
"ارے بھئی واہ" گنتی نے کاغذ ایک طرف کو پھینک دیئے اور موقع کی سخت ڈرامائی اہمیت پوری طرح تب اس کی سمجھ میں آسکی۔ جان اسٹین بک اور ہاتھم اپنی جان بچا کر سرپٹ نکل بھاگے۔
"ارے وہ ــــ روشی وہ اسٹیشن والا اسٹو پڈ ڈیسٹرکٹ کمیشنر" ڈائمنڈ نے آنکھیں پوری طرح کھول کر کہا۔

"بھئی واللہ کیا چیز ہوئی ہے۔ بیٹھو کرن۔ تشریف رکھئے آپ بھی"۔ رخشندہ نے اس کی طرف مڑ کر کہا۔ اس کی شگفتگی پھر واپس آ گئی۔ "واللہ کمال ہو گیا"۔ وہ بولی۔

کرن دریچے میں جا بیٹھا۔ غریب کو شوک پہنچ رہا ہو گا سلیم یہ میڈ ہیٹرز پارٹی میں تمہارا پہلا دن ہے۔ رفتہ رفتہ عادی ہو جاؤ گے"۔

"ارے آپ کل صبح مانا ٹھیر کے اسٹیشن پر کیا کر رہے تھے بھائی"۔ رخشندہ نے پوچھا۔

"جھک مارتے تھے"۔ کرن نے جواب دیا

"کس سلسلے میں؟"

"تم تینوں بہن بھائی انتنے خبطی ہو۔ بھائی صاحبان تمہارے تم سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ اس نے پی چو کو اطلاع دی تھی کہ اس کا تبادلہ ایک دم پرتاپ گڑھ جیسے نفیس مقام کا ہو گیا ہے۔ وہ راستے میں تم سب سے ملتا جائے گا آپ کے بھائی صاحب بلند اقبال جانے کس چکر میں تھے کہ اسٹیشن پر پہنچے ہی نہیں اور اسے دوسری ٹرین سے لکھنؤ واپس آنا پڑا"۔

"چچ چچ۔ پی چو تو ہئی بے وقوف۔ آپ اگر مانا ٹھیر پہنچ گئے ہوتے تو ہم آپ کو مرغابیوں کے شکار کے لئے لے جاتے"۔ رخشندہ نے افسوس ظاہر کیا

"اور گنے کھلاتے آپ کو"۔ ڈائمنڈ نے کہا

"لیکن ہم تو خود ہی کل لکھنؤ آ رہے تھے"۔ گینی بولی

"تو جناب آپ کو اس سے پہلے آ جانا چاہئے تھا"۔ رخشندہ نے کہا۔

"مگر پی چو نے تو کبھی آپ کا ذکر ہی نہیں کیا" گنّی نے کہا

"اب بھی کوئی اہم بات ہوتی تو اس کا ذکر بھی کیا جاتا" ڈائمنڈ بولی

"جی نہیں اگر لوگ اہم ہوتے تو ان سے ذکر کیا جاتا۔ اب ہر چیز کی اطلاع آپ لوگوں کو دی جائے۔ یہ اچھی مصیبت ہے" کرن نے کہا۔

"ارے بھئی یہاں تو حکومت عامہ شروع ہو گئی۔ وہ شور قیامت اٹھا ہے کہ دفتر میں بیٹھے بیٹھے مجھے معلوم ہو گیا کہ ڈوک آ گیا" پی چو نے حسب معمول دریچے میں سے کودتے ہوئے کہا۔

"کون آ گیا؟" رخشندہ نے آنکھیں جھپکا کر پوچھا

"ارے ابھی تم لوگوں کو کرن نے ڈوک سے ملوایا یا نہیں بھئی یہ نہایت ہی تاریخی ہستی ہیں مولٰنا سلیم۔ ایک زمانہ تھا کہ خاکسار کے ساتھ الہ آباد میں بی۔ ایس۔ سی فرماتے تھے۔ اب سول سرجن بنا کر اس بدقسمت ملک کو نوازنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ ہم اولیاؤں کو پچھلے مہینے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ملٹری سے سول میں تبدیل ہو کر تشریف لا رہے ہیں گو آپ نے اطلاع اب آن کر دی۔ لہٰذا یہ فدوی بروقت اسٹیشن پر حاضر نہ ہو سکا" پی چو نے تعارفی تقریر ختم کر کے چاروں طرف دیکھا اور کہا "اب تالیاں بجاؤ۔ تالیاں بجیں۔

"ظاہر ہے کہ ہم سب کو سخت قلبی مسرت محسوس ہوئی آپ کو جان کر۔ اور امید کی جاتی ہے کہ آپ جلد ہی خود کو میڈ ہیٹرز میں شامل ہونے کا اہل ثابت کریں گے۔ کیونکہ معلوم ہوا ہے کہ آپ پی چو کے دوست ہیں اور کوئی سوبر آدمی پی چو کا دوست نہیں ہو سکتا" ڈائمنڈ نے پیانو کے اسٹول پر چڑھ کر بڑی سنجیدگی

سے ایک اور تقریر کی۔

"اچھا اب شریفوں کی طرح کرسیوں پر بیٹھا جائے یا اسی طرح کھڑکیوں میں لٹکتے ہوئے سارا سُوشل اپوئنٹ رہے گا۔" کرن نے کہا۔ لفظ "شُوشل" ان سب کی زبان میں ایک خاص تاریخی اہمیت رکھتا تھا۔ ایک روز کنور رانی آل انڈیا ویمینز کانفرنس کے موقعے پر اپنی ایک دوست کو کچھ کمیونزم اور سوشلزم وغیرہ کے متعلق سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں "اے بہنی ابھی تو شُوشلسٹن کا کہنا ہے کہ شُوشلزم ــــ" پی چو صرف اتنا فقرہ سُن پایا تھا اور اس روز سے یہ لفظ بڑے مزے سے استعمال کیا جاتا تھا۔

"بھئی تم سب لوگ ٹھیک سے بیٹھ جاؤ تو ہم چاء منگوائیں"۔ رخشندہ گیلری کی طرف چلی گئی۔ اس دوران میں وہ خاموشی سے کھڑا سگریٹ کا دھواں اڑاتا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح بے تعلق۔ بے پرواہ۔ مغرور۔ اس کی کالی خوبصورت آنکھوں میں وہی اکتاہٹ جھلک رہی تھی۔ جیسے وہ زندگی سے تھک ہار کر کسی نئی بات کسی خاص واقعے کا منتظر ہو اور وہ کبھی نہ ہو چکے۔ کبھی نہیں۔

رخشندہ کے ساتھ گنی اور ڈائمنڈ بھی اٹھ کر اندر چلی گئیں اور جب چاء آئی اس وقت تک پی چو، کرن اور سلیم بڑی تندہی سے اپنی دلچسپی کی باتوں میں مشغول ہو چکے تھے۔

چاء پر لڑکیاں بہت صبر کے ساتھ ان کی انڈین پولیس اور نبادلوں اور مقابلے کے امتحانوں کی غیر دلچسپ باتیں سنتی رہیں۔

"اب تم آدمی لوگ کرکٹ اور شیر کے شکار اور گھوڑوں کا تذکرہ شروع

کر دو گے"۔ رخشندہ نے بے حد اکتا کر کہا۔

"اچھا نہیں۔ کہو بھئی سلیم تم نے یہ ٹائی کہاں سے خریدی۔ او گوش کتنا سوٹ رنگ ہے۔ اس کا ــــ ارے پی چو ڈارلنگ بالکل ایسا ہی سوٹ کا کپڑا۔ کل میں نے لیلا رام کے ہاں دیکھا اور سنا تم نے کرن پیارے۔ میں نے اپنی سفید سینڈل جو چائنا مین کی دکان سے بنوائی تو کیا ہوا کہ ــــ"

"اچھا چپ رہئے جناب"۔ چائے ختم کرنے کے بعد لڑکیاں خفا ہو کر چلی گئیں

"ارے ٹھہرو۔ کہاں جاتی ہو تم لوگ"۔ پی چو چلّایا

"ہم "لالہ رخ" جا رہے ہیں اور پی چو میں تمہاری موٹر لئے جاتی ہوں۔ اب ٹاپتے رہو بیٹھے"۔ رخشندہ نے برساتی میں سے آواز دی۔

"ارے رکو تو سہی۔ ہم بھی "لالہ رخ" چلتے ہیں"۔ پی چو اور کرن اپنے نئے مہمان کو لے کر برآمدے میں آ گئے۔

"آپا کہو بعد میں۔ حفیظ نہیں ہے آج کل"۔ رخشندہ نے اجنبی کار کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کرسٹابل تو ہوگی"۔ پی چو بولا۔

"ہوا کرے۔ لڑکیوں میں بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں جناب کو۔ ہاں بھئی اور کیا۔ ہم تو کریں گے ہی ساریوں اور جوتوں کی باتیں۔ پھر تم سے کیا"۔ رخشندہ نے جواب دیا۔

"اور پھر بھائی صاحب قبلہ ہم جائیں گے "وکڈ لیڈی" دیکھنے۔ بہترین برٹش پروڈکشن ہے"۔ ڈائمنڈ نے کہا۔

"کیا لڑکیاں ہوتی ہیں۔ مری جا رہی ہیں سب کی سب جیمیں ملیّبن پر اکٹھی
کی بھیڑ چال ہوتی ہے۔" پی چو بولا۔

"سب کا ٹریڈ یونین انٹرسٹ ہوتا ہے بھائی"۔ کرن نے بڑے مف
انداز سے کہا۔

"اچھا تو آپ کیوں مرتے ہیں انگرڈ برگمین پر۔ لا لیجئے جناب پی چو صاحب
پچھلے اتوار کو آپ کے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے تو میں لے گئی تھی آپ
"بیلز آف سینٹ میری" دکھانے۔ نکالئے اس کے روپے واپس"۔ رخشن
نے پی چو کا کوٹ کھینچتے ہوئے کہا۔

"الامان والحفیظ۔ جانے غفران منزل سلامت کیسے بچی ہے ان دھاچ
کے باوجود"۔ کرن نے کہا۔

"ہم شہید مرد جو رہتے ہیں اس میں۔ ورنہ میاں کب کا تختہ الٹ گیا ہو
ساری دنیا کا۔ تم ایک غفران منزل لئے پھرتے ہو"۔ پی چو نے جواب دیا۔

"اور کیا، شہید مرد۔ جن بھوت یہ سب تم ہی لوگ تو ہو"۔ رخشندہ خوش ہو

"اور آپ لوگ؟ یہ ایک بھٹ کٹیّا پر کی۔ ایک برگد پر کی۔ ایک پیپل پر کی
دیکھو تتلیوں بھری دوپہریا میں کیسی گھومنے نکل آئی ہیں۔ اب یہ ٹلیں گی تھوڑا ا
جب تک پاؤ بھر مرچوں کی دھونی نہ دی جائے"۔ پی چو نے کہا

"قسم سے ہم مار دیں گے پی چو"۔ رخشندہ عاجز آ کر چلائی

وہ سب کار کے قریب پہنچ گئے۔ پی چو انجن کھول کر دیکھنے لگا۔ کرن رخشن
سے الجھتا رہا۔

"تو گویا یہ یوں ہے۔" برساتی کے قریب چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد سلیم نے سگریٹ کیاری میں پھینک دیا اور اس مجمع سے جا ملا۔

وہ سب کرسٹابل کے ہاں پہنچے۔ دوستوں کی پلٹن آتی دیکھ کر وہ اچھل پڑی "ارے میرے پیارے بچو۔" وہ چلائی۔ برآمدے میں آکر سب اپنی اپنی پسندیدہ جگہوں پر بیٹھ گئے۔ پی چُو حسب معمول دریچے میں جا لٹکا۔

"چاء منگاؤں؟" کرسٹابل نے رخشندہ کے پاس فرش پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"چاء بعد میں منگوانا پہلے یہ غور فرماؤ کہ کس قدر خاص الخاص ذاتِ شریف ہمارے ساتھ تشریف لائے ہیں۔" پی چُو نے کہا۔

"اوفوہ بھئی ایک ہفتے سے کرن اور حفیظ آپ کا اتنا ذکر کر رہے تھے کہ مصیبت آگئی تھی۔" کرسٹابل نے سلیم سے کہا۔

"ارے رے رے روشی تم کیوں تھوتھنی پھلائے بیٹھی ہو۔" پی چُو نے دفعتاً پوچھا۔

"بھئی کرسٹابل پی چُو دوپہر سے لڑے جا رہا ہے۔" رخشندہ نے شکایتاً کہا "ارے تو تم کیوں چلی جاتی ہو۔ ہمارا ایک نیا دوست آگیا ہے۔ اب ہم تمہیں لفٹ ہی نہیں دیا کریں گے۔ ہم تو بھئی جا رہے ہیں جیمس میسن کی فلم سیکنڈ شو۔ کیوں سلیم ڈارلنگ چلو گے؟" پی چو نے بالکل لڑکیوں کے لہجے کی نقل کی۔

"اچھا پی چو۔ چپ تو۔ آپ یہاں کب تک رہئے گا؟" کرسٹابل نے سلیم سے پوچھا

"فی الحال تو اسے جوائننگ ٹائم ملا ہے۔ ممکن ہے یہیں تقرر ہو جائے۔"

کرن نے کہا۔

"اور کیا لکھنو جو ایک بار آجائے۔ اس کا یہاں سے جانے کو کب جی

ہے۔" ڈائمنڈ بولی۔

"آپ لکھنؤ پہلے بھی کبھی آچکے ہیں؟" کرسٹابل نے پوچھا

"ارے اس نے پڑھا ہی کنگ جارجز میں ہے۔" کرن نے جواب دیا

"اچھا آپ بھی لکھنؤ کے پڑھے ہوئے ہیں"۔ رخشندہ بولی

"اور کیا سب شریف آدمی لکھنؤ کے پڑھے ہوتے ہیں"۔ پی چو نے کہا

"پی چو تم سے قطعی کوئی بات نہیں کر رہا ہے"۔ رخشندہ نے بگڑ کر کہا

لیکن ہو یہ ہی رہا تھا جتنے سوالات کرسٹابل سلیم سے کر رہی تھی۔

کے جواب بات ختم ہونے سے پہلے ہی جلدی سے کرن یا پی چو دے دیتے

تھے اور سلیم اسی طرح چپ چاپ بیٹھا تھا

"اگر سب لوگ اس قدر ہڑبڑا کر اتنا ان کا نوٹس نہ لیں تو ان صاحب بہا

کا دماغ اتنا خراب نہ ہو"۔ لالہ رخ سے واپسی میں سلیم کو کارلٹن ہوٹل اتار کر

جب وہ سب گنّی اور ڈائمنڈ کو پہنچانے جاپلنگ روڈ جارہے تھے۔ اس وقت

گنّی نے چپکے سے رخشندہ سے کہا۔

یہ وہی تھی۔ یہ وہی تھی۔ یہ وہی تھی۔ جس کے امرتا شیر گل کے سے سیدھے

سیاہ بال تھے۔ جس کا میڈونا کا سا ہسپانوی یا ارمنی چہرہ تھا جسے دیکھ کر جی

گھبراتا تھا اور لگتا تھا کہیں آگ بھڑک اٹھی ہے یا کہیں سارنا تھ کے اندھیرے

مندر میں تیز سُرخ، روشن، جاندار، مخملیں گلاب جگمگا رہے ہیں۔ اس کے ہونٹ ہمیشہ ہی اتنے سُرخ رہتے تھے۔ وہ جو ایک دوسری، الف لیلوی، پرانی دنیا کی محرابوں میں سے نکل کر دفعتہً زندگی میں، اس کے سامنے، وہاں آگئی تھی۔ اس الف لیلوی دنیا میں سے جس کی داستانیں گومتی کے کنارے جامنوں کے سائے میں بندھی ہوئی کشتیوں میں بیٹھے بوڑھے ملاح اب بھی اجنبی مسافروں کو سناتے ہیں۔ وہ تو اسے جانتا تھا۔ اسے ہمیشہ سے معلوم تھا۔ زندگی کے کاروانوں کے ساتھ گھومتے ہوئے وہ کبھی نہ کبھی اسے دوبارہ ملے گا۔ کہیں نہ کہیں ضرور اسے دیکھ پائے گا۔ وہ جو بہت اخلاق سے اس سے کہتی تھی۔ اگر آپ کچھ عرصہ پہلے آئے ہوتے تو دیوے شریف کے میلے میں ہمارے ساتھ چلتے۔ پھر ہم آپ کو اپنے جنگلوں میں مرغابیوں کا شکار کھلاتے۔ میاں رودولی سے آجائیں تو کرسمس میں ہم سب پھر شکار کے لئے نیپال گنج کے جنگلوں میں چلیں گے۔ بہرائچ سے آگے۔ وہاں سے نیپال کی سرحد شروع ہوتی ہے اور وہاں ڈھیروں شکار ملتا ہے۔ وہ جو چیتے کی کھال بچھی ہے۔ وُہ پچھلے سال پولو نے مارا تھا اور یہ بارہ سنگھا میں نے۔ لیکن میرا نشانہ تو بہت ہی خراب ہے۔ یہ پرسکون آنکھوں والی میڈونا شیر کے شکار کی باتیں کرتی تھی محض اس لئے کہ اس کے خیال میں یہ اس کے مہمان کی دلچسپی کی باتیں تھیں۔ وہ ایک مکمل میزبان تھی۔ اس کی یہ پرسکون آنکھیں جو اس طرح جھپکتی تھیں جیسے اس دیوانی دُنیا کو دیکھ دیکھ کر حیرت زدہ اور پریشان ہوتی رہتی ہوں۔ یہ آنکھیں جن کی گہرائیاں کہتی تھیں۔ ہم تو کائنات ہستی کے ان سارے رازوں کو جانتے ہیں جو خدائے قدوس

کے فرشتوں سے بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ہم نہیں بھی جانتے ہیں۔ ہمارے سا
اتنا بنا مت کرو۔ تم جو کیپری کے جزیرے کے لا ابالے سیلانی ہو۔ اس کی
کے جزیرے کے خواہش، جس کی یاد سبھی کے دل میں ہوتی ہے۔ بہت
اس تک پہنچ جاتے ہیں۔ بہت سے اس کے چاروں طرف لہریں مار
ہوئے انتھاہ سمندر کی اونچی موجوں سے ٹکراتے رہتے ہیں اور کبھی اس تک
نہیں پہنچ پاتے۔

وہ بہت دنیا گھوم کر وہاں پہنچا تھا اور اسے پھر وہاں سے آگے، جانے
کہاں جانا تھا۔ یہ کرسمس کی شام تھی اور وہ دلکشا کلب کی لاؤنج میں بیٹھا تھا
وقت شانتی نکیتن کا او شیر تھری روح کی تلاش میں نہ معلوم کہاں مارا پھر رہا
امر ناتھ اور ہر دوار کی کن گپھاؤں میں شانتی اور مکتی کھوجتا ہو گا۔ اس کی جا
کتنی تصویریں مکمل اور کتنی ادھوری پڑی ہوں گی۔ یہاں پر تورنکین کے ہاں
سلے ہوئے دھاری دار سوٹ اور چھینٹے چلاتے رنگوں کے اسکارف وا
چودھری شمیم لاؤنج کے وسط میں بے معنی باتیں کر رہے تھے اور شعر پڑھے
جاتے تھے۔

"قیامت آئے وہ آئیں یا انقلاب آئے"۔ انہوں نے بے حد اسٹائ
سے ایک مصرع پڑھ کر گیلری کی طرف دیکھا۔

وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اند
آ رہی تھی۔

"یار یقیناً تمہیں کوئی لونڈیا جلٹ کر چکی ہے۔ ورنہ اس بے نیازی کا مطل

چودھری شمیم نے دفعتاً اسے مخاطب کیا

"کیا آپ رخشندہ بیگم کو جانتے ہیں؟"

"اجی میں رخشندہ بیگم کیا ان کے باپ تلک کی سات پشتوں سے واقف ہوں۔ بڑی ماسٹر پیس لونڈیا ہے لیکن حد سے زیادہ مغرور۔ فیض آباد والے کنور عرفان علی کی لڑکی ہے۔ کیا چیز ہے، کیا چیز ہے، کیا چیز ہے واللہ" انہوں نے زیادہ تصریح سے کام لیا۔

وہ بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا — یہ بیکار، بے مصرف امیرزادے جو اسی طرح کلبوں میں سگار کے دھوئیں اڑاتے اور کوک ٹیل کے گلاس خالی کرتے کرتے سوسائٹی کے اسکنڈلز پر زندہ رہتے ہوئے اپنی عمریں بتاتے ہیں وہ ان کی اس دنیا سے اتنا عاجز تھا۔

اور وہ اسی دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی جگمگاتے ہوئے مجمع میں شامل تھی جو وہاں موجود تھا۔ یہ سب لوگ — امبر پور راج کا انورِ اعظم اور سارنگ پور کی کرسٹابل اور حفیظ احمد اور کرشن نرائن کول آئی۔ سی۔ ایس کا خاندان اور ریاست بجوا اور پرتاپ گڈھ کے مہاراج کمار۔

کرسمس کی وجہ سے دلکشا کلب کی رونق اور چہل پہل روزمرہ سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔ ہال کی چھت میں رنگ برنگے کاغذی ربن، جاپانی قندیلیں اور رنگین غبارے جھول رہے تھے۔ ہال، لاؤنج اور سارے کمرے بھرے ہوئے تھے سلیم کو غفران منزل کے شگفتہ اور بشاش سٹ سے ملتے ہوئے مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہونے آیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز کلب، غفران منزل یا لالہ رخ میں

ان سب سے ملنا ہو جاتا تھا۔ آج رات بھی اسے پی چو اور پولو نے کرسمس ڈنر کلب میں مدعو کیا تھا۔ اس نے سوچا۔ کسی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ عفران منزل جہاں جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ آفتاب کی حیات زا کرنیں بکھیرتے جاتے ہیں
وہ لاؤنج میں سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ چودھری شمیم کے قہقہے دیر تک اس کے کانوں میں گونجا کئے۔ اسے اپنے چند اور دوست نظر آ گئے اور وہ ان کے بار کی طرف چلا گیا۔

اس کی زندگی تو ایک پہاڑی دریا کی طرح تھی جو پتھروں پر سے گذرتا آبشاروں میں گرتا تھوڑی دور جا کر کچھ فاصلے کے لئے سبک خرام ندی میں تبدیل ہو جاتا اور پھر، آگے بڑھ کر، ایک نئی وادی میں پہنچ کر پھر تند رود دھارا بن جاتا جس کو بالکل پتہ نہیں کہ آگے جا کر کیا ہو گا۔ وہ عموماً خاموش رہتا اپنی دلکش خاموشی، اپنی دلچسپ گفتگو اور اپنی کالی آنکھوں سے بڑے بڑے جادو جگاتا۔ بڑی بڑی قیامتیں اٹھاتا اور خود مزے سے ایک کونے میں پائپ پیتے ہوئے محظوظ ہوتا رہتا۔ وہ گیلنٹ بالکل نہیں تھا۔ وہ خواتین سے بالکل بے پرواہی سے کار کا دروازہ کھول دیتا۔ خود الگ ایک طرف کو کھڑا ہو جاتا۔ کلوک روم سے نکلتی ہوئی بیگمات کو وہ اس بھکیری اور بے تعلقی سے اوور کوٹ پہننے میں مدد دیتا۔ گویا ان پر بڑا احسان کر رہا ہے۔ وہ شولڈر لیڈیز مین کسی حالت میں بھی نہ بن سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت مہذب بے حد پولشڈ اور سوسائٹی میں بے انتہا ہر دلعزیز تھا اور اپنی ان فقیہہ بولیوں پر چپکے سے مسکرا لیا کرتا تھا۔ اسے اپنا حسن، اپنا غرور، اپنی شہرت پسند

ان سب چیزوں سے زندگی بڑی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ اس کا دن دفتر میں
سہ پہریں دوستوں کے ہاں، اور شامیں کلب میں بسر ہوتی تھیں۔ اس کے عموماً
تین فون نمبر رہتے تھے۔ ایک دفتر کا۔ ایک گھر کا۔ ایک کلب کا۔ گھر کا فون عام
طور پر "ڈیڈ" رہتا تھا۔

"ہلو نوکس"۔ وہ کریکرز اور کاغذی ٹوپیاں تقسیم کرتی اس کی طرف آگئی۔ اسے
دیکھ کر سب اٹھ کھڑے ہوئے، ایک دوسری غیر ملکی قوم کا تہوار تھا۔ لیکن اس
قدر زور شور سے اس کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ جیسے دلکشا کلب کے یہ
سارے ہندوستانی ممبر ابھی ابھی خود سینٹ جوزف کے عبادت خانے سے
ماس میں شرکت کر کے آ رہے ہیں۔

انہوں نے رات گئے تک کھیل کھیلے۔ ڈنر کھایا۔ گانے گائے۔ ناچ
ناچے۔ وہ اس روز دیر تک اس کی پارٹنر رہی۔

"اوہ۔ اوہ خوبصورت عورت"۔ اس نے دل میں کہا۔ وہ اس کے ساتھ
ناچتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ تھک گئے۔ ہال میں گرمی بڑھ گئی۔ وہ تیزی سے
والز کرتے کرتے باہر چبوترے پر آ گئے۔ ہال کی روشنی اور شور کے مقابلے میں
یہ جگہ بالکل ایک دوسری دنیا معلوم ہو رہی تھی اور وہ خود ایک دوسری ہستی
اس ہستی سے بالکل مختلف جو ابھی کچھ دیر پہلے کریکرز کھینچ کھینچ کر خوب شور
مچا رہی تھی۔ یہ شاید فضا کا اثر تھا۔ فضا اور ماحول سے متاثر ہو کر بعض مرتبہ
عجیب عجیب خیالات دماغ میں آتے ہیں۔ انسان بالکل اسی ماحول کا ایک
جزو بن کر رہ جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ ابھی کچھ دیر اور اس کا طلسم نہ ٹوٹے۔

وہ اسی طرح چپ چاپ چبوترے پر تیرتے رہے۔ وہ ایک دفعہ پہلے
ایک ایسی ہی الف لیلوی فضا میں اسی خاموشی سے ایک دوسرے کے
کے ساتھی رہ چکے تھے اور اس رات کی یاد بڑی تکلیف دہ بڑی مخل کرنے د
ثابت ہوئی تھی عجیب بات تھی کہ ان دونوں کے دل میں اس وقت اسی کا
آیا اور انھوں نے ایک دوسرے کو بتائے بغیر جی میں طے کر لیا کہ اب وہ کبھی
ایک دوسرے کے ساتھ نہ ناچیں گے۔ کبھی ایک دوسرے کے اتنے قریب آ
وہ والز کے تیز تیز قدم رکھتے ہال میں واپس آ گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی
بہت سے جوڑے بال روم میں سے نکل کر برآمدے اور چبوترے پر نک
گئے۔ کچھ منچلے باہر لان پر جا کر وکٹورین والز کے تیز چکروں میں گھومنے
مشغول ہو گئے۔

ناچ کے ساز چیختے رہے۔ خود موسیقی کا طاقتور شیطان ان سازوں کو
زور سے ایک دوسرے سے ٹکرا رہا تھا۔ رقصاں جوڑے زناٹے کے سا
گھوم رہے تھے، دنیا گھوم رہی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے جل رہے تھے۔ دیوا
دیوانی موسیقی تھی اور گہرے رنگوں اور خوشبوؤں کا طوفان، روشنی، گرمی۔ خون
دباؤ، جسموں کی باہم کشش سے پیدا کی ہوئی مہک اور حدت۔

جشن رات بھر جاری رہا۔

ایک بجے کے بعد وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ گھر واپس چلی گئی۔ کردا
کی کنور رانی کی اجازت نہیں تھی کہ ان کے بچے رات گئے تک گھر سے باہر
اسے بھی نیند آنے لگی۔ وہ اٹھنے کا ارادہ کر رہے ہی والا تھا کہ کوک ٹیل

پچیسواں دور شروع ہوا اور ہری ہرپال آئی سی ایس کی خوبصورت پینتیس سالہ بیوی چندرا نے اسے روک لیا۔

وہ باہر باغ میں اتر گئے۔ حالانکہ دسمبر کا مہینہ تھا اور سردی کافی پڑ رہی تھی۔ صبح ہوتے خواتین نے کلب سے نکلنا شروع کیا۔ بھاری اوورکوٹوں، کندن کے گہنوں، اطلسی غراروں اور جھلملاتی ساریوں میں سرسراتی ہوئی خواتین جن کے شوہر یا بھائی یا دوست ان کے اوورکوٹ لئے کلوک روم اور برآمدوں میں ان کے منتظر تھے اور جن کے شوفر سردی کی وجہ سے موٹروں کے شیشے چڑھائے پچھلی سیٹوں پر سکڑ کر سو رہے تھے۔ یہ شاندار عورتیں جن کے دماغ خالی تھے۔ روحیں کھوکھلی تھیں۔ دل بلا کسی مصرف کے یونہی عادتاً دھڑکتے تھے۔ صرف ان کے ہونٹوں پر میکس فیکٹر اور رڈون جوان کے رنگ تھے اور غراروں اور ساریوں پر زردوزی کے پھول جگمگاتے تھے۔ صبح کی ہلکی روشنی میں کلب کے قمقمے دھندلے پڑ گئے تھے اور فضا میں خوشبوؤں، اور تمباکو کے دھوئیں کی تھکی ہوئی مہک اڑ رہی تھی۔

اور چندرا ہری ہرپال جب کلوک روم میں سے باہر نکل رہی تھی تو صبح کی اولیں ساعتوں کے دھندلکے میں سلیم نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے تھے اور اس کا میک اپ پھیکا پڑ چکا تھا اور وہ بہت عمر رسیدہ نظر آ رہی تھی

اسے بڑی عجیب سی تکلیف محسوس ہوئی۔ کیا عورت محض یہی ہوتی ہے محض یہی۔ یہ سب خوبصورت، شاندار، بڑھیا عورتیں۔ دفعتہ اسے وہ بھورے بالوں والی معمولی اینگلو انڈین کیبرے ناچنے والی لڑکی یاد آئی۔ وہ اس نواب زادی اصغر

امام اور مسز چندرا ہری ہرپال اور راجکماری کمل گڈھ کے جگمگاتے ہجو
سے یقیناً بہت بہتر تھی۔ اس میں اخلاقی جرأت تھی۔ وہ ہمدردی اور خ
اہل ہو سکتی تھی۔ وہ صبح کے دھندلکے میں اتنی کھسیانی، اتنی پھیکی اور غر
نظر نہ آتی تھی۔

یکلخت شدت سے اس کا جی چاہا کہ وہ اس راجکماریوں کی دنیا
بھاگ کر کہیں اور پناہ لے۔

اور کہر آلود مال پر پہنچ کر اس نے کار کا رخ آئیوی کورٹ کی طر
جانے والی بیر و روڈ کی سمت کر دیا۔ جہاں کو ئین روز رہتی تھی۔

خیالات، عجیب و غریب غیر منطقی خیالات، وہ آوارہ گرد خانہ بدوش جو د
پچھلے دروازے پر چپکے سے دستک دے کر سکون دل میں نہایت گستاخی
مخل ہو کر پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی عجیب و غریب، شریر، چور اچکا
خیال اس کے میڈونا ایسے خوبصورت سر میں رات کے پچھلے پہر آ گھس
وہ کرسمس کے جشن سے تھکی ہاری واپس آ کر لباس تبدیل کرتے ہو
کے مارے سوں سوں کرتی جاتی تھی اور چاہتی تھی کہ گل شبّو کو جگا کر کمر
انگیٹھی منگوائے۔ ہش۔ اس نے سر ہلا کر جی میں کہا۔ لاحول ولا۔ چ چ
یعنی بھئی انتہا ہوتی ہے ۔ کمال ہے۔ تو چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ یہ شخص
آنکھوں والا مغرور سلیم۔ ایک بہت ہی ڈسٹرب کرنے والی شخصیت کا مالک
ارے ہائے۔ حد ہو گئی بھئی لیکن یہ حقیقت تھی اور حقیقت سے جان بچانی بہ

بہت مشکل ہے۔

کسی نئی پریشان کن کشش کا احساس موسم بہار کی آمد کی طرح بالکل دفعتہً اور آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ سامنے دیوار پر کیلنڈر دیکھ کر ایک نیا خیال شروع نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے ہم خود ہی ایک صبح جاگ کر دریچے سے باہر دیکھتے ہیں کہ دنیا میں یکلخت بڑی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ درختوں کے پتے نکھر رہے ہیں ہرے پودے گھاس پر جھک کر لہلہا رہے ہیں۔ گھٹائیں چھانے لگی ہیں اور ہوا میں موسیقی کی لرز گونج اٹھتی ہے۔ اور ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ برکھا اور پھولوں کا موسم بالآخر آن پہنچا اور پھر یوں ہوتا ہے کہ زکام کی چھینکوں کی طرح اس نئی کشش کا احساس بھی چھپایا نہیں جا سکتا۔ کتنی ہنسی کی بات تھی۔ لیکن بہر حال تھی۔ یہ تو بالکل غلط ہے۔ سردی کے مارے ناک کو لحاف میں چھپا کر اس نے طے کیا۔ وہ قطعی اس کی قائل نہ تھی۔ گیتی اور کرن جیسے دیوانوں کے اس فلسفے کی۔ شاید اوسکر وائیلڈ تھا جس نے طنزیہ کہا تھا کہ زندگی کی انجیل کا پہلا باب، ایک عورت اور ایک باغ سے شروع ہوتا ہے اور انکشافات کے باب پر آن کر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔" چنانچہ میں پہلے ہی روز اتنی لٹریری بھی بن گئی یعنی چھوٹتے ہی اوسکر وائیلڈ یاد آیا۔ اب غالباً شیلے اور براؤننگ کا حوالہ دیا کروں گی۔ اُفوہ" لیکن وہ ایک نارمل اور صحت مند قسم کی لڑکی تھی اور ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو خواہ مخواہ بنتی ہیں۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ سب ٹھیک ہے۔ گولی مارو۔ مٹاؤ اس قصے کو۔ اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے اور یہ فیصلہ کر کے وہ سو گئی۔ کیونکہ اس کی ناک کی نوک، بالکل سرد ہو چکی تھی اور سلیم کے خیال کے مقابلے میں سبز اطلسی

لحاف فی الحال کہیں زیادہ آرام دہ تھا۔

ہینس اینڈرسن نے کہا تھا کہ ہر انسان کی زندگی پریوں کی ایک کہا
جو خداوند خدا نے خود لکھی ہے۔ وہ ایک تخیل پرست رومانی تھا جس نے
اور سنڈریلا کی ایک علیحدہ دُنیا تخلیق کی تھی جو صرف بچوں کو مطمئن کر سکتی تھی
شاید پتہ نہیں تھا کہ ایک لاپرواہ خدا کی بنائی ہوئی اس بدصورت دُنیا میں
دکھ ہیں۔ بڑی تکلیفیں ہیں اور ان چھوٹے چھوٹے دکھی انسانوں کی زندگیاں
کی کہانیاں کسی حالت میں نہیں ہو سکتیں۔

پھر بھی یہ لڑکی، یہ کالی آنکھوں والی اسنو وآیٹ جو کرسمس کے جشن میں خو
شور مچانے، کئی گھنٹے ناچنے اور کریکرز کھینچنے کے بعد اب اطلس کے لحاف
ناک چھپائے سو رہی تھی ہینس اینڈرسن کی دنیا کی ان ہری وادیوں میں مزے
اپنا جیون تیاگے جا رہی تھی۔ جہاں پھول کھلتے تھے اور برکھا کی ٹھنڈی پھوار
برستی تھیں۔ اب تک وہ اور اُس کے ساتھی خداوند عالم کے کچھ بہت ہی خاص
بندے معلوم ہوتے تھے۔ خدا ان کے کاروبار میں یقیناً ناک نہ ڈبوتا تھا۔ ان
کرداروں پر ان کی طبیعتوں اور ماحول کا اثر بہت گہرا تھا۔ وہ پُرانی روائتوں
پس منظر میں غفران منزل کی قدیم محرابوں کے نیچے پروان چڑھے تھے۔ انہیں ہمیں
اس کا خیال رہتا تھا۔ یہ کرنا چاہیئے۔ یہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یوں ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں
ہونا چاہیئے۔ سب بالکل ٹھیک حساب کتاب تھا۔ وہ ہمیشہ بہت خوش رہتے

اس نے سوتے میں کروٹ بدلی۔ دسمبر کی اس برفانی رات جبکہ باہر خنک
ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہ اپنے خوبصورت کمرے میں محفوظ اور مطمئن اچھی ا

چیزوں کے خواب دیکھ رہی تھی۔ ان پرانی کرسمس کے جشن کی راتوں کے خواب جو اُس نے اسکول اور کالج میں بسر کی تھیں۔ ان پرانے گیتوں کے سپنے جو اس نے کالج کے یوکلپٹس گروو میں الاؤ کے گرد ناچتے ہوئے گائے تھے۔

سڑک کے اس پار سینٹ جوزف کے عبادت خانے میں آدھی رات کے ماس کے گھنٹے بجنے لگے۔ کہیں دور رات کے سناٹے میں کیرل گانے والوں کی ٹولیوں نے اپنے نغمے شروع کر دیئے۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ خواب میں وہ دیکھ رہی تھی کہ بہت تیز روشنی ہو رہی ہے اور اچھے اچھے لوگ بہت بڑھیا گانے گا رہے ہیں اور خوب مزا آ رہا ہے اور اُس کی آنکھ کھلی تو اسے کیرل گانے والوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ چپ چاپ پڑی سنتی رہی "خاموش رات، مقدس رات، مقدس ماں اور اس کا بچہ" اور "سنو سنو پیغامبر فرشتے گاتے ہیں"۔ اس کے دماغ میں بہت سے خیالات امڈ آئے۔ بہت پرانی یادیں۔ اور اس وقت وہ سلیم کو بالکل بھول چکی تھی۔ جس کا خیال تھوڑی دیر پہلے اسے اتنا تنگ کر رہا تھا۔ مقدس موسیقی اور کیرل کی آوازیں سنتے سنتے یادوں کے ریلے میں بہہ کر وہ ان لمحات سے بہت دور بہت پیچھے پہنچ گئی۔ وہ کتنا اچھا زمانہ تھا۔ کتنی پیاری دنیا تھی جو بہت دور رہ گئی تھی۔

وہ زمانہ جب وہ اسکول کے پیٹرن سینٹ کے تہوار یا دوسرے چھٹی کے موقعوں پر کشتیوں میں بیٹھ کر ندی کے کنارے کنارے ہرے جنگلوں کے وسط میں پہنچ جاتے۔ جہاں جنگل کی خنک، نم زمین پر خود رو پودوں کے درمیان لکڑیاں جمع کر کے الاؤ جلتا۔ لڑکے ایک طرف اپنی ٹولیاں بنا کر بیٹھ جاتے۔ لڑکیاں خشک ٹہنیاں چننے کے لئے

چلی جاتیں ۔ پرانے گیت گائے جانے ۔ الاؤ کے گرد گھومتے ہوئے سال بھر کی پرا
پرانی کاپیاں آگ میں پھینکی جاتیں ۔ ہر نئی چیز کے آگ میں گرتے ہی نئے شعلے بھڑک
اُٹھتے ۔ ان شعلوں کے چاروں طرف چکر لگاتے ہوئے ان کے چہرے تمتما
کھلی فضا اور ٹھنڈی ہواؤں میں سانس لیتے ہوئے نوجوان، بشاش، صحت
چہرے ۔ دور کشتی میں بیٹھی ہوئی کوئی لڑکی گانا شروع کر دیتی ۔ ' او مائی ڈارلنگ کلمنٹ
یا اولڈ فوکس ایٹ ہوم ' یا ' فیئر دی ویل مائی فیری فنے ' ۔۔۔ اور اس سکوت میں
چند لمحے خاموش رہنے کے بعد سب اس گیت میں شامل ہو جاتے ۔ رات کے
اندھیرے میں گیت کی لہریں بہت اونچی اٹھ جاتیں ۔ الاؤ کے شعلے لپکتے
جنگل کا سناٹا گہرا ہو جاتا ۔ دور پگڈنڈیوں پر سے گذرتے ہوئے راہی ایک
دوسرے سے سرگوشیوں میں کہتے ۔ آج بھگتن کے کالے اسکول کی بابا لوگ
چھٹی منانے آئی ہیں اور اس اندھیرے میں چند لمحوں کے لئے ایک نئی د
پیدا ہو جاتی ۔ مدھم چاندنی اور پرانے گیتوں اور الاؤ کے رقصاں شعلوں کی
دنیا ۔ بہت سے معصوم دل ایک ساتھ دھڑکتے ۔ بہت سی معصوم تمنائیں اُبھر
پیدا ہوتیں ۔ بڑے اچھے دن تھے وہ ۔

"انگریزی تعلیم بھائی جان ۔ صحیح تلفظ ۔ ڈنر ٹیبل کے قاعدے ۔ یہ سب سیکھنے
کے لئے تمہیں اپنے بچوں کو شروع ہی سے انگریزی اسکولوں میں بھیجنا چاہئے "
وہ تینوں بہن بھائی بہت چھوٹے چھوٹے تھے ۔ اس وقت کنور صاحب نے ول
سے واپس آنے کے بعد اپنے ایک مصاحب سے کہا تھا ۔

چنانچہ وہ نینی تال بھیج دیئے گئے تھے ۔ سینٹ جوزفز کالج بہت بڑا اد

تھا۔ اس کے راہب آئرش تھے۔ نیلی آنکھوں والے آئرش اور لڑکیوں کے اسکول کی راہبات کی آئرش آنکھیں بھی ہمیشہ مسکراتی تھیں۔ سینٹ جوزفس کالج میں کیسے کیسے لڑکے آتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی گمنام ہندوستانی ریاستوں کے پرنس جن کے ساتھ بریچز پہنے بڑے بڑے جودھپوری صلفے باندھے اتالیقوں اور نوکروں کی پلٹنیں ہوتیں۔ رانا شمشیر دل۔ پرنس مظفر خاں۔ صاحبزادہ شہاب الدین۔ پرنس مظفر۔ پرنس مظفر۔ اس کا خاندان کابل کی لڑائی کے بعد صدی کے شروع میں جلاوطن کر کے ہمالیہ کی ایک وادی میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ جہاں سابق امیر کابل اور ان کے رشتے دار دن بھر شطرنج کھیلتے اور خواتین چار دیواری کے اندر سگریٹ پیتے ہوئے زندگیاں بتاتی تھیں۔ اب ان میں آزادی آچلی تھی۔ سیاہ چادریں ترک کر کے انگریزی لباس میں سائیکلوں پر گھومتی ہوئی وہ اینگلو انڈین معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے لڑکوں نے انگریزی سرکار سے ملنے والے چھوٹے چھوٹے وظیفوں سے تنگ آکر فوج میں نوکریاں کر لی تھیں اور اسی فوج کی وردیاں پہن کر شان سے گھومتے تھے جس نے انہیں ان کے ملک سے نکالا تھا۔ وہ بہت شاندار لڑکا تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ وہ کالج کی ہر ٹیم کا کپتان اور بہت اچھا شہسوار تھا جب اپنے گھر والوں کے ساتھ فارسی بولتا ہوا۔ وہ وائلڈ فلاور ہال آتا تو رخشندہ پہ سخت رعب پڑتا تھا۔ وہ لڑکپن میں پی چو کی پہلی محبت تھا اور اس لئے وہ اس سے بے انتہا جلتی تھی۔ وہ پی چو کو خوب 'بُلی' کرتا اور پی چو اس کے سارے احکام نہایت فرمانبرداری سے بجا لاتا۔ وہ 'بڑا لڑکا' ہونے کی قابل رشک حیثیت کے سارے فائدوں سے واقف تھا۔ وہ ان سب لوگوں سے جلتی تھی جو پی چو کو پسند

کرتے تھے۔ پی چو صرف اس کی ہی ملکیت ہونی چاہئیے تھا۔ ایک روز وہ سب وا
فلاور ہال کے باغ میں "روبن ہڈ" کا کھیل کھیل رہے تھے۔ برآمدے میں پڑی ہو
ٹوٹی الماری میں چھپ کر وہ سب رابن ہڈ کی تاک میں بیٹھے تھے۔ یہ طے کیا گیا تھا
جب پہاڑی کے پیچھے سے پرنس مظفر اپنا بگل بجائے گا۔ تب میڈ میرین جلدی سے
الماری میں چھپ جائے گی۔ لیکن وہ الماری میں نہیں چھپی۔ کیونکہ اس میں چقندر کی
شکل والا اینگلو انڈین ڈیرک بھی گھسا بیٹھا تھا اور ڈیرک سے اس کو نفرت تھی
وہ گنی اور شمشیر کے ساتھ چٹان کے پیچھے چھپی رہی اور چٹان پر سے نیچے گھاس پر
کودتے ہوئے پرنس مظفر کا پیر رپٹ گیا اور وہ گر پڑا اور اسے یقیناً شدید چوٹ
آئی۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس گئی اور بے حد فکرمندی سے چلائی۔ مظفر جلدی
سے ممی کے پاس چلو وہ تمہارے پیر کی ڈریسنگ کر دیں گی۔ بھاگ جاؤ بیوقوف
لڑکی۔ اس نے درشتی سے کہا اور فوراً اٹھ کر کھیل کی بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گیا
جب شام پڑے وہ وائلڈ فلاور ہال سے واپس جا رہا تھا تو رخشندہ نے دیکھا
کہ وہ بے حد دلکش انداز سے لنگڑا رہا تھا۔ رخشندہ کے دل میں، حالانکہ وہ پی چو کی
وجہ سے اس سے جلتی تھی۔ اس کی عقیدت زیادہ ہو گئی۔ لیکن جب سترہ اٹھارہ
سال ہی کی عمر میں اس نے نینی تال کی اینگلو لڑکیوں کے ساتھ کشتی رانی شروع کی
تو رخشندہ کا یہ پہلا اپالو اپنے ستون پر سے گر کے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گیا۔ کیا
کمبخت محض یہی ہوتے ہیں۔ محض یہی۔ اس نے مایوسی کے شدید احساس کے
ایک مرتبہ سوچا تھا۔

بڑی عجیب بات تھی کہ آج اتنے برسوں بعد اسے رانا شمشیر اور پرنس مظفر

یہ سب پرانی باتیں ایک ایک کر کے یاد آ رہی تھیں۔ اب جبکہ وہ ایک نئی، زیادہ وسیع بہت مختلف دنیا میں پہنچ چکی تھی اور ــــ اور آج جبکہ اس نے اس شخص ــــ اس شخص کے ساتھ والز کیا تھا۔ جب وہ اسکول چھوڑ کر عفران منزل واپس آئی اور اس مختلف دنیا کی سوسائٹی میں آنے جانے لگی تو اسے یہ سوسائٹی بہت زیادہ بھائی تھی۔ چنانچہ یہی وہ زندگی ہے جس کے خواب دیکھتے دیکھتے لڑکیاں مری جاتی ہیں ـ ایسا لگتا تھا جیسے سب رنگ برنگے بھیس بدلے ایک فینسی ڈریس کے دیوانے سے ناچ میں تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ زندگی کی وسعتیں۔ یقیناً ــ! اس کا جی چاہتا تھا کہ ان سب چیزوں کو چھوڑ کر ہمالیہ کی اونچی چوٹیوں پر پائن کے جنگلوں میں چھپی ہوئی اپنی پرانی خانقاہ کو واپس چلی جائے۔ وہاں کی ابدی خاموشی، وہ سکون جوان رہبانیت کی وہ خاموش، دردانگیز، تکلیف دہ لذت اس کارنیول کی رنگین غباروں والی دنیا سے کہیں زیادہ اطمینان بخش، زندگی کی دھڑکنوں سے کہیں زیادہ قریب، زیادہ صحیح معلوم ہوتی تھی۔ کیسی ہنسی کی بات تھی۔ واقعہ یہ ہے۔ وہ سوچتی کہ اصلی راحت تو مجھے کہیں بھی نصیب نہ ہوگی۔ بھئی اللہ میں کیا کروں اور دوسرے لمحے پی چو اور کرن اور فیروزا اور گنّی آدھمکتے اور شام کے لئے پروگرام بننے لگتے تو گویا پھر بھی دنیا بڑی اچھی، محبت کے لائق جگہ تھی۔ اس میں پی چو اور پولو اور کرن جیسے پیارے اور مخلص بھائی اور ساتھی تھے۔ گنّی اور ڈائمنڈ اور کرسٹابل جیسی پیاری سہیلیاں تھیں ـ ومل اور فیروزا اور حفیظ احمد جیسے دلچسپ دوست تھے اور ــ اور یہ شخص ــــ یہ شخص تھا جس نے اس کے ساتھ والز کیا تھا۔ کیا کیا عجیب باتیں وہ اس وقت سوچے جا رہی تھی۔ انسان جب جذباتی طور پر مضطرب ہو تو غالباً بہت حساس ہو جاتا ہے

بڑے عجیب و غریب غیر منطقی خیالات دماغ میں کہیں سے آ گھستے ہیں۔ وہ آوارہ گرد خانہ بدوش — جپسی وائیلڈ کیٹ — مُون اینڈ سکس پنیس — اسے پھر نیند آ گئی باہر باغ میں صبح کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا اور دُور اکا دکا موٹریں اپنے ہارن بجاتی کہر آلود مال روڈ پر سے گذر رہی تھیں۔

صبح صبح کنور رانی کے کمرے میں بڑی اہمیت سے رشتے دار بیویوں کی کانفرنس شروع ہو گئی پی چو کو کرسمس کی پریڈ کے لئے پولس لائینز جانا تھا۔ اس لئے وہ خلاف معمول جلد اٹھ بیٹھا تھا۔ رخشندہ کی ابھی آنکھ نہ کھلی تھی کہ وہ اندر کوُد آیا۔ "روشی پریڈ دیکھنے چلتی ہو؟" اس نے لحاف کا گھونسلہ بنا کر اس میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اوں ہُنک" رخشندہ نے انگڑائی لے کر جواب دیا۔ رات دیر تک جگتے رہنے کی وجہ سے اسے اب تک نیند آ رہی تھی۔

"جانتی ہو کون کون آ رہا ہے؟" پی چو نے پوچھا

"تمہاری پریڈ پر؟"

"ارے نہیں۔ گھر پہ بھئی۔"

"کون؟"

"زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا" پی چو نے پنچم کے سر تک پہنچ کر ایک لمبی تان کھینچی۔

"بھئی پی چو کیا ہے۔ کبھی تو ٹھکانے کی بات کیا کرو۔ کون آ رہا ہے؟"

"اہم۔ نواب جہانگیر قدر۔"

"نواب جہانگیر قدر؟"

"اجی زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔"

"بی چچو قسم سے ہم ماردیں گے۔ پوری بات تو بتاتے نہیں۔"

"روشی وہ ممی کے ماموں میاں جو ہیں نواب سلیمان قدر۔ وہ آرہے ہیں مرشد آباد سے۔"

"تو اس میں اتنا اترانے اور شعر پڑھنے کی کیا بات ہے؟"

"جہانگیر قدر جو آرہا ہے۔"

وہ چپ ہوگئی

"ارے جبھی تو میں کہوں کہ یہ آدھی رات سے باغ والے بنگلے کی صفائی کیوں کی جا رہی ہے۔ مار عباسی خانم اور لالہ بولائے پھر رہے ہیں۔"

"اچھا تو پھر کیا ہوا جناب نورالنہار اور جہاں آرا بھی تو آئیں گی ان کے ساتھ"

"ارے پھر تو تمہارے منہ میں شکر گھی" بی چچو نے خوش ہو کر کہا۔

"شکر گھی نہیں خاک تھوڑی سی۔ راکھ۔ کوئلہ" وہ جل کر بولی۔

"ارے تو اتنا جلی کیوں جاتی ہو۔ جہانگیر قدر بھی تو ——"

"اچھا بی چچو چپ رہو۔ شرم نہیں آتی" اسے یہ سوچ کر بڑی کوفت ہوئی۔ ممی بلیھٹی بیھٹی جنتے کیا سٹر پٹر کرتی رہتی ہیں۔

سہ پہر تک مرشد آباد والے آن پہنچے۔ مرشد آباد اور ٹمیا برج والوں سے کنور رانی کے گھرانے کے پرانے تعلقات اور دُور کی رشتے داری تھی۔ ان تعلقات کو قائم رکھنے والے بڑے کنور صاحب اور بڑی بہو بیگم کب کی ختم ہو چکی تھیں۔

لیکن نواب سلیمان قدر اگلے وقتوں کے آدمی تھے۔ پرانی وضعداری کو نبھائے جاتے تھے۔ کلکتے یا مرشد آباد سے وہ جب بھی لکھنو آتے ہمیشہ غفران منزل بھی ملنے آتے۔ جہانگیر قدر پہلے کبھی غفران منزل نہ آیا تھا۔ دارجیلنگ اور کلکتے میں تعلیم ختم کرنے کے بعد نیوی میں شامل ہو کر وہ سمندروں پر چلا گیا تھا اور اب لڑائی کے بعد ہندوستان واپس آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی عباسی خانم کے پیٹ میں چوہے کودنے لگے۔ "اے ہے ماشاءاللہ سے ابھی لفٹین ہے۔ پھر کپتان ہو جاوے گا۔ اس سے اچھا کون ہے۔ اپنا دیکھا بھالا گھر کا لڑکا۔" عباسی خانم کو کئی بار سمجھایا ہے کہ نیوی میں کپتان اتنی جلدی نہیں ہو جاتے۔" رخشندہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "اے تو خاک پڑے۔ میں کیا جانوں تمہاری نیوی سیوی۔ پر مجھے تو بچہ بہت بھایا ہے۔ ماشاءاللہ سے کیا مٹر مٹر باتیں کرتا ہے۔" وہ پائنچے سنبھالتی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ رخشندہ چپکے سے غسل خانے کے راستے نکل کر "لالہ رخ" بھاگ گئی۔

جانے کس طرح سے یہ خبر ہیڈکوارٹرز سے نکل کر دوستوں کے سارے کیمپ میں پھیل گئی۔ کرن نے ہڑبڑا کر نیشنل ہیرلڈ کے دفتر سے فون کیا۔ "رو شنی سُنا ہے کہ غفران منزل میں بڑے زوروں سے یہ ڈھکوسے ہو رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہیں بھائی۔ پہلے سے خبر نہیں ملی۔ ورنہ سلیم کو تعزیت کا لوکل تار نہ بھیج دیتے۔ اور سنا ہے، کنور رانی کل امیر پور ہاؤس گئی تھیں تو ڈون انوردی گرہیٹ سے پوچھتی تھیں کہ بھیا تنک تم ہو بتیو تم کا ہمرا جہانگیر قدر نیک لاگا کہ ناہیں۔!" "ہم مار دیں گے کرن۔" رخشندہ کو اس مضحکہ خیز صورت حال پر رونا آ گیا۔ مرشد آباد والوں نے ایران میں شادیاں کی تھیں۔ اس لئے ان لوگوں میں

ایران کی صباحت اور بنگال کی ملاحت دونوں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ جہانگیر قدر یا تو بنگالی بولتا تھا یا فارسی۔ انگریزی بولنے پر جب آتا تو لگتا تھا کلکتہ ایکسپریس کا انجن سرپٹ نکل بھاگا۔ کھانے کی میز پر آکر اکثر رخشندہ ہی کو اس کی ترجمانی کرنی پڑتی۔ اس کا جی چاہا۔ گھر چھوڑ کر جنگلوں کو نکل جائے۔

وہ لوگ چار پانچ دن تک ٹھہرے رہے۔ اس دوران میں ایک روز سلیم عفران منزل آیا۔ اُس نے دیکھا۔ رخشندہ بڑے اطمینان سے جہانگیر قدر کے سامنے بھی وہی مکمل میزبان بنی ہوئی ہے۔ اس سے کہہ رہی ہے۔ آپ فیض آباد چلئے تو ہم آپ کو شکار کے لئے لے جائیں۔ آج کل ترائی میں خوب نیل گائیں اور مرغابیاں ملیں گی۔۔۔

مرشد آباد والے ابھی عفران منزل ہی میں تھے کہ سالِ نو آن پہنچا۔ لالہ رخ میں سال نو کی دعوت تھی۔ کرسٹابل اور حفیظ نے جہانگیر قدر اور اس کی دونوں بہنوں کو مدعو کیا۔ دوستوں کی ساری قوم جمع ہوئی۔ دھیرے دھیرے کرسٹابل کا خوبصورت ڈرائینگ روم مہمانوں سے پُر ہونا شروع ہوا۔ سیاہ ڈنر سوٹوں میں ہنری فونڈا اور کلارک گیبل جیسے مرد، راجکماری اندرا اور پرنسس درشہوار جیسی خواتین ایسے لوگ جن کے نام ٹیلی فون ڈائرکٹری میں اور سول لسٹ کے اولیں صفحات پر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جو کرسمس کے زمانہ کلکتے میں اور گرمیاں کشمیر میں بسر کرتے ہیں اور جن کی بیویاں ان سے طلاق لے کر سوئٹزرلینڈ چلی جاتی ہیں جگمگاتے انسانوں کے اس مجمع سے ذرا دور کونے میں رکھے ہوئے اسٹینڈرڈ لیمپ کے نیچے شیڈ کے اندھیرے میں وہ گھنگھریالے بالوں والی لڑکی چپ چاپ

بیٹھی تھی۔ نئے مہمان داخل ہوتے۔ کرسٹابل یا حفیظ ان کا نام اناؤنس کرتے اور پھر وہ ادھر اُدھر اپنے دوستوں کے حلقے میں جا بیٹھتے۔ اس کے پاس کوئی نہیں آیا۔ وہ اسی طرح خاموش بیٹھی اپنے اندازے کے مطابق زیادہ سے زیادہ خوبصورت نظر آنے کی کوشش کرتی رہی۔

"ارے بھئی ہلو۔" وبمنیز اکیڈمی کی مشہور و معروف اور بے حد اسمارٹ پرنسپل مس زینت ریاض نے اس کے قریب آکر کہا۔

"ہلو، بیٹھئے۔ شکر ہے کہ کوئی بات کرنے والا تو ملا۔ صدیوں سے بیٹھی اکتا رہی ہوں"۔

"کیوں؟ تم نے خود ہی اپنے کسی ہمسائے یا ہمسائی سے گفتگو شروع کر دی ہوتی۔ یوں بیک گراؤنڈ میں کبھی نہ رہنا چاہیئے"۔ انہوں نے اسے گر بتایا۔ "ابھی غفران منزل کا سٹ نہیں پہنچا۔ تم ان سے ملنا۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ چھوٹا کنور اور اس کا نووارد دوست ـــــ"

"ہوگا۔ فی الحال تو مجھے ان میں سے ایک بھی ڈھنگ کا آدمی نظر نہیں آیا۔ کیا یہی ہے تمہاری مشہور معروف اونچی سوسائٹی"۔

"نہیں ان میں سے بعض بعض لوگ بہت اچھے ہیں"۔ زینت ریاض نے کہا۔ "تم ابھی یہاں کسی کو نہیں جانتی ہو۔ اس لئے ایسا لگ رہا ہے۔" جو تنتیس سال چار ماہ کی ہو چکنے کی وجہ سے ان میں ایک قسم کی قلب و نظر کی وسعت آگئی تھی اور وہ انسانوں کی بہت سی خامیوں کو نظر انداز یا معاف کرنے کیلئے تیار رہتی تھیں۔

پی چو نے زناٹے سے کار لاکر برساتی میں روک دی۔ کرسٹابل بھاگی

باہر گئی۔ گنّی وغیرہ کی پوری پارٹی رخشندہ کے ساتھ آئی تھی۔ کرسٹابل نے برآمدے میں جا کر چپکے سے ان سے کہا۔ "سنو بھئی آج بڑے بڑے تکلف کے اور شریف لوگ آئے بیٹھے ہیں۔ ذرا تم سب قاعدے سے 'بی ہیو' کرنا۔ کھانے کے بعد جب یہ لوگ کھسک جائیں گے تو خُب رہے گی۔"

"اچھّا۔" رخشندہ نے کہا۔ "بھئی گنّی ڈائمنڈ پی چو کرن تم سب لوگ ڈرائینگ روم میں پہنچ کر 'بی ہیو یورسیلف' کرنا۔ آیا خیال شریف میں۔"

"اچھا۔" وہ بھی مان گئے۔

ہنری فونڈا اور شہزادی درشہوار جیسے انسانوں کے اس پُر تکلف مجمع میں ان ہی کی طرح بیٹھ کر نپی تلی فیشن ایبل باتیں کرنا ان مُیڈ ہیٹرز کے لئے بڑا صبر آزما کام تھا۔ لیکن گنّی اور ڈائمنڈ ایک طرف کو بے حد شرافت سے بہت ہی اخلاق کی باتیں کرنے لگیں۔ رخشندہ دوسری طرف انتہائی سنجیدہ شکل بنائے ایک صاحب سے جن کی بے حد تاریخی مونچھیں تھیں۔ بڑی پولٹیکل گفتگو کرتی رہی۔ اُوما، تسنیم، پی چُو، کرن اور رومل نے ایسے منہ بنا لئے گویا میلاد شریف سُن رہے ہیں۔

کچھ دیر تک یونہی گاڑی چلا کی۔

"اوہ بھئی سلیم ہم سے تو اب زیادہ بی ہیو یورسیلف نہیں کیا جاتا۔ سخت اسٹرین پڑ رہا ہے۔" رخشندہ نے چپکے سے کہا۔ سلیم اس کے نزدیک قالین پر بیٹھا چند خواتین کو ہاتھ دیکھنے کے مشغلے سے محظوظ کر رہا تھا۔ ڈائمنڈ نے اس کے قریب آ کر کہا۔ "روشی چلو ذرا باہر ٹھنڈی ہوا کھا آئیں تو کچھ جان میں

جان آئے۔ بی ہیو کرتے کرتے مصیبت آگئی"۔

جب وہ سب قہوے کی پیالیاں لینے کے لئے پینٹری کی طرف جار
اس وقت رخشندہ نے اس گھنگھر یالے بالوں اور چمپئی رنگت والی لڑ
دیکھا جو بے حد کوشش سے بن بن کر کچھ لوگوں سے گفتگو میں مصروف تھی۔

"ارے یہ تو وہ مشہور عالم شہلا رحمٰن ہیں جو شاعرہ ہیں بڑی بھاری سارد وا
اور جانے کون کون زبانوں میں شاعری فرماتی ہیں"۔ پی چو نے اچھل کر چک
گنّی سے کہا۔

"بھئی یہ کون چیز ہیں۔ پی چو تمہیں دنیا جہان کی خبر رہتی ہے۔ کون شا
فرماتا ہے۔ کون گھاس کھودتا ہے"۔ رخشندہ نے کہا۔

سب لوگ کھانے کے لئے دوسرے کمرے میں جانے لگے۔ جہانگیر ز
سلیم سے باتیں کر رہا تھا۔ رخشندہ اس کے پاس آئی۔ "چلو بھئی لفٹین صاحب
کھانا آگیا"۔ اس نے جہانگیر زندر سے کہا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور مجمع میں جا شا
سلیم ایک لحظے کے لئے وہیں پر ٹھٹھکا اور پھر اطمینان سے سگریٹ
گیلری کی طرف مڑ گیا۔

رخشندہ نے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ وہ گیلری میں پہنچ کر رکا۔ اس نے م
رخشندہ پر نظر ڈالی۔

وہ خاموشی سے اپنی کالی پلکیں جھپکا رہی تھی۔ جیسے کہتی ہو۔ کیا تم ہم سے خ
تمہیں ناراض نہ ہونا چاہئے۔ ارے تم تو بے قوف ہو بالکل۔ چلو کھانا کھانے
ڈائننگ روم کے مجمع میں ایک صاحب اپنی مونچھوں کی وجہ سے سب

ممتاز نظر آتے تھے۔ مونچھیں کیا تھیں گویا ناک ہیں مرغی کا پر۔ آدھا ادھر آدھا اُدھر۔ پڈنگ نوش کرتے کرتے ان کی مونچھ نجانے کہاں کو بھاگی جاتی تھی۔ کسٹرڈ کا ایک قطرہ چپک گیا اور انہیں اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ یہ اس قدر روح افزا نظارہ تھا کہ رخشندہ جو کمرے کے ایک کونے میں چپ چاپ اور رنجیدہ کھڑی پڈنگ ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی "ارے ڈائمنڈ گنتی ادھا جلدی آنا۔" اُس نے کہا۔ وہیں ٹہل ٹہل کر کھانا کھاتے ہوئے فوراً چند فی البدیہہ اشعار نازل ہوئے جن کا مطلع انوار تھا۔ میری پیاری مونچھو کدھر جا رہی ہو۔ لڑکیوں کی کھسر پھسر نے پی چو کو متوجہ کر لیا۔ یہ تم لوگوں کی کیا بری عادت ہے کہ جہاں چند لڑکیاں اکٹھی ہوئیں اور آپس ہی میں کھی کھی شروع کر دی۔ ہمیں بھی بتاؤ کیا واقعہ ہے۔ اب غور کرنے والا مقام یہ تھا کہ صاحب قصیدہ تو وہیں ٹہل رہے تھے۔ ان کی موجودگی میں بھلا کیا بتایا جاتا اور اوپر سے بی ہیو یور سلف کرنا پڑ رہا تھا۔ ہنسی سے دوہرے ہوتے ہوئے رخشندہ اور گنتی نے پی چو اور کرن کو برآمدے میں لے جا کر وہ پورا سانیٹ سنایا۔ وہ دونوں اپنی جگہ سے آدھ فٹ اچھل پڑے "ذرا یہ بی ہیو یور سلف کرنے والے لوگ چلے جائیں تو ڈرائینگ روم میں چل کر یہ قصیدہ سنایا جائے گا۔" پی چو نے کہا۔ "ارے ہائے خدا کے لئے یہ غضب نہ کرنا۔ سب کہیں گے۔ کیا دیوانی لڑکیاں ہیں"۔ رخشندہ گھبرا کر بولی۔

"معزز مہمانوں" کے جانے کے بعد جب صرف بے تکلف دوست رہ گئے تو پی چو نے انتہائی ترنم کے ساتھ اس نظم سے حاضرین کو مستفید کیا۔ کمرے میں

ایک طوفان آگیا۔ حالات نارمل ہونے پر سب اسی طرح اپنی اپنی جگہوں پر آ بیٹھے
شہلا رحمٰن اسی طرح بڑے تکلف سے دیوان پر بیٹھی تھی۔ اس لڑکی میں کچھ خصوصیت
تھی۔ وہ سب سے علیحدہ نظر آ رہی تھی اور رخشندہ نے جو کنور عرفان علی کی بیٹی تھی، فوراً
یہ محسوس کیا کہ یہ لڑکی ایک دوسرے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس دنیا سے
نکل کر وہاں آئی ہے جو 'بورژوا' ہوتے ہوئے 'ارسٹوکریسی' کی حدیں چھو لینے کی
کوشش میں ہاتھ پاؤں مارتی رہتی ہے۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس لڑکی
کو 'اسٹائلش' اور 'پوش' بننے کی کوشش میں مصروف دیکھ کر اس نے اس کی بیک
گراؤنڈ کا، ایک مڈل کلاس گھرانے کی اس کائنات کا تصور کرنا چاہا۔ جہاں سے
وہ آئی تھی۔ ایک مڈل کلاس گھرانا جس کے ڈرائنگ روم وینس اور نیپلز کے
مناظر کے پرنٹ اور لارڈ بائرن اور دانتے اور بیٹرس کی چھپی ہوئی تصویروں سے
مزین ہوتے ہیں اور جہاں کے لڑکے شام کو بے حد اہتمام سے سفید براق
پتلونیں پہن کر رفاہ عام کلب ٹینس کھیلنے جاتے ہیں اور لڑکیاں گریجویٹ کہلانے
کی تیاری کرتی ہیں اور جن کی مائیں نوجوان ڈپٹی کلکٹروں کو چائے پر مدعو کرتی ہیں
دیکھو ہماری پڑھی لکھی، کالج کی تعلیم یافتہ، بیٹیاں تمہارے گھروں میں جا کر تمہارے
کمروں کو بھی اسی طرح چھپی ہوئی تصویروں اور کڑھے ہوئے شبر اور چیتے کے
سے سجا دیں گی۔ یہ ٹریجک مڈل کلاس، اسے اس لڑکی سے تکلیف بڑی
محسوس ہوئی۔ اس کا جی چاہا۔ وہ سلیم سے کہے، جاؤ ذرا اس سے باتیں کرو۔
اس کا ہاتھ ہی دیکھ دو۔

لیکن سلیم چپ چاپ صوفے کا سہارا لگائے قالین پر بیٹھا سب کے ہاتھ

کی لکیریں ہی دیکھے جا رہا تھا۔

دعوت کے اختتام پر جب سب باہر نکل رہے تھے۔ گھنگھریالے بالوں والی شہلا رحمٰن نے دروازے کے قریب امبرپور کے انور اعظم کو دیکھا۔ ارے یہ تو وہی ہے جس نے فیض آباد میں چچا میاں کے گھر کے آگے جانے کیوں کار روک دی تھی اور پھر آگے چلا گیا تھا۔ واقعی اتفاقات بھی کیا ہوتے ہیں۔ کہاں سے کہاں لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا تے ہیں۔ بہت سی باتیں اُس کے دماغ میں گھومنے لگیں۔ یہ شاندار دعوت، یہ خوش باش، دلچسپ، الٹرا فیشن ایبل لوگ یہ چہکتی مہکتی لڑکیاں جو مونچھوں پر نظمیں کہتی ہیں اور ___ اور ___ یہ سانولا، انوکھا، مغرور، سیاہ آنکھوں اور لمبی پلکوں والا شخص جو محض سب کے ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ ان سب احساسات و تاثرات کو الگ الگ یاد کر کے وہ دماغ میں محفوظ کر لے گی اور نظموں کے مسالے میں یہ سب کام آئے گا۔

انور نے جب اسے سیڑھیوں پر تنہا کھڑے دیکھا تو اخلاقاً اس کے پاس آکر کہنے لگا: "آپ اپنے دولت خانے تشریف لے جائیے گا؟"

"جی۔"

"آپ کے ڈرائیور کو آواز دوں؟"

"اوہ ___ جی نہیں شکریہ۔ مجھے مس ریاض کا انتظار ہے۔" اُس نے غیر یقینی سے لہجے میں کہا

"اوہ۔ بہت اچھا۔ شب بخیر۔" وہ آگے چلا گیا۔

گنّی اور فیروزا اندر سے نکلے۔

"بھئی گنی ڈارلنگ مس رحمٰن کو تم پہنچاتی جاؤ" کرسٹابل نے آکر ک
"ضرور۔ آپ کہاں رہتی ہیں؟" گنی نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے
لیکن جہاں وہ رہتی تھی۔ وہ اتنی فلیشن ایبل جگہ نہ تھی جس کا نام وہ اطم
سے لے دیتی۔ "کچہری روڈ" اس نے آہستہ سے کہا۔
"ارے کرن تو ادھر سے ہی گذرے گا۔ کرن بھئی یہاں آنا" گنی نے آو
کرن نے برساتی میں آکر فوراً بے حد اخلاق سے اپنی اوپل کا دروازہ کھو
جب وہ کرن کے ساتھ بیٹھی لالہ رخ کے پھاٹک میں سے نکل رہی تھ
نے دیکھا کہ سلیم موٹروں کے قریب کھڑا زعفران منزل والوں سے باتیں کر ر
اندھیرے میں اس کی آنکھیں زیادہ پُراسرار زیادہ سیاہ معلوم ہو رہی تھیں۔
راستے میں کرن اپنے فطری بے تکلف اور پرخلوص طریقے سے اس
مختلف سوالات کرتا رہا۔ الہ آباد میں آپ فلاں فلاں کو جانتی ہیں۔ آپ
ہماری بہنیں پسند آئیں۔ آپ ہمارے رسالے نیو ایرا کے لئے بھی ضرور لکھ
گھر پہنچ کر اس نے اپنے کمرے کے دروازے بند کئے اور وہ کھڑ
جس کا رخ چھتر منزل کی طرف تھا۔ حالانکہ چھتر منزل وہاں سے نظر نہ آ
کیونکہ بیچ میں روشن الدولہ کی کچہری کی سرخ عمارتوں کا طویل سلسلہ حائل
لیکن بہرحال، رات کے سناٹے میں گومتی کی طرف سے ہوائیں تو آجاتی تھیں
اسے یاد آیا کہ یہ پہلی جنوری کی رات ہے اور گومتی کی ہوائیں بہت سرد ہو
اُس نے کھڑکی بند کر دی اور لیمپ سرہانے رکھ کر، کیونکہ آنکھوں سے
ابھی بہت دور تھی۔ اُس نے لکھنا شروع کیا:۔۔۔۔

نیچی نظروں بولے ڈولے، اونچی نظروں چپ چاپ رہے
نیچی نظروں بولے ڈولے۔

تب قمر آراء کا تانگہ لاٹوش روڈ اور قیصر باغ کے چوراہے سے گذرتا موتی محل برج پر پہنچا۔ جہاں سے یونیورسٹی کی دنیا شروع ہوتی تھی۔ اس وقت پچھوا ہوا تیزی سے بہہ رہی تھی اور اس کی وجہ سے تانگے پر جو فرخ آباد کا چھپا ہوا فیروزی پلنگ پوش بندھا تھا۔ وہ اڑا جا رہا تھا اور اس اڑتے ہوئے پردے میں سے کیا نئی، عجیب و غریب، خوبصورت، طلسماتی دنیا نظر آ رہی تھی۔ شفاف، سایہ دار سڑک جس پر طالب علموں کی سائیکلوں اور موٹروں کے علاوہ اور کوئی ٹریفک ہی نہ تھا۔ سرسبز گھاس کے میدان، یونیورسٹی کے بے تحاشا شاندار عمارتوں کے اونچے اونچے گنبد اور مینار اور رشہ نشین سائیکلوں پر سوار ازابلا تھوبرن کالج اور یونیورسٹی کی انگریز اور ہندوستانی لڑکیاں جن کے بال اور آنچل اس کے تانگے کے قریب سے زن سے نکلتے ہوئے ہواؤں میں اڑے جاتے تھے۔ یونیورسٹی روڈ پر سے مڑ کر ازابلا تھوبرن کالج کے آگے سے گذرتے بادشاہ نگر کی سڑک کی دھول اور دھچکے کھاتے وہ اور چودہری اصغر علی بالآخر کرامت حسین گرلز کالج کے پھاٹک میں داخل ہوئے اور وہ مسلم اسکول میں شامل ہو گئی۔

یہ مسلم اسکول ایک نئی دنیا تھی۔ ان اونچی سفید دیواروں اور جھروکوں کے اندر ایک الف لیلیٰ ایسی بستی آباد تھی۔ وہاں عجیب و غریب باتیں اس نے دیکھیں کلاس میں استانیوں کو لڑکیاں گلاب کے پھول پیش کرتیں۔ صبح صبح باغ میں جا کر

"بھئی گنی ڈارلنگ مس رحمٰن کو تم پہنچاتی جاؤ۔" کرسٹابل نے آکر کہا۔
"ضرور۔ آپ کہاں رہتی ہیں؟" گنی نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا
لیکن جہاں وہ رہتی تھی۔ وہ اتنی فلیشن ایبل جگہ نہ تھی جس کا نام وہ اطمینان سے لے دیتی۔ "کچہری روڈ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔
"ارے کرن تو ادھر سے ہی گذرے گا۔ کرن بھئی یہاں آنا۔" گنی نے آواز دی
کرن نے برساتی میں آکر فوراً بے حد اخلاق سے اپنی اوپل کا دروازہ کھول دیا۔
جب وہ کرن کے ساتھ بیٹھی لالہ رخ کے پھاٹک میں سے نکل رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ سلیم موٹروں کے قریب کھڑا زعفران منزل والوں سے باتیں کر رہا تھا
اندھیرے میں اس کی آنکھیں زیادہ پُر اسرار زیادہ سیاہ معلوم ہو رہی تھیں۔
راستے میں کرن اپنے فطری بے تکلف اور پُر خلوص طریقے سے اس سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ الہ آباد میں آپ فلاں فلاں کو جانتی ہیں۔ آپ کو ہماری بہنیں پسند آئیں۔ آپ ہمارے رسالے نیو آیرا کے لئے بھی ضرور کچھ لکھئے
گھر پہنچ کر اس نے اپنے کمرے کے دروازے بند کئے اور وہ کھڑکی کھولی جس کا رُخ چھتر منزل کی طرف تھا۔ حالانکہ چھتر منزل وہاں سے نظر نہ آتی تھی کیونکہ بیچ میں روشن الدولہ کی کچہری کی سرخ عمارتوں کا طویل سلسلہ حائل تھا۔
لیکن بہرحال، رات کے سناٹے میں گومتی کی طرف سے ہوائیں تو آجاتی تھیں۔ پھر اسے یاد آیا کہ یہ پہلی جنوری کی رات ہے اور گومتی کی ہوائیں بہت سرد ہوں گی
اُس نے کھڑکی بند کر دی اور لیمپ سرہانے رکھ کر، کیونکہ آنکھوں سے نیند ابھی بہت دُور تھی۔ اُس نے لکھنا شروع کیا:۔

ینچی نظروں بولے ڈولے، اونچی نظروں چپ چاپ رہے
ینچی نظروں بولے ڈولے۔

تب قمر آرا، کا تانگہ لاٹوش روڈ اور قیصر باغ کے چوراہے سے گذرتا موتی محل برج پر پہنچا۔ جہاں سے یونیورسٹی کی دنیا شروع ہوتی تھی۔ اس وقت پچھوا ہوا تیزی سے بہہ رہی تھی اور اس کی وجہ سے تانگے پر جو فرخ آباد کا چھپا ہوا نیروزی پلنگ پوش بندھا تھا۔ وہ اڑا جا رہا تھا اور اس اڑتے ہوئے پردے میں سے کیا انتی، عجیب و غریب، خوبصورت، طلسماتی دنیا نظر آ رہی تھی۔ شفاف، سایہ دار سڑک جس پر طالب علموں کی سائیکلوں اور موٹروں کے علاوہ اور کوئی ٹریفک ہی نہ تھا۔ سرسبز گھاس کے میدان، یونیورسٹی کے بے تحاشا شاندار عمارتوں کے اونچے اونچے گنبد اور مینار اور شہ نشین سائیکلوں پر سوار ازابلا تھوبرن کالج اور یونیورسٹی کی انگریز اور ہندوستانی لڑکیاں جن کے بال اور آنچل اس کے تانگے کے قریب سے زن سے نکلتے ہوئے ہوائیں اڑے جاتے تھے۔ یونیورسٹی روڈ پر سے مڑ کر ازابلا تھوبرن کالج کے آگے سے گذرتے بادشاہ نگر کی سڑک کی دھول اور دھچکے کھاتے وہ اور چوہدری اصغر علی بالآخر کرامت حسین گرلز کالج کے پھاٹک میں داخل ہوئے اور وہ مسلم اسکول میں شامل ہوگئی۔

یہ مسلم اسکول، ایک نئی دنیا تھی۔ ان اونچی سفید دیواروں اور جھروکوں کے اندر ایک الف لیلیٰ ایسی بستی آباد تھی۔ وہاں عجیب و غریب باتیں اس نے دیکھیں۔ کلاس میں استانیوں کو لڑکیاں گلاب کے پھول پیش کرتیں۔ صبح صبح باغ میں جا کر

اپنی پسندیدہ استانیوں کے لئے گجرے تیار کئے جاتے جس طرح کی نئی ساریاں یا
سینڈلز ٹیچرز پہنتیں۔ دوسرے روز ان کی پرستاروں کے گروہ اسی رنگ
کے لباس میں نظر آنے۔ رات کو اسمبلی ہال میں چھوٹے چھوٹے ڈرامے اور مشاعرے
کئے جاتے۔ اتوار کے روز لڑکیوں کے بھائی ان سے ملنے آتے۔ نصیبن آپا جو
اپنی ذات سے انجمن تھی۔ اندر آکر چلاتی۔ فلاں فلاں بٹیا چلو کوئی جنے تم سے
ملنے آئے ہیں۔ وہاں چوڑیوں، تحفوں اور آپس کی محبتوں کا بڑا زور تھا۔ یہ
پردے میں چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی کائنات تھی اور لڑکیاں جو زیادہ تر پردے دار
متوسط طبقے کے خاندانوں سے وہاں آتی تھیں۔ اسی کائنات کی چہار دیواری میں
اپنے شوق پورے کرنے کی کوشش کر لیا کرتی تھیں۔ قمر آرا جس زندگی سے نکل کر
وہاں آئی تھی۔ وہاں چودھریوں کے اس محلے میں، پردے دار آنگنوں، صحنچیوں اور
ڈیوڑھیوں میں چپکے چپکے ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ مہریوں یا نانوں کے ذریعے
کاپی کے کاغذوں پر نہایت زوردار قسم کے محبت نامے بھیجے جاتے تھے۔ جن
میں خودکشی، چاندنی راتوں کی یاد اور اسی قسم کی باتوں کا تذکرہ ہوتا تھا جو مسلم
سوشل فلموں میں دکھائی جاتی ہیں۔ لڑکیاں جن کے رشتے کے بھائی چھٹیوں میں اپنے
اپنے کالجوں سے مانا ٹھیر، رودلی یا سندیلے آتے تھے۔ آپس میں مذاق کرتیں
فلاں بھائی جان اور فلاں بھیّا کا نام لے لے کر چھیڑا اور شرمایا جاتا۔ بعض صاحبزادیاں
اس میدانِ عشق میں اتنی نبرد آزما ثابت ہوئی تھیں کہ باورچی خانے کے چاقو کے ذریعے
انگلی میں سے خون نکال کر اپنے اپنے ہیروؤں کو خط لکھ چکی تھیں۔ وہ ان سب
چیزوں کو دیکھنے کی عادی تھی۔ لیکن یہاں اس کالج میں ان باتوں کے بجائے

آپس ہی میں محبت نامے چلتے تھے اور ایک دوسرے پر مرا جاتا تھا۔

قمر آراء یہاں بہرحال خوش تھی۔ مانا ٹھیر کی چھوٹی حویلی کی قید بامشقت سے آزاد ہو کر اس نے پہلی بار چین کا سانس لیا تھا۔ یہاں آتے ہی وہ پرنسپل کے دفتر سے غفران منزل فون کر کے رخشندہ بجیا کو اطلاع دے چکی تھی کہ وہ لکھنؤ آگئی ہے اور رخشندہ بجیا اتنی اچھی تھیں کہ فوراً اگلے اتوار کو کار بھجوا کر انہوں نے اسے غفران منزل بلوا لیا تھا اور اس سے کہہ رکھا تھا کہ اب کے سے غفران منزل میں اگر کوئی 'پردہ پارٹی' ہوئی تو اس میں اس کو ضرور آنا پڑے گا۔

قمر آراء بہت خوش تھی

ایک روز جبکہ جمعہ کی آدھے دن کی چھٹی تھی اور لڑکیاں سفید آڑے پاجامے اور اپنے اپنے 'ہاؤسوں' کے رنگوں کے دوپٹے پہنے کھیل کے میدان میں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں نصیبن ٹیچرز بلڈنگ کے برآمدے میں آکھڑی ہوئی اور اپنی مخصوص جناتی آواز میں چلائی "کمر بٹیا تمہرے بھیّا آئے ہیں"۔ قمر آراء باسکٹ بال کے لئے اپنی ٹیم ترتیب دے رہی تھی۔ یہ اطلاع سُن کر اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ کیا بھائی میاں آگئے۔ اس نے جلدی سے بالوں کی لٹیں دوپٹے میں سمیٹیں اور چنبیلی کی کیاریوں کو پھلانگتی ٹیچرز بلڈنگ کی طرف بھاگی۔

"کیسے ہیں۔ گورے گورے سے ہیں؟" اس نے نصیبن کے پاس پہنچ کر پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پوچھا۔

"نہ گورے نہ کچھ کالے ایسے ہیں تمہرے بھیّا۔" نصیبن نے ہاتھ چلا کر کہا اور زردہ پھانکتی اطمینان سے آگے چلی گئی۔ قمر آرا کے قدموں کی رفتار بہت سست پڑ گئی

ہلیم دفتر کے سامنے برآمدے میں کھڑا وقت گذاری کے خیال سے نوٹس بورڈ پڑھ رہا تھا۔ رخشندہ نے پیغام رسانی کی یہ اچھی مصیبت اس پر ڈالی تھی۔

"اوہ ۔۔" ایک بالکل جانے کون آدمی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر قمر آرا ایک قدم پیچھے ہٹ گئی

"آداب عرض۔"

"تسلیمات"

"رخشندہ کی کزن قمر آرا بیگم آپ ہی ہیں؟"

"جی۔"

"رخشندہ بیگم نے یہ کہلوایا ہے کہ وہ اس اتوار کو آپ کو غفران منزل نہ بلوا سکیں گی۔ کیونکہ انہیں کہیں باہر جانا ہے۔"

"اچھا آپ ۔۔ آپ رخشندہ بجیا کے ۔۔"

"جی، وہ میری دوست ہیں۔"

قمر آرا چپ ہو گئی۔ واہ بھئی۔ رخشندہ بجیا بھی کوئی لڑکا ہیں جو آپ اس مزے سے کہہ رہے ہیں کہ وہ میری دوست ہیں۔ اس نے دل میں کہا۔

"اچھا آداب عرض"۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور جلدی سے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر باہر کھڑی ہوئی کار میں جا بیٹھا اور آگے روانہ ہو گیا۔

قمر آرا باسکٹ بال کے لئے اندر واپس چلی گئی۔

کنور رانی صبح سے بہت پریشان تھیں۔ امبر پور والوں نے پھر یاد دہانی کرائی

تھی کہ کنور انور اعظم کے لئے جو پیام ہم مدت گذری بھیج چکے ہیں۔ اس کا صاف جواب دیجئے۔ ادھر میں نہ رکھئے تاکہ ہم کہیں اور فکر کریں۔ لڑکے کی عمر جاتی ہے اس کے علاوہ در پردہ اُن کا یہ مطلب بھی تھا کہ حمیلہ بیگم کی نسبت ہوئے اتنے دن ہونے آئے۔ اس کا قصہ بھی نپٹا دیجئے۔ ایک دفعہ بات طے ہو چکی ہے تو بیٹی کا معاملہ ہے۔ ہم دیر نہیں کرنا چاہتے۔ کنور رانی اسی سوچ میں تھیں۔ لفٹنٹ جہانگیر قدر کا مسئلہ بھی ان کے سامنے موجود تھا۔ انہوں نے کنور صاحب کو اوپر سے بلوایا۔ کنور صاحب عجب مگن آدمی تھے۔ انہیں تو جیسے فکر ہی نہ تھی کہ لڑکی ان کے لاڈ پیار میں تئیس چوبیس برس کی ہوا چاہتی ہے۔ کوئی بادشاہ بھی اپنی بیٹی کو گھر پہ نہیں بٹھا سکا۔ آپ کب تک یونہی قانون شیخ میں کھوئے رہیئے گا۔ کنور صاحب گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور پھر اپنے دارالمطالعے کی طرف چلے گئے۔

"ایسے مردوئے کے ساتھ نوج کوئی جھک مارے"۔ کنور رانی نے غصے سے اپنے خوبصورت سر کی جنبش کے ساتھ کہا اور اپنی صحنچی میں آ بیٹھیں۔

اسی وقت کہیں سے گھومتے پھرتے چودھری شمیم آن ٹپکے

"کہئے چودھرائن۔ نصیبِ دشمناں آپ کا نوجی ماندہ نظر آتا ہے"۔ انہوں نے آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بھیّا میں تو ان بچوں کی فکروں میں تنکے چننے لگوں گی"۔ انہوں نے رنجیدہ آواز میں کہا۔

"کیوں۔ مرشد آباد والوں کے سلسلے میں رخشندہ بیگم کی کیا رائے ہے"۔

"پتہ نہیں۔ وہ جانیں ان کے چہیتے بھیّا باوا جانیں"۔

"میں سمجھا۔" چودھری شمیم نے کہا
"اس وقت ماناٹھیر سے آتے ہو؟" کنور رانی نے کچھ وقفے کے بعد بات کا رُخ بدل کر پوچھا
"جی ہاں۔"
"وہاں سب خیریت ہے؟"
"بالکل صرف قمر آرا بیگم مسلم اسکول میں داخل ہونے کے لئے تشریف لے آئی ہیں۔"
"ہاں وہ تو میں جانتی ہوں قمر آرا پچھلے اتوار کو یہاں بھی آئی تھی۔"
"ابھی جب میں غفران منزل آتا تھا تو راہ میں مجھے امبرپور ہاؤس کے مختار عام میاں مرتضیٰ حسین ادھر سے جاتے نظر آئے۔ کیا کچھ پچو میاں کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی ہے؟" چودھری شمیم نے پہلو بدل کر خالص رشتے داروں کے سے انداز میں خاندانی سیاست پر روشنی ڈالنی چاہی۔
"مرتضیٰ حسین انور کے لئے کہتے تھے۔" کنور رانی نے مختصراً جواب دیا۔
"انور کے لئے؟ غضب خدا کا۔ ارے صاحب میں نے خود اپنی آنکھوں سے انور اعظم کو، اسے کیا نام اس کا، کوئن روز کو جو بارہ بنکی میں ناچی تھی۔ اپنی موٹر میں بٹھائے لئے جاتے دیکھا ہے۔ کیا کہتی ہیں۔ کہیں ایسی غلطی بھی نہ کیجیے گا۔ لوفر لڑکا ہے بالکل" چودھری شمیم نے بڑے تشویشناک انداز میں کہا۔
کنور رانی چپ چاپ بیٹھی ڈلی کاٹا کیں۔ انہیں چودھری شمیم کی رائے سے اتفاق تھا کہ انور اعظم لوفر لڑکا ہے قطعی ہوگا۔ لیکن اس لحاظ سے لوفر کون نہیں

ہوتا خود کنور صاحب اور بڑے کنور صاحب جنت مکانی خدا ان کی روح کو نہ شرماوے
اپنے اپنے زمانوں میں کسی سے کیا کم تھے۔ کلکتے والی گوہر اور دلّی والی چھمیا کے
قصے کس کو یاد نہیں لیکن رخشندہ جس معیارِ زندگی کی عادی تھی۔ وہ مرشد آباد
کے لٹے ہوئے نوابوں یا کسی اور ملازمت پیشہ گھرانے میں اس معیار سے نہ رہ
سکتی تھی۔ وہ خوب روپیہ خرچتی تھی۔ انور کے پاس گاؤں گراؤں سبھی کچھ تھا اور
وہ اس کے لئے بے غل و غش روپیہ اٹھا سکتا تھا اور آرام کی زندگی بسر کرنے کے لئے
یہی سب سے مقدّم ہے۔

خاصے کے بعد چودھری شمیم نے کنور رانی سے اجازت چاہی اور سوچا۔ کہ
اب امبر پور ہاؤس کا رُخ کریں۔ تاکہ وہاں کے تازہ ترین حالات سے واقفیت
ہو سکے۔ چودھری شمیم ان دنوں ایک فلم کمپنی قائم کرنے کی ٹپس لڑا رہے تھے اور ا
لئے انہیں بہت سارے روپے کی ضرورت تھی۔ وہ اسی خیال سے عفران منزل
تشریف لائے تھے کہ کنور صاحب کے ہاتھ اس کے حصے فروخت کرنے کی
کوشش کریں لیکن اس وقت کنور رانی اپنی ہی پریشانیوں میں مبتلا بیٹھی تھیں اور
کنور صاحب کے سامنے جانے کی انہیں ہمّت ہی نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ اپنا ہیٹ
اٹھا کر وہ اپنی پرانی فورڈ میں آ بیٹھے جو انہیں اپنے والد سے چند گاؤں کے ساتھ
ورثے میں ملی تھی۔

چودھری شمیم ہر فن مولا آدمی تھے۔ کنور رانی سے ان کی بہت دور کی رشتہ داری
تھی۔ کئی سو روپے ماہوار کی زمینداری تھی۔ چین سے گذرتی تھی۔ لیکن خالی بیٹھنا نہ
جانتے تھے۔ پولٹری فارمنگ اور لیگ کی لیڈری سے لے کر فلم پروڈکشن تک

سب طرح کے کاروبار پر طبع آزمائی فرما چکے تھے اور فی الحال اس کوشش میں تھے کہ چودھری اصغر علی کی لڑکی قمر آرا سے اگر ان کی شادی ہو جائے تو خورشید چونکہ لاپتہ ہے۔ چودھری صاحب کی ساری جائداد ان ہی کے ہاتھ آئے گی۔ اس کے علاوہ بیگم اصغر علی کو جو پچھتر روپے بارہ آنے وثیقہ ملتا تھا۔ وہ ان کے بعد ان کی لڑکی کو ملے گا۔ پھر راوی چین لکھتا ہے۔ لیکن اس ربیع الاول میں ان سے شادی رچانے کے بجائے قمر آرا تو مانا ٹھیر سے صاف بچ کر مسلم اسکول پہنچ چکی تھی اور یہ مسئلہ بڑا غور طلب اور پریشان کن تھا۔ لیکن اس وقت تو وہ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں اپنی فورڈ پر سوار چلے جاتے تھے کہ دیکھئے اب اس انور کے قصے کا کیا ہوتا ہے۔

چودھری شمیم کی فورڈ تھوڑی دیر بعد امبر پور ہاؤس کی سرخ برساتی میں جا رکی۔ ہارن بجانے پر سیروں گھنے پاتے پہنے ایک گدبدی سی مہری باہر آئی۔

"انور میاں ہیں؟" انہوں نے اس سے پوچھا

"بھیا اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں"۔

"کوئی اور بھی ہے ان کے پاس؟"

"جی ہاں۔ جمیل میاں تشریف رکھتے ہیں"۔ مہری نے جواب دیا اور کڑے بجاتی کوندے کی لپک کی طرح گیلری کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

امبر پور راج کے انور اعظم کو رات کی نیند سے بیدار ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی وہ صوفے پر نیم دراز جمیل کے ساتھ سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے بنا رہا تھا۔

"اوہو! یہ تو چودھری صاحب چلے آتے ہیں"۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آداب بجا لاتا ہوں حضور"۔ اس نے چودھری شمیم سے کہا۔

"تسلیمات۔ بندگی۔" وہ ہیٹ فرش پر پھینک کر برابر کے صوفے پر آ بیٹھے۔
"کہئے۔ سرکار آپ کی فلم کمپنی کیا کہتی ہے؟" انور نے پوچھا
"اجی فلم کمپنی کو گولی ماریئے۔ یہاں تو مبارکباد پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں قبلہ۔"
"مبارکباد کاہے کی۔ میاں تمہارے منہ میں شکر گھی۔ جلد بتاؤ۔"
"ہم یوں نہ بتائیں گے۔ مٹھائی سامنے رکھو پہلے۔"
"واللہ تمہیں جناب امیرؑ کی قسم بتاؤ تو سہی کیا خبر ہے۔"
"خبر؟ اب یوں نہ اڑیئے قبلہ۔"
"ارے بندۂ خدا ارشاد تو کرو۔"
"آپ تو گویا بسم اللہ کے گنبد سے نکلے چلے آتے ہیں۔ کچھ جانتے ہی نہیں"
"ارے بھائی اتنی لمبی تمہید اٹھائی ہے تو کچھ کہو تو سہی۔"
"سرکار عفران منزل سے چلا آتا ہوں۔"
"خوب ـــ خوب ـــ آگے فرمایئے۔" جمیل جلدی سے کان کھڑے کرکے متوجہ ہو گیا۔ لیکن انور اعظم جب تک چودھری شمیم وہاں موجود رہے خاموش رہا
"خوب شے ہیں آپ بھی۔ خدا جانے کس چکر میں ہیں اور یہاں آکر یہ شگوفہ چھوڑ گئے۔" ان کے جانے کے بعد انور نے کہا۔
"پارٹنر اگر ان کی یہ چنڈو خانے کی روایت صحیح ہے تو قصہ تو دلچسپ رہے گا"
جمیل بولا۔
انور پھر صوفے پر لیٹ گیا اور دھوئیں کے حلقے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

ابھی دو گھڑی دن باقی تھا اور کلب کا وقت بہت دُور تھا۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں ایسا ایسا رئیس پڑھتا ہے۔ جس کی دو دو سال محض پروکسی سے حاضریاں لگتی ہیں۔ لیکن وہ خود اپنے تعلقوں سے تشریف لا کر کلاس میں شرکت کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا جب کوئی اچھا فلم آیا یا یونین میں کسی دلچسپ قسم کی ہٹر لوٹنگ کا امکان ہوا تو مزے سے اپنی کار لے کر آ گئے۔ ہیوٹ یا بٹلر ہوسٹل میں دوستوں کے کمرے میں ٹھہرے اور واپس چلے گئے۔ امتحانات وغیرہ اپنے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی کیا فکر۔ اپنے صبح نو بجے کے قریب جاگے امینیسڈ میں جا کر ہاتھ منہ دھویا اور چاء نوش کی۔ جی چاہا تو ایک آدھ کلاس جھانک لی۔ لیڈیز روم کے برآمدوں کے سامنے سے کاریں بے نیازی سے دو تین چکر لگائے اور پھر سدا بہار حضرت گنج کے کسی کافی ہاؤس میں رات کے نو بجے تک رونق افروز رہے۔ یونین کے جلسوں میں بینیٹ ہال بابا اے۔ پی سین ہال میں سب سے پیچھے سب سے زیادہ شور مچانے والے گروپ کے ساتھ جا بیٹھے یا اوپر جا کر کھڑکیوں میں سے نیچے جھانک کر مزے مزے کے فقرے کستے رہے آنرز اور ایم اے اور لا کی ساری ممکن کلاسیں ختم کر لیں تو پھر ریسرچ میں نام لکھا لیا۔ تاکہ یونیورسٹی کی دلچسپیوں سے قانونی طور پر تعلق باقی رہے۔ امبر پور کا انور اعظم انہیں رئیسوں اور اولڈ ٹائمرز" میں سے تھا۔ برسات میں وہ بھی اپنے تعلقے پر چلا جاتا۔ گرمیوں میں مسوری کی سیر کرتا۔ اسکیٹنگ اور سومنگ میں وقت گذارتا اور پھر جی بھر کے تفریحیں کر لینے کے بعد بڑی معصومیت سے سوچتا۔ یہ بھی زندگی کا ایک PHASE تھا۔ مجھے اس موقعے پر اس وقت یہی رول ادا کرنا تھا۔

اور یہ طے کر لینے کے بعد وہ امبر پور ہاؤس کے دفتر میں بیٹھ کر ریاست کے کسانوں
کی بہتری اور بہبودی کی اسکیمیں بنانے میں مشغول ہو جاتا۔ وہ ایسا آدمی تھا جسے
ٹکنیکل طور پر اچھا انسان کہا جا سکتا ہے۔ جب وہ ڈون اسکول سے واپس آیا
تو اس نے امبر پور میں یہ افواہ سنی کہ اماں بیگم کمروا ہا راج اس کی بات لئے جاتی
ہیں۔ رخشندہ ان دنوں نینی تال میں پڑھ رہی تھی۔ پی چو اور پولو کو بھی وہ اچھی طرح نہ
جانتا تھا۔ لکھنؤ کے لا مارٹینز کالج میں کچھ عرصے اس کا اور پی چو کا ساتھ رہا تھا لیکن
امبر پور ہاؤس اور زعفران منزل والوں میں آپس میں زیادہ گہرے تعلقات کبھی نہ
رہے تھے۔ اس لئے اسے رخشندہ کو دیکھنے کا موقعہ بہت کم ملا تھا۔ کبھی کبھی
وہ اسے دلکشا کلب یا سوسائٹی کے کسی ڈرائینگ روم میں نظر آجاتی تھی۔ اسے
بڑے ہو کر یہ یاد بھی نہ رہا تھا کہ امبر پور ہاؤس والے اس کی 'بات' لے کر
زعفران منزل گئے تھے۔ دیوے کے میلے میں اس نے رخشندہ کو پہلی بار
اتنے قریب سے دیکھا۔ پھر اس نے سنا کہ چچی بیگم نے کنور رانی کے سامنے یہ شرط رکھی
ہے کہ ہم پی چو میاں کا رشتہ جبھی منظور کریں گے۔ جب آپ رخشندہ بیگم کے لئے
ہماری بات مان لیں گے۔ لاحول ولا۔ کیا حماقت کی یہ سیاست تھی۔ اسے اس
سیاست سے بالکل کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ اسے یہ لڑکی
بہت پسند ہے۔ بلکہ وہ تو اپنے دل کی اچھائی کی وجہ سے اس کی پرستش تک
کرنے کو تیار تھا۔ اگر اسے یہ یقین ہو جاتا کہ وہ اس کی ذرا سی بھی پرواہ کرلے گی
کیونکہ اس نے کہیں سے خورشید کا قصہ سن رکھا تھا۔ حالانکہ بڑے گھر کی بات
بہت جلد چھپا دی جاتی ہے۔ اسے خوب معلوم تھا کہ رخشندہ انتہائی ضدی،

خود سر اور مغرور لڑکی ہے۔ اگر وہ اپنی کسی بات پر اڑ جائے تو ساری عفران منزل اسے منانے کے لئے رات بھر ایک ٹانگ پر کھڑی رہ سکتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شہر کے تازہ وارد ڈون ژوان ڈاکٹر سلیم کا ہر اتوار کو اپنے ضلع سے بھاگا بھاگا آنا خالی از علت نہیں لیکن اپنے دل کی اچھائی کی وجہ سے اس نے ڈاکٹر سلیم سے جلنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس کا عزیز ترین دوست صرف جمیل تھا۔ جو زیادہ تر علی گڈھ میں رہتا تھا۔ علی گڈھ میں جانے کس علت میں تھا۔ اسے ایم ایس سی وغیرہ کئے صدیاں گذر گئی تھیں۔ اب جانے وہ ریسرچ کر رہا تھا یا مقابلوں کی تیاری یا غالباً گرلز کالج میں فزکس کا "لیڈی لیکچرر" ہو گیا تھا۔ یونین کے الیکشن لڑانے میں اس سے زیادہ ماہر دور دور تک کہیں نظر نہ آ سکتا تھا اور وہ میرس روڈ اور ڈگی اور نقوی پارک اور گرلز کالج کے چکر لگایا کرتا تھا اور حد سے زیادہ "نون سیریس" رہتا تھا۔

وہ دونوں صوفے پر اکتائے ہوئے بیٹھے رہے۔ شام کی چاء کے ساتھ مہری نے شام کی ڈاک حاضر کی۔ دوسرے خطوط کو کھول کر دیکھنے کے بعد انور اعظم کی نظر ایک بڑے سے خوبصورت لفافے پر پڑی جو کشتی میں سب سے نیچے رکھا تھا۔ اس نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کھولا:۔

"ظاہر ہے کہ میں تمہیں اچھی نہیں لگتی۔ لیکن کیا کیا جائے کہ تم مجھے پسند ہو۔ کرسمس اور سال نو کی مبارک باد پہنچے۔

کوئین روز

ایک لحظے کے لئے اس نے جمیل کو اس طرح دیکھا۔ گویا اب وہ یقیناً کسی بڑے

سنسنی خیز، سو فیصدی بولتے گاتے ناچتے بہترین سین سینریوں والے فلم کا ہیرو بننے والا ہے

"بڑے لطیفے کی لونڈیا ہے۔ مانتا ہوں" جمیل نے کہا۔ صورت حال پر اس سے زیادہ ٹھکانے کا ریویو اس کی سمجھ میں اس وقت نہ آیا۔

انور اعظم نے وہ لفافہ بے پرواہی سے قالین پر ڈال دیا اور کلب جانے کیلئے تیاری کرنے لگا۔

"پارٹنر میرا فلسفہ تو اس وقت یہ کہتا ہے کہ کلب جانا اب جھول ہے" جمیل نے کہا

"پھر کیا کیا جائے" انور اعظم نے تجاہل عارفانہ سے کام لے کر پوچھا

"بس ذرا کھڑے کھڑے اس کرسمس کارڈ کا شکریہ ادا کرتے آئیں۔ کیا خیال ہے؟"

"خاصہ"

"تو پھر چلو"

"لیکن یہ یاد رہے مولانا کہ دادا ابا آج کل امبریور سے تشریف لائے ہوئے ہیں"

"اماں تو ہم کوئی اس کا، کیا نام آیوی کورٹ کا قبالہ لکھوانے جانے ہیں۔ بس ذرا اخلاق کا تقاضا ہے کہ کرسمس کارڈ ــــ"

"جہنم میں جائے تمہارا کرسمس کارڈ، چلو میں چلتا ہوں"

انور اعظم کی نیلی ٹوسیٹر چند لمحوں بعد اپنی روائتی برق رفتاری کے ساتھ کلائیڈ روڈ اور مال پر سے گذر کر بیرو روڈ پر آگئی۔

وہ آیوی کورٹ کے قریب پہنچ گئے۔

پھاٹک کے سامنے پہنچ کر اُس نے بیفکری سے کار روک دینی چاہی (بلکہ

اس نے اطمینان کے ساتھ سیٹی بجانے کا بھی ارادہ کیا۔ لیکن اس کے بجائے جمیل بڑے ٹھاٹھ سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے۔ چھپ چھپ کے مت دیکھو جی، بھنور جی، کی دھن میں سیٹی بجا رہا تھا) اُس نے طے کیا وہ کہے گا۔ گڈ ایوننگ مس مک گریگر۔ ہیپی نیو ایئر۔ آپ کے پیارے پپا اور جم کیسے ہیں ــــ

لیکن دفعتہً کیا ہوا کہ اس نے زور سے ایکسلریٹر دبایا اور کار آگے بڑھادی جمیل نے جب محسوس کیا کہ آبوی کورٹ کی روشن دو منزلہ عمارت اندھیرے میں پیچھے رہی جا رہی ہے تو وہ اپنی جگہ سے اچک پڑا۔" ارے بھئی۔ وہ تو ــــ تم تو آگے نکل آئے یار میرے ــــ" اس نے گھبرا کر کہا۔

"سیدھے کلب چلو" انور نے جواب دیا

"کیوں ــــ اماں یہ کیا وحشت ہے ــــ ایں ؟"

انور اعظم خاموش رہا۔

"واللہ یعنی اس کی کیا تک ہے یعنی ؟" جمیل نے انتہائی جھنجھلاہٹ کے ساتھ احتجاج کیا۔

انور اعظم نے اسی خاموشی کے ساتھ سہ راہے پر پہنچ کر مال واپس جانے کے لئے کار موڑ دی۔

اور جب وہ آبوی کورٹ کے سامنے سے دوبارہ گذر رہے تھے۔ اس وقت انہوں نے دیکھا کہ ان کی ٹوسیٹر کی سامنے کی روشنیاں اندھیرے میں ایک دوسری کار پر پڑیں جو اسی سمے وہاں پہنچی تھی اور اس میں سے اتر کر وہ شخص، سلیم، بے فکری سے رومال سے ناک چھوتا ہوا پھاٹک کے اندر چلا گیا۔ اندر جہاں سے پیانو اور گٹار کی

آوازیں آ رہی تھیں اور غالباً کیرل گائے جا رہے تھے اور روشن دریچوں میں کاغذی قندیلیں اور رنگین غبارے ہوا سے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

"غالباً یہ بھی زندگی کا ایک PHASE ہے۔ کیوں۔ استاد؟" جمیل نے بڑی شکستہ دلی کے ساتھ ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

جنوری کے سرد، تاریک آسمان پر مدھم ستارے ٹمٹما رہے تھے۔

کوئی گڑیاں یا کھچڑی یا اسی قسم کے کسی تہوار کی ایک دن کی چھٹی تھی۔ اس میں سلیم پرتاب گڈھ سے لکھنؤ آیا۔ عفران منزل پہنچ کر اس نے دیکھا۔ کہ پی چو کے سٹنگ روم میں قوم بہت ہی فکر مند شکل بنائے بیٹھی ہے۔ گنّی بوّی چوٹھے پر بہجید اہتمام سے کوکو تیار کر رہی تھی۔ ڈائمنڈ اور آو ما کسی طبّی رسالے پر جھکی ہوئی تھیں۔ اندر رخشندہ کے کمرے میں سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ "کیا قصّہ ہے بھئی۔ پی چو کہاں ہے؟" اس نے ڈائمنڈ سے پوچھا۔

"ارے ڈوک روشی بیمار پڑ گئی ہے۔ پی چو ڈاکٹر لینا دینا کر کو بلانے گیا ہے" ڈائمنڈ نے جواب دیا۔

"رخشندہ بیگم کو کیا ہو گیا؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا۔ اتنے میں پی چو آن پہنچا۔

"ارے یار تم آ گئے۔ ہم نے بیکار ہی میں ڈاکٹر لینا دینا کر کو بلایا۔ روشی بیچاری کو تھوڑا سا فلو ہو گیا ہے۔ لالہ رُخ کی دعوت سے واپسی میں اسے ٹھنڈ اور مونچھوں والے صاحب قصیدہ کی بد دعا لگ گئی۔" پی چو نے بشاشت سے اسے اطلاع دی۔

"یہ ڈاکٹر لینا دینا کر کون بزرگ ہیں؟" سلیم نے چپکے سے گنی سے دریافت کیا۔ اس نے سوچا کہ یہ بھی کوئی مرہٹی نام ہوگا۔ جیسے جیسے ٹھم ٹھم کر، بھاؤ چکا دجی گھوڑ پلٹرے، پدگاموجی وزگم پھالکے ۔۔۔ کرن نے اندر سے آواز دی "۔ ارے بھئی سلیم خاں آجاؤ بھئی ۔"

وہ رخشندہ کے کمرے میں پہلی بار داخل ہوا۔ کرن ایک آرام کرسی پر بیٹھا نیو آیرا کے لئے آئے ہوئے مضامین پڑھ کر سنا رہا تھا۔ رخشندہ چپ چاپ تکیوں کے سہارے بیٹھی چہرہ ہاتھوں پر ٹکائے غور سے سن رہی تھی اور ہنہہ ۔۔ یور بیت ۔۔ گرینڈ ۔۔ ٹرلش کہتی جا رہی تھی۔ پردوں میں سے چھنتی ہوئی روشنی میں وہ بالکل زرد نظر آ رہی تھی جس طرح میڈونا کا چہرہ قربانگاہ کی شمعوں کے دھندلے اجالے میں پراسرار اور زرد دکھائی دیتا ہے۔

"ارے ہلو ڈوک" ۔۔ رخشندہ نے بشاشت سے کہا۔

"ہلو تم نے یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے بھئی"۔ سلیم نے کہا۔ کمرے کی بے حد گھریلو اور آرام دہ فضا اسے انتہائی تکلیف دہ معلوم ہوئی۔ وہ دریچے کے نزدیک جا کر دیوان پر بیٹھ گیا۔

"ڈاکٹر لینا دینا کر آ گئے" ۔۔ پی چو نے دریچے میں سے اندر جھانک کر سب کو مطلع کیا۔

"ارے ہائے" ۔۔ گنی نے سلیم کو مخاطب کیا "بھئی ڈاکٹر صاحب پونا سے ابھی آئے ہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے یہ لکھنؤ میں تمہاری جگہ پر تھے۔ اصل میں 'لینا دینا' یہ وہ 'ڈاکٹر صاحب کا تکیہ کلام ہے۔ لہٰذا ہم نے ان کا پورا نام

لفٹنٹ کرنل کمار اپا راؤ لینا دینا کہ یہ وہ بھا بلیشوری رکھ چھوڑا ہے اور ان سے کہہ رکھا ہے کہ اب کے سے اپنے پیڈ پر بھی یہی نام مفصل چھپوا لیں گے۔ بچارے بہت اچھے آدمی ہیں۔ پر انہیں مانتے۔ رخشندہ کو تو انھوں نے بیٹی بنا رکھا ہے۔ پی چو کہتا ہے کرنل مجھے بھی بیٹا بنا لو۔ نہایت سعادت مند ثابت ہوں گا تو وہ کہتے ہیں کہ تم بیحد شیطان ہو تمہیں ہرگز بیٹا نہ بناؤں گا اور رخشندہ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اس کی شادی پر اسے کنیادان کے طور پر بہت بڑھیا بڑھیا چیزیں دیں گے"۔

ڈاکٹر صاحب اندر آئے۔ بیحد دلچسپ انسان تھے۔ کوئی بات کہہ کر چاروں طرف اس طرح دیکھتے۔ گویا داد طلب کرتے ہوں کہ کیسی رہی۔ فرمانے لگے" بس رخشندہ بیٹی اب تم بھی دوا پی جاؤ۔۔۔ دوسرا نسخہ میں لکھے دیتا ہوں اور کیا لینا دینا یہ وہ"۔۔۔ پی چو نے کہا۔" کرنل زکام تو مجھے بھی ہونے والا ہے اور اوپر سے مستقل ایک مہینے سے عشق میں مبتلا ہوں"۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے آخری بات کی بالکل سنی ان سنی کر کے جواب دیا" ہاں ہاں بھئی بالکل ٹھیک ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ مطلب یہ کہ آج کل موسم بدل رہا ہے۔ زکام کھانسی لینا دینا یہ وہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ تو کہو۔ تم نے صبح ہی مجھے فون کر دیا۔ ورنہ لینا دینا یہ وہ بڑی مشکل پڑ جاتی۔ میں اب تک ہسپتال نکل گیا ہوتا"۔

"کرنل ہمارے ایک نئے دوست سے ملو۔ آپ آج کل پرتاب گڈھ میں سول سرجنی فرماتے ہیں"۔ کرن نے سلیم کا تعارف کرایا۔

یہ سن کر ڈاکٹر صاحب کو اس قدر مسرت ہوئی۔ گویا وہ عمر بھر سے اسی مژدۂ جانفزا کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اوہو تو آپ پرتاب گڈھ میں ہیں۔ خوب خوب پھر تو

"یہ ڈاکٹر لینا دینا کر کون بزرگ ہیں؟" سلیم نے چپکے سے گنتی سے دریافت کیا۔ اس نے سوچا کہ یہ بھی کوئی مرہٹی نام ہوگا۔ جیسے جیسے ٹھم ٹھم کر، بھاؤ چکاؤ جی گھوڑ پلٹرے، پدگاموجی وزگم پھالکے — کرن نے اندر سے آواز دی۔" ارے بھئی سلیم خاں اُجاؤ بھئی —"

وہ رخشندہ کے کمرے میں پہلی بار داخل ہوا۔ کرن ایک آرام کرسی پر بیٹھا نیو آیرا کے لئے آئے ہوئے مضامین پڑھ کر سنا رہا تھا۔ رخشندہ چپ چاپ تکیوں کے سہارے بیٹھی چہرہ ہاتھوں پر ٹکائے غور سے سن رہی تھی اور ہنہم — بوریت — گرینڈ — ٹریشن کہتی جا رہی تھی۔ پردوں میں سے چھنتی ہوئی روشنی میں وہ بالکل زرد نظر آ رہی تھی جس طرح میڈونا کا چہرہ قربانگاہ کی شمعوں کے دھندلے اجالے میں پراسرار اور زرد دکھائی دیتا ہے۔

"ارے ہلو ڈوک" — رخشندہ نے بشاشت سے کہا۔

"ہلو تم نے یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے بھئی"۔ سلیم نے کہا۔ کمرے کی بے حد گھریلو اور آرام دہ فضا اسے انتہائی تکلیف دہ معلوم ہوئی۔ وہ دریچے کے نزدیک جا کر دیوان پر بیٹھ گیا۔

"ڈاکٹر لینا دینا کر آ گئے" — پی چو نے دریچے میں سے اندر جھانک کر سب کو مطلع کیا۔

"ارے ہائے" — گنتی نے سلیم کو مخاطب کیا۔ "بھئی ڈاکٹر صاحب پونا سے ابھی آئے ہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے یہ لکھنؤ میں تمہاری جگہ پر تھے۔ اصل میں 'لینا دینا' یہ وہ، ڈاکٹر صاحب کا تکیہ کلام ہے۔ لہٰذا ہم نے ان کا پورا نام

لفٹنٹ کرنل کمار اپا راؤ لیناد ینا کہ یہ وہ مہا بلیشوری رکھ چھوڑا ہے اور ان سے کہہ رکھا ہے کہ اب کے سے اپنے پیڈ پر بھی یہی نام مفصل چھپوا لیے گا۔ بچارے بہت اچھے آدمی ہیں۔ برا نہیں مانتے۔ رخشندہ کو تو انھوں نے بیٹی بنا رکھا ہے۔ پی چو کہتا ہے کرنل مجھے بھی بیٹا بنا لو۔ نہایت سعادت مند ثابت ہوں گا تو وہ کہتے ہیں کہ تم بیحد شیطان ہو تمھیں ہرگز بیٹا نہ بناؤں گا اور رخشندہ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اس کی شادی پر اسے کنیادان کے طور پر بہت بڑھیا بڑھیا چیزیں دیں گے"۔

ڈاکٹر صاحب اندر آئے۔ بیحد دلچسپ انسان تھے۔ کوئی بات کہہ کر چاروں طرف اس طرح دیکھتے۔ گویا داد طلب کرتے ہوں کہ کیسی رہی۔ فرمانے لگے "بس رخشندہ بیٹی اب تم بھی دوا پی جاؤ۔ دوسرا نسخہ میں لکھے دیتا ہوں اور کیا لینا دینا یہ وہ"۔ پی چو نے کہا "کرنل زکام تو مجھے بھی ہونے والا ہے اور اوپر سے مستقل ایک مہینے سے عشق میں مبتلا ہوں"۔ ڈاکٹر صاحب نے آخری بات کی بالکل سُنی ان سُنی کر کے جواب دیا" ہاں ہاں بھئی بالکل ٹھیک ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ مطلب یہ کہ آج کل موسم بدل رہا ہے۔ زکام کھانسی لینا دینا یہ وہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ تو کہو۔ تم نے صبح ہی مجھے فون کر دیا۔ ورنہ لینا دینا یہ وہ بڑی مشکل پڑ جاتی۔ میں اب تک ہسپتال نکل گیا ہوتا"۔

"کرنل ہمارے ایک نئے دوست سے ملو۔ آپ آج کل پرتاب گڈھ میں سول سرجنی فرماتے ہیں"۔ کرن نے سلیم کا تعارف کرایا۔

یہ سن کر ڈاکٹر صاحب کو اس قدر مسرت ہوئی۔ گویا وہ عمر بھر سے اسی مژدۂ جانفزا کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اد ہو تو آپ پرتاب گڈھ میں ہیں۔ خوب خوب پھر تو

ملنا جلنا لینا دینا یہ وہ ہوتا ہی رہے گا۔" انھوں نے سلیم سے ہاتھ ملاتے ہوئے بے حد خوشی سے کہا۔

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد کنور رانی کمرے میں آئیں۔ کرن نے کھڑے ہوکر آرام کرسی فوراً ان کے لئے مسہری کے قریب رکھدی۔ سلیم نے کنور رانی کو آج پہلی مرتبہ دیکھا۔ کنور رانی واقعی بڑی شاندار بیوی تھیں۔ کرسی پر بیٹھی اس وقت وہ بالکل اگلے وقتوں کی مہارانی معلوم ہوتی تھیں اور درخشندہ سے یقیناً بہت زیادہ حسین تھیں۔

اپنے دلکش انداز سے سر اٹھا کر کنور رانی نے کرن سے پوچھا" تم لوگن کو آج کوئی خاص کام تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں خالہ بیگم آج تو گڑیوں کی چھٹی ہے۔" ڈائمنڈ نے کہا۔

" اچھا تو تم سب دن بھر یہیں بیٹھے رہنا۔ بٹیا کا جی بہلا رہے گا۔" انھوں نے کہا۔ تھوڑی دیر کمرے میں ٹھہر کر وہ اپنے شاہانہ انداز سے اٹھیں اور پھر اندر چلی گئیں سب کی جان میں جان آئی۔

کچھ دیر بعد کرن نے سلیم سے کہا۔" بھئی اگر تم چپ چاپ مراقبے میں بیٹھے رہنے کی بجائے روشی سے باتیں کرتے رہو تو میں ذرا پلی جو کے کمرے میں جا کر دو ہاتھ ماروں"

"کیا کرلو؟" سلیم نے پوچھا

"ارے کرن کا مطلب یہ ہے کہ ذرا دو گھڑی سو لے بیچارہ۔" ڈائمنڈ نے جواب دیا سلیم کو ہنسی آگئی "تم لوگوں کی زبان اور اصطلاحیں سمجھنے کے لئے مجھے کوئی خاص ڈکشنری دیکھنی پڑے گی۔" اس نے کہا۔

"ہاں کرن بھیّا۔ تم اب جا کر آرام کرو۔ سویٹ گڈّو کل سے اپنی پریس کانفرنس کے قصّے میں تھک رہا ہے اور اب صبح سے یہاں بیٹھا بور ہو رہا ہے"۔ رخشندہ نے کہا۔ "ڈوک ضروری نہیں کہ تم باتیں کرتے رہو۔ میں بالکل نہیں اکتاؤں گی۔" اُس نے سلیم کو مخاطب کیا۔

کرن اُٹھ کر جمائیاں لیتا ہی چوکے ریڈ روم کی طرف چلا گیا۔

پھر یکایک جانے کیا ہوا کہ وہ اس تکلیف دہ کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ دوپہر کے ساڑھے بارہ بجنے والے تھے۔ ڈائمنڈ ریکارڈوں کا پروگرام اناؤنس کرنے کے لئے سائیکل اٹھا کر ریڈیو اسٹیشن بھاگ گئی۔ گنّی باہر سٹنگ روم میں بیٹھی نیو آیرا کا اڈیٹوریل لکھنے میں مشغول تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا باتیں کرے۔ بس وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے —— بہت دور چلا جائے۔ پرتاب گڈھ —— طہران —— سُماٹرا ——

رخشندہ نے پھر ایک مکمل میزبان کی حیثیت سے اس سے باتیں شروع کرنی چاہیں۔ لیکن اُس نے دیکھا کہ وہ تو جنگلی بلّے کی طرح چپ بیٹھا ہے۔

"پی چو اب تک ڈاکٹر لبنادینا کر کو پہنچا کر واپس نہیں لوٹا" —— بالآخر رخشندہ نے کہا۔

"ہم —— اب تک واپس نہیں لوٹا"۔ سلیم نے بات دہرا دی۔ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

"ارے بھئی ڈوک۔ ایک بڑے مزے کا قصہ سنو"۔ کچھ وقفے کے بعد رخشندہ نے پھر گفتگو جاری رکھنے کی سعی کی۔ "تم کل نہیں آئے۔ کل بے حد لطف آیا۔ پی چو کہیں سے ایک حیدرآبادی شاعر کو پکڑ لایا۔ وہ اپنے لئے وظیفہ حاصل کرنے کی غرض سے

میاں سے ملنا چاہتے تھے نوڈوک انہوں نے۔ ڈوک سن رہے ہو؟"

"ہاں ہاں"

"تو انہوں نے ایک سجع لکھا تھا۔ کوئی صاحب حیدر آباد کے ان کے سرپرست تھے۔ سر آسمان جاہ بشیر الدولہ۔ تو انہوں نے ان کے لئے سجع لکھا۔ "تم آسمان کی جاہ ہو سر دولہ بشیر اُلہ۔ ہم تم کو بھی دیکھا ہے"۔ بھئی ڈوک تم سن ہی نہیں رہے ہو قصہ۔"

"رخشندہ۔ رخشندہ" وہ چلا کر وہاں سے بھاگ جائے۔ اس طرح وہاں بیٹھا نہ رہے۔ جیسے وہ اتنا بیوقوف ہے۔ وہ چپ چاپ دیوان پر بیٹھا اپنی کالی پلکیں جھپکاتا رہا۔

وہ حیدر آبادی شاعر کا لطیفہ سنانے میں مصروف رہی۔

اے رخشندہ۔ تم اتنی خوبصورت۔ اتنی منقناطیسی کیوں ہو۔ تم اپنے سفید، چھوٹے چھوٹے، ایرانی بلیوں کے ایسے ہاتھ کشن پر رکھ کر اس طرح کیا کیا کہے جا رہی ہو۔ تمہاری کالی آنکھیں اپنی خاموشی میں کیا کیا سناتی رہتی ہیں۔ تم جن الف لیلوی محرابوں میں سے نکل کر آئی ہو۔ ان محرابوں، ان جھروکوں کے پیچھے کون سے اسرار پنہاں ہیں۔ جن کی وجہ سے، جن کے اثر سے تم اتنی مغرور، اتنی الگ تھلگ سب سے اتنی مختلف نظر آتی ہو۔ تم جو اتنے اخلاق سے اس حیدر آبادی شاعر کا قصہ سنا رہی ہو۔ میں اسے بالکل نہیں سننا چاہتا۔ جہنم میں جائیں تمہارے سر آسماں جاہ۔ یہ لڑکی جو اس سفید، برفیلی مسہری پر کشنوں کے سہارے لیٹی تھی۔ یہ مجسمہ جو کنوارپن کی تقدیس اور مکمل عورت پن کی الوہیت کے اس امتزاج نے تیار کیا تھا۔ یہ مجسمہ جو

صدیقہ مریم اور روبنیس ڈی میلو کا امتزاج تھا۔ یہ مریم کی سی تقدیس والی لڑکی، مریم ۔جس کی نسوانیت کے مکمل ترین تصوّر کے آگے سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لڑکی سے اُس نے صرف اتنا کہا ۔ بھئی واہ۔ بڑے دلچسپ تھے وہ صاحب۔ بڑا افسوس ہے کہ میں ان سے نہیں مل سکا۔ ورنہ ذرا تفریح رہتی۔"

رخشندہ نے دل میں کہا" افوہ اتنا بنتا ہے یہ آدمی کہ بھئی حد ہے" آخر اس نے اکتا کر گنّی کو آواز دی۔ لیکن گنّی سٹنگ روم میں مضمون لکھتے لکھتے وہیں سو چکی تھی۔

"ڈوک اگر تم بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہو تو تم بھی پی جے کے کمرے میں جا کر سہ پہر کی چائے کے وقت تک کے لئے آرام کر لو۔ ہم اکیلے میں بالکل نہیں اکتائیں گے"۔ اس نے کہا۔

"ہاں رخشندہ میرے خیال میں اب تمہیں کچھ دیر سو لینا چاہئیے"۔ اُس نے بالکل ایک مکمل ڈاکٹر کی طرح اسے پروفیشنل اور طبّی مشورہ دیا اور جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا

جب وہ غفران منزل سے جا چکا تھا تو شہلا رحمٰن رخشندہ کی مزاج پرسی کے لئے وہاں آئی اور اسے معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی اس کے آنے سے کچھ دیر قبل وہاں سے گیا ہے۔ وہ بڑی محبت اور اخلاص سے رخشندہ کے پاس بیٹھی رہی۔ لیکن رات گئے تک بھی سلیم واپس نہیں آیا۔ وہ غالباً دلکشا کلب جا چکا تھا اور شہلا رحمٰن کے گھر کا کوئی فرد بھی دلکشا کلب کا ممبر نہ تھا جو وہ بھی وہاں جا سکتی۔ کچہری روڈ کے سارے وکیل اور ایڈوکیٹ رفاہِ عام کلب جاتے تھے۔ دلکشا کلب صرف آئی۔سی۔ایس اور پی۔سی۔ایس کے سینئر عہدیداروں اور اسی قسم کے دوسرے اعلےٰ افسروں اور تعلقداروں کے لئے مخصوص تھا۔

اس دوران میں وہ رخشندہ سے کئی مرتبہ مل چکی تھی۔ اس نے کچھ عرصہ لکھنؤ میں رہ کر جو غور کیا تو اُسے معلوم ہوا تھا کہ وُہ خود بھی خوبصورت ہے اور کافی انٹلکچوئل بھی یعنی یہ دو باتیں عموماً ایک ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ اسے سیاسی اور ادبی بحثیں آرٹ اور فلسفے پر گفتگو اور اس طرح کی باتیں بہت پسند تھیں۔ وہ سوچا کرتی۔ کاش کبھی ایسا ہوتا کہ وہ مشہور اور تقریباً مشہور، قابل لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کی دلچسپ باتوں میں شریک ہوا کرتی۔ غفران منزل میں اس نے دیکھا کہ وہ مشہور شخصیتیں جن کا اس نے صرف تذکرہ سنا تھا یا ان کی کتابیں اور تصویریں دیکھی تھیں یا ریڈیو پر ان کی آواز سنی تھی۔ وہ سب یہاں جمع رہتے۔ سن شیڈز کے نیچے اور پی چو کے سٹنگ روم میں اور باغ کے درختوں تلے وہ سب کتنا اچھا وقت گذارتے۔ ان سب کی ایک برادری سی معلوم ہوتی۔ پھر یہ ارسٹوکریسی تھی۔

(رخشندہ کو یہ لڑکی پسند آئی تھی۔ اس کی تخیل پرستیاں، اس کے اشعار، اس کی زندگی کو وُہ مخصوص بیک گراؤنڈ۔ یہ سب چیزیں رخشندہ کو بہت مزیدار معلوم ہوتیں اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے لکھا ہو۔ "چاؤنا"! یا "گلاس"۔" ہولڈ ود کیئر")

پھر ایک روز شام کے وقت سہلا رحمٰن غفران منزل آئی۔ عباسی خانم نے باہر آ کر بتایا کہ رخشندہ بٹیا ابھی ہیرس کالج سے اپنی کلاسیں لے کر واپس نہیں لوٹی ہیں اور پی چو اور پُو لو بھیا بھی کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ رخشندہ کا انفلوئنزا ٹھیک ہو گیا تھا اور وہ پھر اپنے مشغلوں میں مصروف ہو چکی تھی۔ غفران منزل کے باغ پر سورج ہمیشہ کی طرح ایک ہی سے دنوں پر طلوع ہو رہا تھا۔ وہ واپس چلی جاتی لیکن

بہت سہانا وقت تھا۔ ڈرائیو پر اندھیرا چھا رہا تھا اور پی چو کے سٹنگ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ وہیں بیٹھ کر ان سب کا انتظار کرنے لگی۔

وہاں بیٹھے بیٹھے اس کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں۔ شام کے جھٹپٹے میں یہ الف لیلے ایسا محل اپنے سپنوں میں کھویا ہوا بڑا اسندر لگ رہا تھا۔ امریکن جاز کا ایک نغمہ اُسے یاد آیا۔ میرے پاس حسن ہے۔ میرے پاس دولت ہے۔ مجھے اور کیا چاہیئے۔ مجھے اور کیا۔

برساتی میں ایک کار آکر رکی اور وہ آن پہنچا۔

وہ ہفتے میں ایک دو بار ہمیشہ زعفران منزل آتا تھا۔ وہ طے کر لیتا تھا کہ اب کے سے وہ ہرگز وہاں نہ آئے گا۔ آگ کے ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھے گا۔ اس کے قریب بیٹھے گا بھی نہیں۔ لیکن ایسا ہوتا تھا کہ آٹھ دن نہ گذرنے پاتے تھے کہ انہیں بھاری دبیز پردوں، مخملیں کشنوں نیز سُرخ گلاب کے شگوفوں اور اسٹو پر سے اٹھتی ہوئی قہوے کی بھاپ کے انتہائی تکلیف دہ ماحول میں اپنے آپ کو پھر موجود پاتا تھا۔ وہ اسی طرح اخلاق کی گفتگو میں مصروف رہتی پی چو اور کرن اسی طرح قہقہے لگاتے۔ رڈائمنڈ اسی طرح تازہ ترین فلموں کے گیت پیانو پہ بجاتی۔

ایک نئی لڑکی کو دیوان پر انڈین لسر کے ورق پلٹتے دیکھ کر وہ ایک لحظے کے لئے سٹنگ روم کے دروازے میں ٹھٹھکا

"اوہ — اوہ — آئیے" نہایت شدت سے شہلا رحمٰن نے محسوس کیا کہ اب یقیناً کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔ وہ لمحہ بالآخر آن پہنچا جس کی یاد اسے غالباً

جنم بھر سناٹے گی" رہیں ۔ میں شہلا رحمٰن ہوں"۔ اُس نے ذرا جھجک کر کہا۔

"جی ۔ مجھے معلوم ہے"۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔" سالِ نو پر میں آپ کو لالہ رُخ میں دیکھ چکا ہوں"۔

"آپ تشریف رکھئے ۔ رخشندہ بیگم اور سب لوگ ابھی آتے ہی ہوں گے"۔ لیکن اس کے کہنے سے پہلے ہی وہ اندر آکر وہ اپنے مخصوص صوفے پر اطمینان سے بیٹھ چکا تھا شکر کہ اس نے مجھے کہیں اور مثلاً گھر کے اس کمرے میں نہیں دیکھا ۔ جسے چچی بیگم بڑے ارمانوں سے ڈرائینگ روم پکارتی ہیں یہ پس منظر بہت ہی ٹھیک تھا دیواروں پر روغنی تصویروں کے نقوش اندھیرے میں مبہم ہوتے جا رہے تھے۔ باہر باغ میں شام کی ہوا یوکلپٹس کی ٹہنیوں میں سرسرا رہی تھی۔ آتشدان کے مصنوعی کوئلے ہیٹر کی روشنی میں جگمگا رہے تھے"۔ سلگتے، سنسناتے تاروں کے نیچے ۔" اُس نے اپنے ذہن میں لکھنا شروع کیا۔

"کیا آپ رخشندہ بیگم کے ساتھ پڑھتی ہیں؟" کمرے میں صرف دیوار کی ایک روشنی مدھم سا اجالا بکھیر رہی تھی۔ سلیم نے بے تکلفی سے اٹھ کر اسٹینڈرڈ لیمپ روشن کر دیا اور اپنی جگہ پر واپس جا کر بیٹھنے کے بعد ظاہر تھا کہ محض کوئی بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"جی نہیں"۔ بات وہیں ختم ہو جاتی۔ اس لئے اس نے فوراً آگے کہنا شروع کیا۔" ہم دونوں کالج میں کبھی اکٹھے نہیں رہے ۔ لیکن اتفاق سے رخشندہ کے اور میرے مذاق قریب قریب بالکل یکساں ہیں"۔

"واقعی"۔ اُس نے پھر پائپ منہ میں رکھ لیا۔

"رخشندہ کو مجھ سے ملتے بہت کم عرصہ گذرا ہے۔ لیکن ہم نے ڈسکور کیا ہے کہ اسے بھی وہی چیزیں پسند ہیں جو مجھے اچھی لگتی ہیں اور پائدار دوستی کے لئے ہم مذاقی ظاہر کی ہے کہ کتنی ضروری ہے"۔

"جی ہاں۔ ظاہر ہے"۔

"مثلاً رخشندہ موسیقی پر جان دیتی ہے اور مجھے بھی موسیقی بے حد پسند ہے"۔

"خوب"۔

"لیکن مغربی کلاسیکل موسیقی سے مجھے کوئی شغف نہیں جس پر رخشندہ مرتی ہے اور انگریزی میوزک ہال کی چیزیں پسند کرنا ہب کے نزدیک صریحاً بدمذاقی ہے"۔

"جی ہاں۔ یہ تو ہے ہی"۔

"دیکھئے نا ڈاکٹر صاحب۔ دراصل جب تک ہم اس مخصوص بیک گراؤنڈ، ایک بالکل اجنبی قوم کے تمدنی پس منظر سے کسی قسم کی فطری ہم آہنگی نہ رکھتے ہوں"۔— اس نے ہاتھ ایک خاص خوبصورت انداز سے ہلا کر کہنا شروع کیا۔

وہ خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ بڑی بکواسی لونڈیا ہے۔ جانے کیا کیا کہے جا رہی ہے۔ تمدنی پس منظر سے فطری ہم آہنگی۔ وہ بڑی کوشش سے منہ سے پائپ ہٹا کہ جی ہاں واقعی، قطعی، میرا بھی یہی خیال ہے۔ کہتا رہا۔

یہ عجیب انسان جس کی کالی لانبی پلکیں اس کی سوتی سوتی آنکھوں پر کس بے پرواہی سے جھکی رہتی تھیں۔ درحقیقت اس کے اتنے قریب بیٹھا تھا اور وہ اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ انتی انٹلکچوئیل گفتگو جاری رکھنے کا یہ بہترین وقت تھا۔ پھر رخشندہ اور اس کی سہیلیاں آجائیں گی۔ شور مچنا شروع ہوگا۔ اور وہ لازمی طور پر بیک گراؤنڈ

میں چلی جائے گی۔ چنانچہ اس نے اسی خوبصورت، اور پولشڈ انداز میں باتیں جاری رکھتے ہوئے پوچھا: "آپ نے نیو آیرا میں غالباً اب تک کچھ نہیں لکھا؟"

"نیو آیرا میں؟" وہ اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔ "جی نہیں"۔ اس نے جواب دیا

"آپ نے اس کا کوئی پرچہ بھی غالباً اب تک نہیں دیکھا؟ یہ انگریزی رسالہ ہم لوگوں نے ترقی پسند مقاصد سامنے رکھ کر پچھلے دو سال سے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ دراصل یہ رخشندہ کی 'بولی' ہے"۔ وہ صرف ایک، ڈیڑھ مہینہ قبل لکھنؤ آئی تھی۔ لیکن اس نے اس طرح اس بے ساختگی اور بے پرواہی سے ذکر کیا کہ "ہم لوگوں نے پچھلے دو سال سے یہ رسالہ شائع کرنا شروع کیا ہے"۔ گویا وہ ہمیشہ سے غفران منزل والوں کے سٹ میں شامل رہی ہے۔

"بہت نفیس رسالہ ہے۔ رخشندہ اور رکہ۔ ن کے کہنے پر اس کے پہلے ہی پرچے میں پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی، ڈاکٹر علیم، پروفیسر رادھا کمل مکرجی وغیرہ نے مضامین دئے تھے"۔ وہ کہتی گئی۔ ان باتوں کا تذکرہ اس نے رسالے کے پہلے اڈیٹوریل میں پڑھا تھا۔

"جی۔ بہت ہی نفیس رسالہ ہے۔ میں ضرور اس کو پڑھا کروں گا"۔

"آپ پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی سے ملے ہیں؟ بیورلی نکلس نے اپنی "ورڈکٹ اون انڈیا" میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں اسے صرف ایک انٹیلکچوئیل نظر آیا۔ اور وہ ہے پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی"۔

"اچھا واقعی؟ ــــ غالباً آپ بھی تو انگریزی میں شاعری کرتی ہیں"۔ اس نے کچھ دیر بعد گھڑی پر نظر ڈال کر کہا (رخشندہ اور پی جو آ ہی نہیں چکتے۔ اس نے دل میں سوچا)

اس کا دل دھڑک اٹھا۔ دوسرے لمحظے، سنبھل کر وہ بے حد اخلاقاً ہنسی۔ "جی ہاں میری کچھ نظمیں بمبئی کرانیکل اور ٹرینڈ وغیرہ میں شائع ہو چکی تھیں تو کرن نے کہا کہ تم ہمارے پرچے کے لئے بھی کچھ ضرور لکھو۔" اس نے محسوس کیا کہ وہ بمبئی کرانیکل کی بجائے پنگوئین نیو رائیٹنگ کا نام بھی لے دیتی تو وہ بالکل متاثر ہوئے بغیر اسی طرح بیٹھا پائپ پیتا رہتا۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ وہ ساری کا آنچل اپنے گرد لپیٹتے ہوئے دیوان پر سے اٹھی گیلری میں گئی اور میز پر ایک خاص انداز سے جھک کر ریسیور اٹھایا۔ چھتر منزل کلب سے کسی نے پی چہ کو رنگ کیا تھا۔ فون پر بات کرتے ہوئے دفعتہً اس نے محسوس کیا کہ اس انداز میں ایک ہاتھ میں ریسیور اٹھا کر سر ذرا ایک طرف کو نیہوڑائے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ لیکن ہیٹ ریک کا آئینہ وہاں سے بہت دور تھا اور دوسرے سرے پر بات ختم کی جا چکی تھی۔

جب وہ سٹنگ روم میں واپس آئی۔ اس وقت تک اپنے دوستوں کا انتظار کرتے کرتے اکتا کر وہ باہر برآمدے میں جا کھڑا ہوا تھا۔

ہندوستانی موسیقی کی بھٹکنڈے یونیورسٹی میں شام کا وقت بہت دلچسپ ہوتا ہے قیصر باغ کے وسیع، ہرے گھاس کے قطعوں کے پرے، نواب سعادت علی خاں اور ان کی بیگم کے پرانے، خاک بوس سیاہ گنبدوں والے مقبروں کے سہلٹ کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں آسمان کو گلرنگ کر دیتی ہیں۔ کالج کی عمارت کے چاروں طرف بکھرے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیوں کی مدھم آوازیں اور موسیقی کی لرزا

گونج لحظہ بہ لحظہ اونچی ہوتی جاتی ہے اور بہت سے سازوں، بہت سے راگوں کی
آوازیں مل جل کر فضا میں پھیل جاتی ہیں اور عمارت کے برآمدوں میں کھڑے ہوئے
پرانے مجسمے چپ چاپ اپنی بے نور آنکھیں جھپکتے ہوئے ان پر اسرار آوازوں کو سنتے
رہتے ہیں۔ اس وقت وہاں پر ایک ایسا سکوت لرزتا ہے جو لگتا ہے۔ زرا سا گہرا سانس
بھی لینے سے دفعتہً منتشر ہو جائے گا۔

وہ اسی سحر انگیز سکوت کے زیر اثر چاندنی پر ایک گاؤ تکئے کے سہارے بیٹھی اگلے
پیریڈ کا انتظار کر رہی تھی۔ کلاس روم خالی پڑا تھا۔ برابر کے کمرے میں کتھا کلی کی کلاس
ہو رہی تھی۔ تارا دھی ری نا دھیم — ترنیہ کے بول مدھم سروں میں ایک ہی لے
کے ساتھ دہرائے جا رہے تھے۔ اس کی فورتھ ائیر کی لڑکیاں باہر جا چکی تھیں اور
پانچویں سال کی لڑکیوں کے پیریڈ میں ابھی وقفہ تھا۔ تان پورہ اس کے سامنے
اوندھا پڑا تھا۔ لیکن اگلی کلاس کے لئے اسے ٹیون کرنے کی غرض سے وہ اس کے
تاروں پر انگلی نہ پھیر سکی۔ ارے جنے میں کیسی سنگیت وشارد ہوں۔ باؤلی سی۔ دوسروں
کو دیوتاؤں کے راگ سکھاتی اور سمجھاتی ہوں اور خود ایک انسان کے کنول نینوں
کے راگ نہیں سمجھ پاتی۔ ان کی گمبھیرتا نہیں سہہ سکتی — اتنے دنوں بعد اس وقت
اسے دفعتہً ایک بات کا پتہ چلا تھا۔ وہ اس حقیقت کا سامنا کرنے کے لئے تیار
نہیں تھی۔ لیکن بہر حال، یہ حقیقت تھی۔ وہ اس آدمی سے خوفزدہ ہے۔ اس سے
بھاگنا چاہتی ہے — کانونٹ سکولوں کے پڑھے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں میں
وہ Sex Consciousness نہیں ہوتی جو عموماً سب لڑکوں اور
لڑکیوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ لڑکپن سے اپنے بھائیوں کے دوستوں کے ساتھ

کھیلتی کودتی آئی تھی۔ بڑی ہو کر اسے کرن، وِمل اور حفیظ احمد کے ایسے دوست ملے تھے۔ سوسائٹی میں وہ بڑے اطمینان سے سب سے ملتی جلتی تھی۔ غفران منزل کی روایات نے اسے ہمیشہ بتایا تھا۔ یوں کرنا چاہیئے یوں نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن جب وہ اس کے سامنے آتا تو غفران منزل اور کرواہاراج کی روایات کا سارا اثر کنور عرفان علی خاں کی تربیت کی پیدا کی ہوئی "خود اعتمادی" اور "بھروسہ" اور "یقین" ایکدم جانے کہاں کو غائب ہو جاتا۔ اس کے من میں دبکا ہوا شریر اچکا چپکے سے کہتا رخشندہ بیگم۔ ایسا ہی ہوگا۔ تم تو زندگی سے کبھی بھی فارغ نہیں ہو سکتیں۔ وہ اس سے بہت دور بھاگ جانا چاہتی۔ وہ اسے کلب میں ملتا۔ وہ موقعہ ملتے ہی دوسرے گروپ میں جا شامل ہوتی۔ ٹینس یا بیڈمنٹن میں بھی وہ شریک ہوتا تو وہ فوراً کسی نہ کسی طرح کھیل سے ہار کر علیحدہ ہو جاتی۔ وہ اس کی مزاج پرسی کے لئے آتا۔ وہ بڑے زور شور سے حیدرآبادی شاعروں کے اور اسی طرح کے اوٹ پٹانگ لطیفے سنانا شروع کر دیتی۔ اتوار کے روز وہ غفران منزل کی پارٹیوں میں شامل ہوتا۔ وہ اندر جا کر کنور رانی کے کسی کام میں بڑی سعادت مندی سے مشغول ہو جاتی۔ اگر پکچرز میں اس کے قریب بیٹھا ہوتا۔ وہ فوراً کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس سے معذرت چاہنے کے بعد کسی دوسری قطار میں بیٹھے ہوئے دوستوں کے پاس چلی جاتی۔ کرن نے بڑی فکر مندی کے ساتھ سوچا تھا۔ روشی کو بھگوان جانے کیا ہو گیا ہے۔ بالکل جنگلی بلی ہوتی جا رہی ہے۔ پرنسپل رتن جھنگھن کے اصرار پر وہ پچھلے سال سے میرس کالج میں جسے اب یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ ہفتے میں تین چار مرتبہ موسیقی کی کلاسیں لے رہی تھی۔ پہلے وہ کبھی کبھی کاہلی کر جاتی تھی۔ لیکن اب وہ بلاناغہ

ایک مکمل پروفیسر کی طرح اپنے فرض کے شدید احساس کے ساتھ کالج آنے لگی تھی۔ اس طرح وہ کچھ عرصہ اس ہجوم سے الگ رہ سکتی تھی جس میں وہ لازمی طور پر شامل ہوتا تھا

اس نے کلاس روم کے دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ آئیوی کی بیل دیوار سے چمٹ کر اوپر تک پھیل گئی اور اس پر گومتی میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ کرنیں بکھر رہی تھیں۔ آئیوی، نازک، خوبصورت، تھکی ہوئی بے خواب آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی، کسی چیز کا سہارا ڈھونڈنے والی۔ لیکن جس جگہ سے چمٹ جاتی ہے۔ مرجھائے بغیر اس سے نہیں چھٹ سکتی۔

اس نے آخری گھنٹہ ختم کیا ہی تھا کہ ایک لڑکی نے آکر اس سے کہا۔ "روشنی دیدی۔ آپ کو لینے کے لئے کوئی آیا ہے۔" شاید پی چو یا کرن ہو گا۔ اس نے سوچا طویل گیلریاں طے کر کے، جن میں پرانے میوزیم کے مجسمے دو رویہ استادہ تھے اور اپنی پھٹی پھٹی ویران آنکھوں سے اس لڑکی کے رنجیدہ چہرے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ باہر آئی۔

سڑک کی دوسری طرف 'اودھ جم خانہ' کے سامنے ایک برگد کے نیچے کار کھڑی کر کے وہ میرس کالج کی کہرے میں چھپی ہوئی عمارت کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا یہ لڑکی ہر جگہ، ہر مجمع میں، ہر موقعے پر، کتنی ہر دلعزیز، پر کشش اور ممتاز نظر آتی ہے۔ وہ خدائے رقص کے پرانے معبدوں کی دیو داسی کی طرح سفید ساری میں جیسے موسیقی کی لہروں پر بہتی اس کی طرف بڑھ رہی تھی اور گھاس کے قطعے پر سے گذرتے ہوئے طالب علموں کی ٹولیاں اسے 'نومشکار' اور 'نمستے' کہتی جا رہی تھیں۔

"ارے ہلو ڈوک۔ تم کیسے آ گئے۔" اس نے دھند لکے میں سے نکل کر کار کے

قریب پہنچتے ہوئے اسی شگفتگی اور اخلاق سے پوچھا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں۔
"بھئی میں غفران منزل میں تم سب کا انتظار کرتے کرتے اکتا گیا رہا ہوں پھر مجھے خیال آیا میں تمہیں یہیں سے لیتا چلوں۔ پی چو تو اب تک کلب پہنچ گیا ہوگا۔ آٹھ بجے سے ٹورنامنٹ کے فائنلز شروع ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کرسٹابل نے واک اوور دے دیا ہے"۔ اس نے بھی اسی طرح کہا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں اور کار کا دروازہ کھول دیا۔ وہ اس کے برابر آبیٹھی۔

وہ دفعتہً پھر خاموش ہو گیا چپ چاپ وہ دونوں مال کے جگمگاتے ہجوم میں سے گذرتے چھاؤنی کے خاموش راستے پر پہنچ گئے۔ محمد باغ کلب کی برساتی میں داخل ہوتے ہی کار سے اتر کر اور اس کے لئے دروازہ کھول دینے کے بعد وہ اس سے معذرت چاہ کر جلدی سے اندر چلا گیا۔ وہ برآمدے ہی میں رہ گئی۔
"آج کل گیلنٹری تو دنیا میں ناپید ہو گئی ہے"۔ رگنی نے اس کے قریب آکر ہنستے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ہال کی طرف چلی گئیں۔

تو کیا اسے بھی اس کا احساس تھا۔ کیا وہ بھی اس سے بھاگتا تھا۔ او خدا۔ کتنی مضحکہ خیز بات تھی۔ وہ نہایت تندہی سے "پک اپ" اور "گرینڈ" اور "ماروِلس" چلاتی رہی اور بہت دیر تک ہال کے کنارے بیٹھی کھیل دیکھتی رہی۔

اور وہ جو کہا کرتا تھا کہ عشق کرنا بھی ذرا دلچسپ قسم کے ان ڈور گیمز میں سے ہے۔ جب بارش کے موسم میں ٹینس نہ کھیلا جا سکے یا جاڑے کی وجہ سے سوئمنگ پول میں کودنے کی ہمت نہ ہو یا اخبار پڑھتے پڑھتے جی اکتا جائے تو دفع الوقتی کے لحاظ سے خوب تفریح رہتی ہے۔ وہ ایک دم بہت شدت سے گھبرا گیا۔ اور

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرے۔

رات گئے، کھیل کے اختتام پر، جب ہال کی تیز آرک لائیٹس بجھ گئیں اور سب لوگ باہر نکلے تو پی چو نے مجمع میں سے کودتے پھاندتے اس کے قریب آکر کہا "یار ڈوک بھولنا مت، کل زینت آپا اپنی چوبیسویں سالگرہ کی دعوت کر رہی ہیں" بڑا زبردست قہقہہ پڑا۔ مجمع رفتہ رفتہ منتشر ہونے لگا۔

برساتی میں سے نکلتے ہوئے کرن نے کہا "روشی کل زینت آپا کے ہاں بڑا بھاری "چاء پانی" ہے۔ چلتے چلتے ڈوک کو خصوصیت سے مدعو کر گئی ہیں"

"ارے ہائے"۔ گنی بے اختیار چلائی

"کیوں"؟ پی چو نے کان کھڑے کئے۔

"اب آئی دکھیا مارے کی شامت"۔ ڈائمنڈ نے کہا۔

"زینت آپا نے توڑی سر پہ قیامت زورِ قیامت کیا کہئے"۔ رخشندہ شہلا رحمٰن کی صحبت میں رہ کر بڑی طبعِ موزوں کی مالک ہوتی جا رہی تھی۔ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ کے غل غپاڑے میں دو گھنٹے گذار کر، میرس کالج کے خاموش کلاس روم میں اس پر فلسفے کی جو موڈ سوار ہوئی تھی۔ وہ کب کی ہوا ہو چکی تھی۔

"کیوں تم سب اتنی بے مروتی دکھا رہی ہو۔ کیا زینت آپا کو حق نہیں پہنچتا کہ اسے چاء ہی پر بلائیں کم از کم"۔ پی چو نے لڑکیوں کے ساتھ ساتھ کلب کی سڑک پر چلتے ہوئے کہا۔

"اس کم از کم کی تعریف نہیں کی جاسکتی"! ڈائمنڈ بولی

"تم سب کی سب بس جلی جاتی ہو ہماری زینت آپا سے" کرن نے کہا۔

"اور بھی قابل غور نکتہ یہ ہے کہ ہم خاکساروں کو نہیں بلایا گیا"۔ رخشندہ نے کہا۔
"منہ دھو رکھو۔ شرافت کے مجمعوں میں تم سب کو کون بلائے گا ہلڑ مچانے کیلئے
وہاں سب بڑے بڑے سنجیدہ قسم کے لوگ ہوں گے۔ تم سب جہاں بیٹھتی ہو اپنی
الٹی سیدھی بحثوں کے مارے سب کا ناک میں دم کر دیتی ہو"۔ پی چو بولا۔
"جی ہاں۔ بڑا شرافت کا مجمع ہوگا۔ ایک زینت آپا کے دوست وہ آپکے
برجیندر کمار روہت ہیں۔ کیا زوردار شاعری کرتے ہیں کہ پچھلے ہفتے زینت آپا
کے اس زبردست سیٹرڈے کلب کے مشاعرے میں فرمانے لگے ــــ

ہماری خودی کا جلوہ جواں تھا بزم جہاں سے پہلے
مگر یہ نازک مزاج بجلی ٹھہر گئی آشیاں سے پہلے

میں نے بہت دیر تک غور کرنے کے بعد ان سے اس کا مطلب پوچھا۔ تو
ارشاد کیا کہ یہ آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ یہ اسٹیفن اسپنڈر اور لوئی مک نیس کے اسکول
کی شاعری ہے ــ رخشندہ نے جل کر کہا" اور ایک وہ ہیں۔ ڈاکٹر سکسینہ ــ"
"ارے ہائے زینت آپا"۔ ڈائمنڈ نے مستقبل کی ممکنات کا خیال کر کے
ایک سرد آہ بھری۔ دوسرے لمحے زینت ریاض اپنے دوستوں کو چھیڑ لو" کتنی شعلے
کی لپک سی طرح برساتی ہیں سے گذر گئیں اور اپنے پیچھے پیرس کی شام کی لپٹیں بکھیرتی گئیں
زینت ریاض اس قدر بے تحاشا میک اپ کرتی تھیں کہ کسی طرح چونتیس سال
چار ماہ کی نظر نہ آئیں مگر کیا کیا جاتا کہ کمبخت لونڈے جانتے تھے کہ جب وہ اسلامیہ سکول
کی آٹھویں کلاس میں پڑھتے تھے اور گومتی گراونڈز میں آکر فٹ بال کھیلا کرتے تھے
اس وقت آپ یونیورسٹی میں ایم۔ اے فرما رہی تھیں اور اب چلی تھیں کم عمر لڑکیوں

سے "کمپٹی شن" کرنے۔ ارے بھائی کوئی ایک آدھ پنتالیس ایک برس کا آدمی پکڑ کر شادی کر لو۔ وہ ٹھیک رہے گا۔ ہماری طرف سے تو امید کم ہی رکھو۔ لیکن زینت ریاض سوسائٹی میں بہت ہردلعزیز اور ہر چیز میں پیش پیش تھیں۔ آج کونسل چیمبر میں نظر آرہی ہیں۔ کل گورنمنٹ ہاؤس میں رونق افروز ہیں۔ بہت سے بھائی بنا رکھے تھے۔ کوئی موٹر چلانا سکھاتا تھا۔ کوئی بال روم ڈانس کا استاد تھا۔

"یہ ساری اولڈ میڈز والی سائیکولوجی ہے۔" انہیں سڑک پر سے گزرتا دیکھ کے کرن نے بڑے مفکرانہ انداز میں کہا۔ وہ اور پی چو کار لانے کے لئے آگے چلے گئے۔

"جبھی تو کہتی ہوں بچیو کہ تم سب جلدی سے شادی کر لو۔ ورنہ یہی سب گڑبڑ سڑبڑ رہے گی آخر میں۔" گنی نے بھی بہت فلسفیانہ طریقے سے کہا

"اب مثلاً لفٹین جہانگیر قدر جو تھا غریب۔" ڈائمنڈ نے تجویز کیا

"اے وہ تو ریزرو فورس میں ہیں۔" اوما نے اطمینان دلایا

"مگر ایک بات ہے۔" رخشندہ نے کہا "جو بھی کہو زینت آپا کے ارادے اس قدر بلند ہیں کہ کوئی ڈھنگ کا لڑکا پکڑا ہی جائے گا۔ دیکھ لینا۔ خدا کی قسم یہی ہوگا۔"

پی چو کار لے کر آگیا اور وہ سب اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

ومینز اکیڈمی کی پرنسپل مس زینت ریاض (ایم اے ایل ٹی ایل ایل بی) کے ڈرائینگ روم میں بے حد تاریخی نشستیں ہوتی تھیں۔ یونیورسٹی کے چند ولایت پلٹ پروفیسر جنہیں شام کے وقت دنیا میں کوئی اور کام نہ ہوتا تھا۔ یا جن کی ولایت پلٹ بیویاں انہیں طلاق دے چکی تھیں اور بہت سے لوگ جنہیں کوئی اور ٹھکانے

کا مشغلہ نہ سوجھتا تھا۔ ہفتے کی شام کو مس ریاض کے ڈرائینگ روم میں جمع ہوجاتے تھے۔ ان نشستوں کا نام تکلفاً بیسٹرڈ ے کلب رکھ دیا گیا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ ادبی اور انٹلکچوئیل قسم کی گفتگو جب آدھ گھنٹے سے زیادہ گھسٹنی بڑی دشوار ہوجاتی تو پھر نارمل قسم کی باتیں شروع ہوتیں۔ مس ریاض اور ان کی سہیلیاں گراموفون، وائلن یا پیانو سے شغل فرماتیں۔ قہوے اور برج کا دور چلتا۔ اکثر یہ نشستیں کسی اور ممبر کے گھر پر یا کافی ہاؤس میں منعقد کی جاتیں۔ کرن اور رومل بھی کبھی کبھی تفریحاً پہنچ جاتے۔ پی چوبھی ایک مرتبہ پکڑا گیا تھا۔ لیکن آدھ گھنٹے بعد ہی اپنی جان بچاکر بھاگ آیا۔ مسعود، اور برجلیند رکمار روہت، ڈاکٹر سکسینہ اور یونیورسٹی کے انگلش اور فلاسفی ڈپارٹمنٹ کے چند پروفیسر کلب کے خاص ممبر تھے۔ ایک بار کرن رخشندہ کو گھسیٹ کر لے گیا تھا کہ چلو ان لوگوں کا نفسیاتی مطالعہ کرنے میں بڑا مزا آئے گا۔ "جہنم میں جائے تمہارا نفسیاتی مطالعہ۔ یہ سب ادھیڑ ادھیڑ عمروں کے شادی شدہ لوگ جو بیٹھے ایک دوسرے سے فلرٹ کر رہے تھے۔ اسی کا نام 'انٹلکچوئیل' اور 'ادبی نشست' ہے؟" رخشندہ نے جل کر کہا تھا

اور اب زینت آپا نے سلیم کو مدعو کیا تھا۔ زینت آپا کے دو تین بھائی صاحب تھے۔ کچھ محض بھائی فلاں اور بھائی فلاں تھے۔ چند ایک کو بہت پیار اور اپنائیت سے بھیّا پکارتی تھیں اور جن لوگوں سے مستقبل قریب یا بعید میں کچھ خوش آیند ممکنات کا تصوّر وابستہ تھا۔ وہ محض ڈاکٹر فلاں یا مسٹر فلاں یا بے حد بے تکلفی اور محبت سے محض نام لے کر مخاطب کئے جاتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے محمد باغ کلب سے واپس جاکر سلیم کو فون کیا کہ ہلو میجر —— بھئی آپ کو کل شام

کو ضرور آنا پڑے گا۔ ورنہ میں بے حد خفا ہو جاؤں گی تو اس نے فی الفور یہ عرض کی کہ بدقسمتی سے شہر میں یکایک نمونیہ کی وبا پھیل گئی ہے اور اس کی وجہ سے اسے رات گئے تک فرصت نہیں ملتی۔ زبینت آپا نے کہا۔ ارے پھر کیا ہے۔ میں آپ کو چھ بجے تک ہسپتال ہی میں کار بھیج دوں گی اور یہاں پر اس عذر کا سوال بھی پیدا نہ ہو سکا کہ میری موٹر خراب ہے۔

وہ چائے کے دوران میں حسب معمول زیادہ تر خاموش رہا۔ حمیدہ تنویر اس کے قریب بیٹھی تھی۔ حمیدہ تنویر افسانے لکھتی تھیں اور ناک میں بولتی تھیں۔ جانے کیوں اور کہاں سے افسانے لکھنے کا خبط سوار ہو گیا تھا۔ ان کی چند کہانیاں رسالوں میں شائع ہو چکی تھیں۔ ایک مشہور افسانہ نگار سے جس کے حسن اور شولڈری کے بہت شہرے تھے۔ غائبانہ عشق فرما رہی تھیں اور اپنے ہر افسانے کا ہیرو اسی کو بناتی تھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی جانے کس نے ان کو بتا دیا کہ یہ کالی، فتنہ انگیز آنکھوں والا تازہ وارد مہمان انگریزی کا بہت مشہور ادیب ہے۔ لہٰذا چائے کے دوران میں ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "ہم نئے ہندوستان کے نوجوان ادیب۔"

وہ چپکا بیٹھا سنتا رہا۔ یہاں پر تو ٹیلنٹ ہی ٹیلنٹ نظر آتا ہے۔ اس نے سوچا کل ان صاحبزادی نے جو انگریزی شاعری پر کرم فرماتی ہیں۔ تمدنی پس منظر کی فطری ہم آہنگی پر تقریر کی۔ نئے ہندوستان کی ایک نوجوان ادیب یہاں پیدا ہو گئیں۔ یہ جو سامنے سے بال بکھرائے سفید ساری پہنے ایک لڑکی چلی آرہی ہے۔ یہ اب یقیناً بنگو رپر لیکچر پلائے گی۔

بڑا ٹریجک منظر وہ ہوتا ہے جب یہ خوبصورت عورتیں اپنی ہلکی پھلکی بے معنی سوسائٹی کی گفتگو چھوڑ کر "انٹلکچوئیل" باتیں کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جب وہ پکاسو جیمز جوائس یا نئے ہندی یا اردو ادب پر تنقید کرنا چاہتی ہیں۔ جب وہ بے حد شیریں آواز میں پوچھتی ہیں "آپ نے یشپال کی نئی کہانی پڑھی؟"

چاروں طرف بڑی زوروں سے انٹلکچوئیل گفتگو جاری تھی۔ ملک کے اقتصادی مسائل اور عالمگیر سیاست اور نہرو خاندان کی پولیٹکس کا تذکرہ تھا۔ زینت آپا نے سینڈوچز کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے اسے مطلع کیا کہ مسز وجے لکشمی پنڈت میری بہت گہری دوست ہیں۔ آج اس پارٹی میں نہیں آسکیں۔ کیونکہ انہیں صبح صبح ہی کسی کام سے نیویارک جانا پڑ گیا۔ اگلی مرتبہ ان سے ضرور آپ کو ملواؤں گی۔ سلیم نے ظاہر کیا۔ گویا واقعہ یہ ہے کہ یہ معلوم کر کے اس پر سخت رعب پڑا ہے۔

"چندر لیکھا پنڈت سے تو آپ رخشندہ کے ہاں ضرور ملے ہوں گے؟" انہوں نے دریافت کیا۔

افسوس کہ اب تک وہ چندر لیکھا پنڈت سے نہ ملا تھا۔ "وہ بھی میری بہت گہری دوست ہے۔" زینت آپا نے بتایا

دوسری طرف ڈاکٹر وجے بہادر سکسینہ شہلا رحمٰن سے فرما رہے تھے۔ دراصل الگزینڈر پوپ کا منتہائے نظر صرف یہ تھا کہ اٹلی کی نیو کلاسسزم کے بنیادی اصول ــــ (کس قدر کلاسیکل گفتگو تھی) ــــ جب چائے ختم ہوئی تو وہ حمیدہ تنویر سے اجازت لے کر دوسرے گروپ میں جا کر شامل ہو گیا۔

"راجہ ہوں میں قوم کا اور اندر میرا نام۔" کرن نے اس کی طرف آتے ہوئے

چپکے سے کہا۔ اسے ہنسی آگئی۔ وہ دونوں باہر برآمدے میں آگئے۔

"ارے او میاں شہزادے گلفام — بات تو سنو" وِمل نے اس کے پاس آکر کہا۔ "بھئی جب سے تم یہاں آئے ہو تمہارے چاروں طرف بس لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آرہی ہیں۔"

"جب تک اسمبلی میں اس مسئلے پر سوال نہ اٹھایا جائے صورتِ حال پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔" چودھری شمیم نے فرمایا اور خود ہی ہنسنے لگے۔ گویا بڑی لطیفے کی بات کہی ہے۔

جس وقت وہ اپنی کار کی طرف جارہا تھا۔ اس نے دو بزرگوں کو باغ کی سڑک پر ٹہلتے ہوئے کلچر کے مسائل پر روشنی ڈالتے سنا۔ "کلچر بھائی جان، بیک گراؤنڈ، ایٹ موسفیر — یہ چیزیں جناب صرف بٹلر پیلیس یا پیر پور ہاؤس یا عفران منزل میں نظر آتی ہیں — دراصل —"

عفران منزل، عفران منزل، عفران منزل۔ اسے کہیں تھوڑی دیر کے لئے بھی عفران منزل سے فرار میسّر نہیں تھا۔ پارٹی ختم ہو چکی تھی۔ زینت آپا، حمیدہ تنویر، اور شہلا رحمٰن ٹہلتی ہوئی اسے پھاٹک تک پہنچانے آئیں۔ شب بخیر، خدا حافظ اور چیریو کے بعد وہ بے حد اکتا کر، بے حد تھک کر وہاں سے روانہ ہوا۔

جب وہ گھر پہنچا۔ اس کے سر میں شدّت سے درد ہو رہا تھا اور اس کی میز پر اگلے اتوار کے لئے عفران منزل اور لالہ رخ والوں کی طرف سے ایک اور پارٹی کا دعوت نامہ رکھا ہوا تھا۔

تم ٹھیک کہتے تھے او شبّر بھائی۔ یہاں پر سب جسم ہی جسم ہیں۔ صندلی، گرم

خوبصورت، روح کہیں نہیں ملتی۔ کہیں نہیں ملتی۔

نکلتے جاڑوں کا خشک اور غیر دلچسپ زمانہ آپہنچا تھا۔ وہ زمانہ جب ہوا میں زرد پتے اڑتے ہیں اور دوپہر کو نیند آنے لگتی ہے۔ کرن کچھ عرصے کے لئے اپنے اخبار کے سلسلے میں پھر ہندوستان سے باہر چلا گیا۔ دمل بھی بہت شدید قسم کا بور ہوتا جا رہا تھا اور ریڈیو پر انگریزی ڈرامے پروڈیوس کرنے کے بجائے اب سیاست حاضرہ پر بڑے بڑے سیاست دانوں کی تقریریں کروانے پر جُٹ گیا تھا۔ دنیا میں بالکل ٹھیک بڑا زبردست قومی شعور پیدا ہو چلا تھا۔ کالجوں کے لڑکے اور لڑکیاں اپنی اپنی ٹولیاں بنا کر بڑی مجاہدانہ شان سے آنے والے بڑے الیکشن کے لئے گاؤں گاؤں گھوم کر اپنی اپنی جماعتوں کا پرچار کر رہی تھیں۔ امین آباد پارک اعلیٰ پیمانے کا سیاسی اکھاڑہ بن گیا تھا۔ شام کے وقت مخالف سیاسی پارٹیوں کے دفتروں سے لاؤڈ اسپیکرز کے ذریعے ایسے زوردار قصیدے ایک دوسرے کی شان میں عرض کئے جاتے تھے کہ ایک لحظے کے لئے عقل حیران رہ جاتی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہوتا جاتا جا رہا ہے۔ وہ تاریخی امیر الدولہ پارک اور امین آباد جہاں ان گئے گذرے وقتوں میں بھی گرمیوں کی شاموں کو ہجوم کی وجہ سے کھوے سے کھوا اچھلتا تھا اور بیلے چنبیلی کے گجرے والے اور لیلےٰ کی انگلیوں، ایسی ککڑیاں اور خس میں لگا ہوا فالودہ بیچنے والے اپنی مخصوص صداؤں سے شام اودھ کی یاد تازہ کر دیا کرتے تھے۔ ان سب پرانی، مانوس آوازوں اور محبوب فضاؤں پر لاؤڈ اسپیکرز کی آوازیں غالب آگئیں۔ گنگا پرشاد میموریل ہال اور قیصر باغ کی بارہ دری میں مشاعروں اور کلچرل

پروگراموں کی جگہ سیاسی جلسوں کی تعداد روز افزوں ترقی کرنے لگی۔ یونیورسٹی اور دوسرے کالجوں میں اسٹرائیکوں اور مظاہروں کا اوسط روزانہ کی کلاسوں کے مقابلے میں زیادہ بیٹھنے لگا۔ انقلاب زندہ باد۔۔۔ ہے سجنو اور دیویو۔۔۔ ہے پوجنے بھائیو اور بہنو۔۔۔ ہے کرانتی کاریو۔۔۔ کدم کدم بڑھائے جاؤ۔۔۔ کدم کدم۔۔۔ ہر کونے کھدرے سے بھانت بھانت کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

کنور صاحب باہر کی دنیا کی اس دیوانگی، اس جوش و خروش ان حماقتوں سے بے نیاز اپنے کمرے کے جھولنے والے صوفے پر بیٹھے حافظ اور بو علی سینا کے مطالعے میں مصروف رہتے۔ کروا ہاراج کے ہرے بھرے علاقے بالکل پر امن تھے۔ ان کی رعایا مطمئن تھی۔ اس سال فصلیں خوب پیدا ہوئی تھیں۔ کمایوں ڈویژن کے نینی تال کے علاقے میں کنور صاحب کے جتنے جنگلات تھے۔ ان کی لکڑی جنگ کے زمانے میں گورنمنٹ کو ٹھیکے پر دی گئی تھی۔ اس کی وجہ سے الغاروں روپے کا منافع ہوا تھا۔ جو بدامنی اور شر انگیزی ملک کے گوشے گوشے میں بھڑک اٹھی تھی۔ اس کا کروا ہاراج میں دور دور تک گذر نہ تھا۔ کنور صاحب پرانی تہذیب کے اداروں اور روائتوں کے تحفظ اور پابندی کی حد تک قدامت پرست ضرور تھے۔ لیکن رجعت پسند کسی حالت میں نہ تھے۔ انہیں اپنے خاندان کے "قومی ہیرو نمبر ون" خورشید سے کوئی ہمدردی نہ تھی - وہ اپنے بچوں اور ان کے ساتھیوں کے شائع کئے ہوئے رسالے کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ لیکن مفسدوں، فتنہ پردازوں اور فرقہ پرستوں کو اپنے پاس پھٹکنے تک نہ دیتے تھے۔ اپنے اصولوں اور عقیدوں کی پابندی ان کے نزدیک ان کا عزیز ترین اور مقدس فریضہ تھا۔ اس لئے انہیں

اس کی پرواہ نہ تھی۔ کہ ان کے خلاف پروپگنڈے اور عوام کی بدلتی ہوئی ذہنیت کی وجہ سے ان کی ہر دلعزیزی میں فرق آچلا ہے۔ میدان سیاست میں، کونسل چیمبر کی فلور پر، تعلقے داروں کی ایسوسی ایشن کے جلسوں کے موقع پر، ہر جگہ، ہر وقت بڑے شد و مد سے ان کی مخالفت کی جاتی، خصوصاً امبرپور راج والے جن کی خاندانی معاملات کی وجہ سے ہمیشہ سے ان کی کھٹ پٹ چلی آتی تھی۔ میدان سیاست میں آکر مخالف جماعت کے لیڈر کی حیثیت سے کنور صاحب کے سب سے بڑے حریف ثابت ہوئے تھے۔

پی چو اپنی رینج کے اضلاع سے واپس آگیا تھا۔ رخشندہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی نیو ایرا کے پروف دیکھ رہی تھی۔ اس نے پی چو سے پوچھا۔ "پی چو تم تو اس وقت صوبے کا بڑا حصہ دیکھ کر آرہے ہو۔ تم نے کچھ محسوس کیا۔ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ کس طرف جا رہے ہیں"۔ "روشی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سب کے سب کیوں بھیڑ چال پر آنکھیں بند کئے اندھا دھند ایک سمت کو بھاگے جا رہے ہیں"۔ وہ تھک کر دیوان پر گر گیا۔ "ہٹاؤ گولی مارو۔ آج شام کا پروگرام کیا ہے، میں تو اب اس نتیجے پر پہنچنے والا ہوں کہ فرار ہی بہترین اور دلچسپ ترین مشغلہ ہے۔ دمل کو فون کردو۔ شام کو کلب آئے۔ جانے کرن لندن سے کب تک واپس آئے گا"۔ اس نے کہا۔

رخشندہ پروف سمیٹ کر گیلری کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر پہلے سید افتخار اس سے مل کر گئے تھے۔ وہ آسانی سے اپنی مقامی سیاست کے سلسلے میں کرن یا دمل سے مل سکتے تھے۔ لیکن رخشندہ لڑکی تھی اور حالانکہ وہ ان کا بالکل نوٹس نہیں لیتی تھی۔ لیکن بہر حال ایسی خوبصورت اور دلچسپ لڑکی سے چند منٹ کے لئے ہی باتیں کر لینا اس نازک اور پُر آشوب زمانے میں اپنا موریل قائم رکھنے کے لئے بہت مفید تھا۔

اس نے بہت اکتا کر وِل کو فون کرنے کے لئے رسیور اٹھایا۔ اس وقت اس کا شدت
سے جی چاہا کہ کسی طرح اس ماحول اس دنیا سے نکل بھاگے غمِ دل ہی کیا تھوڑا تھا۔ کہ
اوپر سے غمِ روزگار بھی سر پر آن پڑا۔ اگلے روز ۲۱ مارچ تھی اور غفران منزل میں جشنِ نوروز
منایا جانے والا تھا۔ غفران منزل میں بڑے کنور صاحب مرحوم کے زمانے سے جشنِ نوروز
ہر سال بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اندر اور باہر دعوتیں ہوتی تھیں۔ رنگ کھیلا
جاتا تھا۔ ہوا میں گلاب جگمگاتے تھے۔ غفران منزل کی ساری مہریاں سال بھر اُس
دن کی راہ دیکھتی تھیں کہ کب وہ پی چو اور ریو لوبھیا پر رنگ پھینک سکیں گی۔ وِل سے
بات کر کے وہ تھکے تھکے قدم رکھتی برآمدے کی سیڑھیوں پر آن بیٹھی۔ پی چو اپنے
کمرے کی طرف چلا گیا۔ باغ میں "امتحان کی ہوائیں" چل رہی تھیں۔ بیحد غیر دلچسپ
جان سے عاجز کر دینے والا زمانہ تھا (وہ زمانہ جب مکھیاں بھنبھنانا شروع کر دیتی
ہیں۔ سالانہ امتحانات سر پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔ دن بھر سائیں سائیں کرنے والی
ایسی پھیکی اور خشک ہوائیں چلتی ہیں کہ جی چاہتا ہے کتابیں پٹخ کر دنیا سے کہیں
بھاگ جائیے۔ زرد پتے اور گرد کے بگولے فضا میں منڈلاتے ہیں۔ پڑھنے میں
جی نہیں لگتا۔ لیکن مجبوراً سال بھر کی پڑھائی اسی زمانے میں کرنی پڑتی ہے۔ جی
چاہتا ہے کہ کافی ہاؤس یا پکچرز چلا جائے۔ لیکن یاد آتا ہے کہ ابھی چار پرچوں
کی تیاری اور کرنی ہے اور صبح ہوتے ہی xamination Winds
پھر سے چلنا شروع ہو جائیں گی۔ دن بھر لائبریری جا کر جلدی جلدی آخری اور
ضروری کتابیں دیکھ کر نوٹس مکمل کرنے ہوں گے۔ سہ پہر کو برآمدے کی سیڑھیوں
پر بیٹھے بیٹھے پھر نیند آئے گی۔ رات کو کافی پینے کے بعد پڑھنے کے بجائے گپ

کرنے کی شدید خواہش پھر پیدا ہوگی۔ یا اللہ تو اس امتحانوں کے چکرّ سے کب نجات دے گا؟ ارے ہائے سلیم۔ لعنت ہو) وہ دل پر جبر کر کے جذبۂ شہادت کے ساتھ کتابوں کا انبار اپنے کمرے سے اٹھا لائی اور پھر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور سامنے لان پر گرتے ہوئے زرد پتوں کو دیکھنے لگی جو ہوا سے اڑ اڑ کر چاروں طرف بکھر رہے تھے۔ اس نے سوچا۔ اگر اس وقت، ایسے میں سلیم آن پہنچے تو کیا ہو۔ وہ پھر ہمیشہ کی طرح اسے بے حد اخلاق سے پی چھ کے سٹنگ روم میں لے جائے گی اسے کرن اور فیروز کے تازہ ترین لطیفے سنائے گی، اس سے پچھلی شام کی پارٹی کی کامیابی کا ذکر کرے گی — یہ سلسلہ یونہی مہینوں سے، مدتوں سے چل رہا ہے۔ یہ بہت زیادتی ہے۔ اس زیادتی کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔ اسے بچپن میں پڑھی ہوئی "ایلس اِن ونڈرلینڈ" یاد آئی جو موسم گرما کی ایک غیر دلچسپ دوپہر کو ندی کے کنارے اونگھتے اونگھتے ایک دم ونڈرلینڈ میں پہنچ گئی تھی۔ ارے مجھے پرستان لے جانے والا ایک سفید خرگوش مل جاتا تو میں اس سے پوچھتی میاں خرگوش تم کاہے کے لئے ایسے ونڈرلینڈ بناتے ہو۔ جن کی سیر صرف ایک سہ پہر کی نیند میں ختم ہو جاتی ہے۔

اور تب ایسا ہوا کہ لان کے کنارے یوکلپٹس کے جھنڈ میں بکھرے ہوئے پتے کھڑکھڑائے اور انہیں روندتا ہوا سلیم واقعی بالکل اس کے قریب نچلی سیڑھی پر آن کھڑا ہوا۔

"السلام علیکم یا امیر المومنین"۔ رخشندہ نے بڑی شگفتگی سے کہا۔

"بڑے زوروں میں پڑھائی ہو رہی ہے؟ دوپہر کو جب نیند آ رہی ہو تو زبردستی

کتابیں دماغ میں ٹھونسنے کی بجائے طالب علموں کو ہمیشہ دو گھنٹے سولینا چاہئیے" وہ بولا
"ابے یار کیا بلے کی طرح کھڑے حفظانِ صحت پر تقریر کر رہے ہو۔ کب آئے، کیوں
آئے، کیسے آئے۔ سب فوراً تفصیل سے مطلع فرماؤ۔" سلیم کی آواز سنتے ہی پی چو اپنے
کمرے کے دریچے میں سے جھانک کر چلایا۔ سلیم فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ارے بھائی جالینوس — چنڈو خانے کی تازہ ترین اطلاع ہے کہ شہلا رحمن
نے تمہاری یاد میں ایک سانیٹ لکھا ہے۔ تمہاری نیوسنس ویلیو بہت بڑھتی جا
رہی ہے بھائی — پی چو نے حسب معمول بے حد بشاشت کے ساتھ اس سے
کہا۔ وہ چڑ گیا۔ کل شام کلب میں اس سے کسی نے کہا تھا کہ بھئی سلیم خاں سنا ہے
تم مس رحمن میں بہت دلچسپی لیتے ہو۔ آخر یہ لڑکی کیوں میری جان کے پیچھے پڑ گئی
ہے۔ اس نے سوچا۔ پھر وہ رخشندہ کی پڑھائی میں مخل ہونے کے خیال سے پی چو کے
کمرے کی طرف چلا گیا۔

لیکن رخشندہ کا جی پڑھائی میں کہاں لگ رہا تھا۔ وہ کب سے چاہ رہی تھی کہ کتابیں
وہیں چھوڑ کر پی چو کے کمرے میں جا بیٹھے اور شام کی چائے تک گپا شپ کرے۔ اور
شہلا رحمن کا نام سنکر اس نے کان کھڑے کیئے۔ سلیم کی ٹانگ کھینچی جا رہی ہے
اور یہ سوچ کر اسے ہنسی آگئی کہ شہلا رحمن کا سانیٹ کیا مزیدار تاریخی چیز ہوگی۔ وہ برآمدے
پر سے چلائی۔

"اور سلیم وہ جو حمیدہ تنویر ہیں نا۔ آمنا ریہ کہتے ہیں کہ اپنے اگلے افسانے کا ہیرو
وہ قطعی تم کو بنائیں گی۔"

"بہت خوب۔ رخشندہ بیگم اگر آپ مجھے بنانے کی فکر میں ہیں تو میں نہایت ادب

سے لفٹین جہانگیر قدر کی طرف توجہ مبذول کراتا ہوں۔ آج میرے نام ان کا تار موصول ہوا ہے کہ جشن نوروز میں شرکت کرنے سے قاصر ہوں۔ کیونکہ مجھے معمولی زکام کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔" سلیم نے دریچے میں سے جھانک کر کہا۔ ارے کہاں سے اسے معلوم ہو گیا کہ کنور رانی نے جہانگیر قدر کو بھی مدعو کیا ہے جو پچھلے ہفتے سے الہ آباد آیا ہوا تھا خوش قسمتی سے اسی وقت رخشندہ کے ساتھ امتحان کی تیاری کرنے کے لیے گنی آن پہنچی۔ اس نے رخشندہ کی طرف داری کی "جناب آپ سب جلتے ہیں بچارے لفٹین سے"۔ اس نے کہا۔

"ہنہہ ۔۔۔سی"۔ پی چو بولا۔

"سن ہ ۔۔ اس سے زیادہ خوبصورت آدمی ذرا شہر لکھنؤ میں دکھلا دیجئے آپ" گنی نے جوش سے کہا۔ پی چو کو غصہ آ گیا۔ اس نے فوراً کھڑے ہو کر جہانگیر قدر کی رفتار و گفتار کی بہترین نقل کر ڈالی۔ سب ہنستے ہنستے لوٹ ہو گئے۔

"کیوں بچارے کی روح کو شرمندہ کرتے ہو۔ غریب نہ لینے میں نہ دینے میں سوت نہ کپاس"۔ رخشندہ نے کہا۔

"ہاں بھئی اور کیا۔ لینا دینا یہ وہ"۔۔۔ گنی بولی۔ سب کو ڈاکٹر لینا دینا کہا یاد آ گئے تھوڑی دیر میں ریڈیو اسٹیشن سے اپنے اپنے کام ختم کر کے ڈائمنڈ اور روملی بھی آ گئے۔ بڑے زور شور سے بحث شروع ہو گئی۔ لکھنؤ کا خوبصورت ترین آدمی یعنی 'بیوٹی کنگ' کون ہے"۔

"ڈون انور دی گریٹ بچارہ سب سے خوبصورت ہے"۔ رخشندہ نے کہا۔

"ہرگز نہیں"۔ پی چو فوراً بولا۔

"آپ کے کہنے سے؟ ایک عالم اُسے گلیمر لو بائے کہتا ہے۔ آپ جلا کیجئے۔"
رخشندہ نے کہا۔

"تم لڑکیوں کو بس گرگیری پک جیسی ہی پسند آتے ہیں۔ جانے کیا
باؤلا معیار ہے۔" پی چو نے بگڑ کر کہا۔

"جی ہاں اور آپ لوگوں کا معیار کیا ہے گھاس کھایا ہوا۔ ایک سے ایک لولائی
ہوئی لڑکی کو کہدیں گے بہت حسین ہے۔ اب ذرا غور کیجئے۔ وہ ایک اینگلو انڈین لڑکی
نہیں ہے جو پچھلے سال دیوسے کی میوزک کانفرنس میں ناچی تھی۔ پی چو صاحب اسے
دیکھ کر وہاں فرملنے لگے کہ بے حد خوبصورت ہے۔" رخشندہ بولی۔

"میں نے یہ کب کہا تھا کہ خوبصورت ہے بس ذرا کلاک کرتی ہے۔" پی چو
نے احتجاج کیا۔

اس 'اینگلو انڈین لڑکی' کے ذکر پر سلیم بالکل خاموش رہا اور بڑے اطمینان سے
بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔

"کیوں بھئی 'کلاک کرنا ہے' بھی ہو سکتا ہے؟" گنی نے ہنستے ہوئے پوچھا
"قطعی۔" دمل نے اسے جواب دیا۔

دفعتاً رخشندہ کو خیال آیا۔ دراصل یہ بات ہے۔ یہ شخص — یہ سلیم کلک کرتا ہے
اتنے عرصے سے جو وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی کہ اس نے اتنا پریشان کیوں
کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ محض یہی ہے (یہ طے کر کے اُسے کچھ اطمینان سا ہو گیا)
چند روز پہلے وہ سب ساتو کی نئی فلم ٹینجیرز دیکھنے گئے تھے۔ اس میں ایک آدمی
سارے وقت مونوکل لگائے رہتا تھا۔ پی چو کو یہ سٹائل بہت بھا گیا اور وہ کہنے لگا

کہ ارے قسم خدا کی میں بھی مونوکل لگاکہ اتنا ہی ڈیشنگ بالکل ہنری فونڈا کا بھتیجا لگوں گا دوسرے روز ہی وہ اسحٰق کے ہاں سے ایک مونوکل خرید لایا اور بڑے ٹھاٹھ سے اپنے یونیفارم اور پیک کیپ کے ساتھ مونوکل لگالی۔ اس وقت مردانہ وجاہت کے مسئلے پر بحث کرتے کرتے اسے تاؤ آگیا اور جھٹ اپنی مونوکل لگاکر آن بیٹھا۔ ہنستے ہنستے لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سلیم بھی اس روز خلافِ عادت خوب ہنس رہا تھا۔

اور اس کو اسی طرح ہنستے اور بے فکری سے سگریٹ کا دھواں اڑاتے دیکھ کر رخشندہ نے دفعتہً اپنے آپ سے پوچھا۔ یہ شخص یہاں کیوں بیٹھا ہے۔ ہم سب اس مخصوص لمحے میں اس مخصوص جگہ پر خود کو کیوں موجود پا رہے ہیں۔ زندگی کے معمے کے مختلف ٹکڑے اس وقت اس خاص نمونے سے کس طرح جمع ہو گئے ہیں۔ پھر کچھ ہو گا۔ کوئی ایسی بات ہو جائے گی جس سے یہ ٹکڑے بکھر جائیں گے۔ پھر وقت کی پرواز کے ساتھ کوئی نیا معمہ بن جائے گا۔ کوئی نیا حل تلاش کر لیا جائیگا ہم جہاں ہیں اس جگہ نہ ہوں گے۔ یہ سمے آگے نکل جائے گا۔ زندہ رہنے کی خوش رہنے کی خواہش، زندگی کی مقناطیسی رو وقت کے ریگستانوں میں کھو جائے گی۔ یہ چھوٹے چھوٹے معصوم بے بس انسان —— آنے والے دن اور آنے والی راتیں ان سب کے لئے کیا لائیں گی۔ ان کی آنکھیں ابھی کیا کیا دیکھیں گی۔ ان کے دل کیوں دھڑکیں گے۔ کوئی نہیں جانتا یہ سب کیوں ہے۔ کتنی ہنسی کی بات ہے (ارے میں تو فلسفی ہو گئی ہوں بڑی بھاری۔ اس نے سوچا۔ بھلا سلیم کو کیا معلوم کہ اس وقت وہ کن فلسفیانہ بلندیوں پر پہنچ گئی ہے۔ اسے ہنسی آگئی اور وہ سب کے

قہقہوں میں شامل ہو گئی)
لان پر یو کلپٹس کے سائے طویل ہونے شروع ہو گئے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد "ملت بیضا" کا ایڈیٹر اپنے نظر باغ کے فلیٹ میں بیٹھا خلال کر رہا تھا اور ایک فلمی رسالہ دیکھتا جاتا تھا۔ غفران منزل کے پھاٹک سے نکل کر انڈیا کافی ہاؤس کا ایک چکر لگاتے ہوئے (کیونکہ سارے اخبار نویسوں اور "انٹلکچوئیل" لوگوں کی نشست دوپہر کے وقت عموماً انڈیا کافی ہاؤس میں ہوتی تھی) سید افتخار نظر باغ پہنچے۔ "السلام علیکم" انہوں نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"وعلیکم بھائی"۔ اڈیٹر نے بادل نخواستہ رسالہ بند کر کے ایک طرف پھینک دیا جس میں رنگین اور سادہ سب ملا کر بیگم پارہ کی بیس تصویریں تھیں جو ہندوستان کی "اومف گرل" کہلاتی تھی۔

"کہو بھئی کیا حالت ہے" اس نے سید افتخار کو بہت افسردہ دیکھ کر ہمدردی سے پوچھا۔

"دکھا ہے کی۔—؟" انہوں نے سگریٹ جلاتے ہوئے سوال کیا۔

"وہی — مقامی سیاست کی"۔

"ہُمم — معلوم ہوتا ہے یہاں کی اس "انٹلکچوئیل" فضا کا اثر تم پر بھی ہو گیا ہے بہت ضلع جگت پر اتر آئے ہو"۔ سید افتخار نے کہا۔

"قصہ تو بتاؤ — کوئی اسکوپ؟"

"ارے اسکوپ کیا وہی اس لونڈیا کا چکر —"

"کیا ہوا"؟ اڈیٹر نے یکلخت بے حد دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا" ارے میاں آگئے تم بھی اس کے پھیر میں؟ چلو یہ بھی اچھا ہوا ___ کس ادا سے اس رات کمبخت نے کہا تھا۔ ٹھہریئے مجھے میں خود سید صاحب سے کچھ کہنا چاہتی ہوں ___ اوہو ہو ہو۔ اب تازہ ترین پیچیدگیاں کیا ہیں؟"

"قصہ یہ ہے کہ تم نے کنور صاحب پر جو اڈیٹوریل لکھا ہے۔ اسے شائع نہ کرو" سید افتخار نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہوں ہم ___ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ کاپیاں پریس میں جا چکی ہیں"

"غلط بات ہے۔ لو سگریٹ ___"

"دیکھو رحمت اللہ خان میری بات مذاق میں نہ اڑاؤ۔ آج خشندہ بیگم سے میں ملنے گیا تھا۔ اس نے پورے دس منٹ تک مجھ سے بڑے اخلاق سے برآمدے میں کھڑے باتیں کیں جس سے ظاہر ہوا کہ وہ قطعی ہماری پارٹی کے بہت زیادہ خلاف نہیں ہے اور ہماری سیاست کے چند بنیادی اصولوں کو بھی ایک حد تک درست ماننے کے لئے تیار ہے۔ بلکہ اس نے یہاں تک کہا کہ آئندہ اتوار کو نیو آیرا کے سالانہ جلسے میں میں اپنے اخبار کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کروں۔ واقعات بڑے امید افزا ہیں اور اس حالت میں یہ قطعی ممکن نہیں کہ وہ مضمون شائع کیا جائے جس میں کنور صاحب اور ان کے سیٹ کو خالص ہمارے اسٹائل میں گالیاں دی گئی ہیں۔ اماں جہنم میں جائے تمہارا "ملتِ بیضا"۔ آج اس کمبخت نے یوں ہنس ہنس کر باتیں کیں کہ دل لوٹ گیا۔ قسم خدا کی ___"

"دیکھئے سید صاحب ___" اڈیٹر اٹھ کھڑا ہوا" میں بہت طرح دیتا ہوں لیکن

اب مجھے غصہ آجائے گا۔ آپ کو کیا حق ہے کہ میرے اخبار کے لئے یہ لفظ استعمال فرمائیں۔ اخبار آپ کا زر خرید نہیں۔ نہ یہ خاکسار آپ کا غلام ہے۔ اڈیٹوریل قطعی چھپے گا۔ ایک ٹی پارٹی اور لونڈیوں کی چند مسکراہٹوں کی خاطر قوم کو بیچنا آپ کو منظور ہے؟ —

"اماں — ہیں — واللہ کیا کہہ رہے ہو۔ ہوش میں رہو میاں۔" سید افتخار نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ کیونکہ انہیں یاد آگیا کہ رحمت اللہ خان ملیح آباد کا پٹھان تھا

"خوب جانتا ہوں نیوایرا کے ایٹ ہوم میں تمہیں کیوں مدعو کیا گیا ہے کیونکہ کنور صاحب تم سے خوفزدہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تم اور تمہاری پارٹی نے ان کی ریاست اور ان کے حلقہ انتخاب میں کتنا زور باندھ رکھا ہے۔ پچھلے الیکشن میں وہ اس کا نتیجہ بھی دیکھ چکے ہیں۔ مجھ کو تم اتنا بیوقوف مت سمجھو —" اڈیٹر نے میز کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"تو — تم کیا کرو گے؟"

"میں — ؟ میں اپنی پوزیشن اور اس کے فائدوں سے خوب باخبر ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ مضمون نہ چھپے تو اپنی چیک بک نکالو اور ایک چیک اس خاکسار کے نام کاٹو اسی وقت — خوب چپڑی اور دو دو۔ لونڈیوں سے عشق لڑانے کی فکر بھی ہے اور مجھ پر بھی دھونس ہے۔ اگر ایسا مضمون شائع نہ ہو تو میرا اخبار کیسے چلے گا اور میں کھاؤں گا کہاں سے۔ سب ہی تو تمہاری طرح ہائی کمانڈ کی آنکھوں کا تارا نہیں ہوتے۔ اس طرح کے مضامین کی آج کل عوام کے لئے کتنی زبردست اپیل ہے جو روز صبح ملت بیضا کے انتظار میں امین آباد کے چوراہوں پر کس

اشتیاق سے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ شاید تم کو بھی معلوم ہوگا۔ اور —"

"اور پھر —؟"

"پھر؟ — میں ابھی کنور صاحب کے پاس بھی جاتا ہوں۔ اگر وہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ مضمون شائع نہ ہو تو ایک چیک انہیں بھی کاٹنا پڑے گا — یہ اردو صحافت ہے بھائی جان محض قوم کی لیڈری نہیں ہے اور اگر تم چاہتے ہو کہ ملتِ بیضا کے مقابلے میں دوسرا رسالہ نکالو تو بسم اللہ — اور پھر آؤ میدان میں۔"

جب وہ اپنا سارا ابتدائی جوش ختم کر چکا تو اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر اس نے رسالہ اٹھا لیا جس میں بیگم پارہ کی بہیں تصویریں تھیں۔ "گویا کاٹو چیک دیکھتے کیا ہو۔" سید افتخار نے خاموشی سے اپنا فاؤنٹین پن جیبوں میں ڈھونڈھنا شروع کیا

پھر گرمیوں کا موسم آیا جب رات کے وقت باغ کے زمین میں سے چھڑکاؤ کے بعد ٹھنڈی ٹھنڈی اور سوندھی لپٹیں اٹھتی ہیں اور چھت کی منڈیروں پر پھولوں اور صراحیوں پر لپٹے ہوئے گجرے پڑے مہکتے ہیں اور گھر سے نکل کر باہر خاموش سڑکوں پر ٹہلنے کو جی چاہتا ہے۔

علی گنج کا سالانہ میلہ ہونے والا تھا۔ سڑکوں پر سے رات بھر پکریما کرنے والے عقیدت مندوں کی ٹولیاں گذرتی رہتیں۔ سڑک کی جلتی ہوئی زمین پر ہر پانچ قدم کے بعد قلابازیاں کھاتے وہ کوسوں دور سے ہنومان جی کے مندر کی سمت ہر سال اسی طرح چلے آتے تھے اور رات کے سناٹے میں "جے بجرنگ بلی" کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی تھی۔ سارے شہر میں سڑکوں کے کنارے کنارے دولت مند

ہندوؤں نے یاتریوں کے لئے سبیلیں لگا رکھی تھیں۔ انسان کی اندھی، طوفانی عقیدت کا یہ بڑا عجیب و غریب مظاہرہ ہوتا تھا۔ انسان بڑا عجیب طرح کا جانور ہے اس کی سمجھ اور اس کی ناسمجھی، اس کی محبت اور اس کی نفرت، اس کے جذبات کی اتھاہ گہرائیوں کا اندازہ لگانا ماہرین نفسیات کے بس کا کام نہیں۔

گیتی بھی بڑی خوش عقیدہ لڑکی تھی۔ دوستوں کے گروہ میں بیٹھ کر توہمات اور مذہبی حماقتوں کا مذاق اڑانے والی یہ "روشن خیال" اور "ترقی پسند" لڑکی ہر سال اپنی ممی کے ساتھ علی گنج جاکر ہنومان جی کے سامنے پرشاد چڑھاتی اور وہاں سے اپنے سفید، خوبصورت پیشانی پر تلک لگائے خوش خوش واپس آجاتی۔ بھگوان کے مندر یا ورجن میری کی عبادت گاہ میں ایک لمحے کے لئے دل و دماغ کو جو مکمل، ناقابل بیان سکون، جو پاکیزگی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے سامنے عقل پرستوں کی ساری منطقیں بیکار ہیں ـــ مسوری جانے کا پروگرام حسب معمول لڑکیوں کے سالانہ امتحانات ختم ہونے ہی بن چکا تھا لیکن کرشن نرائن کول آئی سی ایس کی کوٹھی کے پھاٹک پر ٹھنڈے شربت کی جو سبیل لگائی گئی تھی۔ میلے کے دوران میں اس کا انتظام محض لوگ کدو پر چھوڑ کر کول خاندان کسی طرح بھی لکھنو سے باہر نہ جا سکتا تھا اور کول خاندان کے بغیر کنور صاحب کا کنبہ کہیں نہ جاتا تھا اور کنور صاحب کے کنبے کے بنا کرسٹابل اور حفیظ احمد اور دوستوں کا سارا قبیلہ ہرگز بھی کہیں موو نہ کر سکتا تھا۔ پھر ابھی سلیم اور پی چو کو رخصت نہ ملی تھی اور وہ دونوں اپنے ضلع سے واپس نہ آئے تھے۔

رخشندہ خوش خوش پیکنگ میں مصروف تھی کہ ایک روز فون کی گھنٹی بجی اور ایک اجنبی اور بڑی شیریں آواز نے مے فیئر کے گرین روم سے پوچھا کیا ڈاکٹر سلیم

پرتاپ گڈھ سے آ گئے ہیں؟" جی نہیں" ۔ رخشندہ نے کہا" ممکن ہے۔ وُہ آج یا کل ہی آجائیں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کا پیغام ان کو بتا دیا جائے گا۔" "اوہ کوئی بات نہیں شکریہ۔" "بالکل ٹھیک ہے"۔ رخشندہ نے بڑے اخلاق سے کہا اور بات ختم کر دی

دوسرے روز سلیم اور پی چو جب پرتاپ گڈھ سے آئے۔ اس وقت تک سفر کی تیاریوں کے ہنگامے میں وہ اس فون کو بالکل بھول چکی تھی۔

پھر وہ سب مسوری گئے۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح خوب تفریح کی۔ راجپور سے مسوری تک خچروں پر جانے کا پروگرام بنایا گیا۔ پی چو حسب معمول ہر انوکھے کام کی طرح اس میں بھی پیش پیش تھے۔ خچروں کا انتظام کرواتے پھر رہے ہیں۔ نوکروں کو ڈانٹ رہے ہیں۔ اپنی بہنوں پر رعب جھاڑ رہے ہیں۔ ہر خچر کا سلسلہ نسب سر آغا خان کے گھوڑوں تک پہنچا دینے کے ثبوت پیش کر رہے ہیں۔

لیکن کرسٹابل نے کہا۔ اس کی بچی کی طبیعت اچھی نہیں اور وہ ان سب کے ساتھ راجپور سے مسوری نہ جا سکے گی اور پی چو کا سارا جوش و خروش ختم ہو گیا۔

"ہٹاؤ نہیں جاتے خچروں پر۔ گولی مارو۔" اس نے ہاتھ ڈھیلے ڈھالے چھوڑ کر کہا۔

رخشندہ بکلخت بیحد پریشان ہو گئی۔ یا اللہ — اللہ میاں — پی چو کو کیا ہوتا جا رہا ہے — میرا بیچارہ سوئیٹ پی چو —

کرسٹابل کی بچی کو انفلوئینزا ہو گیا تھا۔ اس کی دوسرا اتھ کے خیال سے رخشندہ بھی چند روز کے لئے راجپور میں ٹھہر گئی۔ باقی کے سب لوگ آگے چلے گئے۔

سلیم ایک روز شام پڑے زرینہ کو نئی دوائیں دینے کے لئے مسوری سے راجپور واپس آیا۔ لیکن کرسٹابل زرینہ کو اپنے ساتھ لے کر اپنی کسی عزیزہ سے ملنے کہیں

رک گئی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر ہوٹل کی لاؤنج میں رخشندہ کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ واپس جانے لگا۔

"رک جاؤ ذرا اور ٹھہر جاؤ تو ہم تمہارے لیے چائے بنا دیں۔" رخشندہ نے اس سے کہا

"نہیں اب میں چل ہی دوں۔" اس نے کہا

"شیور؟ چائے کو جی تو نہیں چاہ رہا؟ بھئی میری بات مان لو۔ بادل گھر آئے ہیں۔ بارش شروع ہو جائے گی۔ ابھی کرسٹابل اور حفیظ بھی آ جائیں گے۔ پھر ہم رات کے کھانے تک برج کھیلیں گے۔ اچھا چاکولیٹ پیئیں گے؟" وہ ہمیشہ کی طرح ویسی ہی اخلاق کا مجسمہ مکمل میزبان تھی۔ ہر جگہ، ہر وقت، ہر موقع پر ایک سی۔ ہمیشہ وہی پوز کئے ہوئے اس نے سوچا۔ اگر وہ لاؤنج سے اٹھ کر باہر جانے کے بجائے کمرے میں گیا۔ تو اسی طرح جیسے وہ کرن یا پپّو یا ڈنل کے لئے چائے بناتی تھی۔ ان کی خاطر تواضع کرتی تھی۔ اس سے بھی ایسی ہی باتیں کرے گی۔ وہ بھی گویا ان ہی میں سے ایک تھا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ مہینوں سے، مدتوں سے یہی سلسلہ چل رہا تھا۔ یہ بہت زیادتی ہے۔ اس زیادتی کی کوئی حد بھی ہونی چاہئے۔ وہ ایک لحظے کے لئے یونہی کھڑا رہا۔ موقع کی حماقت انگیز حالت چھپانے کے لئے وہ جلدی سے سگریٹ لائیٹر ٹھیک کرنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ تینتیس سالہ، سنجیدہ، مغرور انسان اس وقت اپنے آپ کو کس قدر احمق، بیوقوف محسوس کر رہا تھا۔

"اچھا بھئی تو پھر تمہاری مرضی۔ مت ٹھہرو۔ اس سردی میں مسوری واپس جاؤ گے آپ ہی نمونیہ ہو گا۔ پھر جناب آپ نہ کہئے گا کہ ہم نے آپ کا انتظار نہیں کیا۔ ہم تو کل صبح ہی کو لا گڈھ چلے جائیں گے۔" وہ اسی طرح مزے سے کھڑی روزمرہ کی باتیں

کرتی رہی "اچھا شب بخیر مسوری میں سب کو ہم لوگوں کا لَو دے دینا" اس نے لاؤنج کا دروازہ بند کر لیا اور گنگناتی ہوئی اندر چلی گئی۔

وہ برساتی میں آ گیا اور جب اس کی کار سٹرک کے موڑ پر سے گذر کر مسوری جانے والے نئے پل پر پہنچ گئی تب شدّت سے اس کا جی چاہا کہ وہ واپس چلا جائے اور جزیرہ کیپری کے اس لاابالے سیلانی کی طرح جھک کر کہے۔ رخشندہ بیگم —— میں نے جو بہت مغرور تھا۔ میں نے آخر کار اپنی ہار مان لی ——

اور جانے کس طرح ایسا ہوا کہ اسی وقت بارش کا ایک زوردار ریلہ آ گیا اور چند لمحوں بعد اس کی کار پھر ہوٹل کی برساتی میں کھڑی تھی۔ اس نے لاؤنج کے دریچے پر دستک دی۔ رخشندہ نے دروازہ کھولا۔ آتشدان کی روشنی میں اس کے سفید ہاؤس کوٹ کے گھیر کی سلوٹیں نارنجی نظر آ رہی تھیں اور اس کے سیاہ، سیدھے ہیڈو نا ایسے بال شانوں پر پڑے تھے۔ وہ شاید اسی وقت لباس تبدیل کر کے کمرے سے نکلی تھی

"ہلو ڈوک تم واپس آ گئے —— کیا موٹر خراب ہو گئی؟"

"نہیں۔ میں چائے پینے آیا ہوں۔"

"ارے بھئی واہ ——" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "کرن اور پیا چوکے ساتھ رہ کر تم بھی بالکل خبطی ہو گئے ہو۔ دیکھو کرسٹابل اب تک نہیں آئی۔ اتنی سردی میں زرینہ کا نزلہ اور بڑھ جائے گا۔ اگر آج تم اسے دیکھ کر اس کی دوا تبدیل کر دیتے تو اچھا ہی تھا"

وہ اسی طرح گنگناتی ہوئی کمرے میں جا کر اسٹوو کے پاس چلی گئی۔

اوپر کی منزل میں ٹھہرا ہوا کوئی دل چلا انگریز کوئی پرانا ریکارڈ بار بار بجائے جا رہا تھا —— بن جانسن کا وہ مشہور نغمہ "سیلیا سے" —— جو وہ بیسیوں مرتبہ کالج میں

کرسمس بوَن فائر کے گرد گھومتے ہوئے اور کالج کے گلی کلب کی پارٹیوں میں خوب چلّا چلّا کر گا چکی تھی۔ میرے لئے پیالے میں صرف ایک پیار چھوڑ دو اور مجھے شراب کی ضرورت نہ رہے گی۔ روح کی گہرائیوں میں سے پیدا ہونے والی تشنگی جس کے لئے کسی آسمانی، الوہی مے کی خواہش ہوتی ہے — اگر مجھے اس کے لئے مقدس خداؤں کا امرت بھی ملے تو میں اس پیالے کو اس سے تبدیل نہ کروں گا۔

باہر بارش آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔

وہ ریکارڈ بجا کیا — میں نے تمہیں گلاب کے شگوفوں کا ایک تاج بھیجا تھا۔ اس سے کچھ تمہاری عزت افزائی منظور نہ تھی بلکہ میں نے محض یہ سوچا تھا کہ تمہارے پاس یہ کبھی نہ مرجھائے گا۔ لیکن تم نے اس پر جھک کر چند سانس لئے اور واپس بھیج دیا۔ اور تب سے خدا کی قسم یہ اپنی خوشبو سے نہیں بلکہ تمہاری خوشبو سے اب تک مہک رہا ہے —

ریکارڈ ختم ہو گیا اور کمرے کے فرش پر اِدھر سے اُدھر ناچتے ہوئے اور اس نغمے کے ساتھ اپنی آواز ملا کر گاتے گاتے وہ بھی دفعتًہ خاموش ہو گئی اور اسٹوو کے پاس جا بیٹھی اور کیتلی میں سے اُٹھتی ہوئی بھاپ کو غور سے دیکھنے لگی۔ وہ بھی خاموش تھا۔ وہ دونوں پھر ایک نئی جگہ پر تھے۔ خود کو ایک بار پھر بہت ہی تنہا پا رہے تھے۔ اس مارتی مرتی، لڑتی جھگڑتی، شور مچاتی دُنیا میں تنہا۔ وہ ایک دوسرے کے لئے کچھ محسوس کر رہے تھے۔ یہ کچھ کیا تھا — محبت — غلط۔ ہمدردی — یہ بھی غلط۔ ذہنی رفاقت — بالکل غلط۔ یہ نجانے کیا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ سلیم چائے کی پیالی میں چمچہ بجانے لگا۔ ان کے قریب ہی اوَن لکرُ کا تازہ پرچہ پڑا تھا۔

رخشندہ نے پانی کے اُبلنے کے انتظار میں وہ پرچہ اٹھا لیا اور اس کے ورق الٹنے لگی۔ راجکماری فلاں کا یہ پورٹریٹ جو مشہور پولش آرٹسٹ مادام فلاں نے تیار کیا ہے۔ مسٹر فلاں اور بیگم فلاں جو یہ گرمیاں کشمیر میں گذار رہے ہیں مس فلاں جنہوں نے راجکمار فلاں کے ساتھ اس چیتے کا شکار کیا۔ تاج اور ولنگڈن کلب اور گلمرگ کی پارٹیوں کے گروپ ـــــ احمق شکلوں کے فوجیوں اور ان کی "چار منگ" دلہنوں کی تصویریں ـــــ یہ بچارے لوگ ـــــ یہ بچاری دنیا ـــــ یہ بچاری زندگی ـــــ وہ اوَن لکڑ کے ورق اُلٹنے لگی۔

اس وقت سلیم نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ اس لحظے میرے سامنے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ میرے پیچھے کوئی ماضی نہیں ہے۔ صرف اس کا احساس ہے کہ وادیوں میں بہار کے پہلے سفید پھول کھل رہے ہیں اور بارش کی بوندیں اپنی جلترنگ سنا رہی ہیں۔ آؤ ہم اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہیں تو یہ رات کبھی ختم نہ ہوگی۔ پھولوں کی خوشبو ہوا میں اڑ رہی ہے۔ مجھے اس سمے سب کچھ بھول جانے دو۔ بھول جانے دو کہ اس تھکے ہارے جیون میں بہت دکھ ہیں۔ بڑی پشیمانیاں ہیں جنم جنم کے کبھی نہ بہہ سکنے والے آنسو ہیں کہ ہم دنیا بھر میں گھومتے ہیں لیکن ہمیں اپنا گھر کہیں نہیں ملتا کہ یہاں پر صرف جسم ہی جسم ہیں روح کہیں نہیں ملتی۔ لیکن تم میڈونا کی طرح یونہی خاموش بیٹھی رہو تاکہ ہم تیزی سے نکلتے ہوئے وقت کی پرواز روک کر فضائے بیکراں کی وسعتوں کے اس گونجتے ہوئے سناٹے میں کھو جائیں اور پھر کچھ یاد نہ رہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ رات بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ تم اس گیت سے جو ابھی اتنی

شگفتگی سے گا رہی تھیں۔ بہت جلد اکتا جاؤ گی اور ایک اور دن طلوع ہوگا۔
طویل، اور بے رنگ۔ اور اس کی چلچلاتی ہوئی روشن بدصورتی سے کہیں پناہ
نہ مل سکے گی۔ کہیں بھی نہیں۔

"ارے ہائے شکر کہ کرسٹابل آگئی۔ اب بھائی جالینوس تم جلدی سے
زرینہ کو دیکھ لو۔ تمہاری عمر عیار کی وہ زنبیل کہاں ہے؟" لاؤنج کا دروازہ کھلا
اور دفعتہً رخشندہ کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔ وہ جلدی سے اس کے ہینڈ بیگ
کی تلاش میں لاؤنج میں چلی گئی۔

کرسٹابل اور حفیظ احمد خاں مع اپنی چار سالہ بچی زرینہ کے جسے انفلوئنزا
ہو رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

ارے مجھے اپنی خوشیوں کے ساتھ اکیلا چھوڑ دو اور رات بھر میں یہی سوچتی
رہوں گی کہ میں کتنی خوش ہوں۔ اسے وہ چھوٹا سا بھورا چوہا بھی بہت۔ اچھا۔ ہو گا جو
چپکے سے کمرے کے ایک کونے میں سے نکلا اور دریچے میں جھلنتی ہوئی چاندنی
کے راستے میں فرش پر اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں سے کھڑا ہو گیا اور دوسرے
لمحے پیسٹری کا ایک ٹکڑا کتر کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ مدھم، بھیگی ہوئی،
ٹھنڈی چاندنی اس کے چاروں طرف برستی رہی۔ ہم سب آج کی رات کتنے
خوش تھے۔ ہم لوگ اپنا مزیدار سفر ختم کر کے پھر اپنے پیارے شہر واپس آئے
ہیں اور پھر تم چلے گئے (تم بے حد بور ہو) اور اپنے خوابوں کو ایک طرف سلا کر
تم بھی سو گئیں۔ لیکن جو باتیں ہم آج تک نہ کر سکے تھے۔ وہ اب چاند کے

سائے میں بنفشہ کے شگوفے ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں۔ ہم اکیلے میں اپنے اس وجود سے کس قدر مختلف ہوتے ہیں جو مجمع میں قہقہے لگاتا ہے ٹینس کھیلتا ہے۔ راجپور سے مسوری تک خچروں کی سواری کرتا ہے۔ انفلوئینزا کا علاج کرتا ہے۔ ارے تنہائی ـــــ تنہائی ــــ شہد کے قطروں جیسا یہ تنہا لحظہ جوان کے درمیان لرز رہا تھا۔ اس لحظے کی خاموش لچک یکلخت ایک مہیب گونجتے ہوئے دھماکے سے ٹوٹ گئی۔

اس نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف تاریکی میں دیکھا دریچے کے باہر سرو چاند لڑکھڑا کر بادلوں کے پیچھے چھپ رہا تھا اور گہری کالی گھٹائیں غفران منزل کے پرانے اندھیرے باغ پر جھکی کھڑی تھیں۔ اسے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے آنکھوں کو خوب اچھی طرح ملا اور اندھیرے میں اسی طرح لیٹی پلکیں جھپکاتی رہی۔

پھر یہ اندھیرا کم ہوا۔ آسمان پر پو پھٹنے لگی اور باہر بارش شروع ہو گئی (لکھنؤ میں برکھا کی مہاوٹیں جولائی ہی سے شروع ہو چکی تھیں اور جب وہ سب پہاڑ سے واپس آئے تھے تو انہوں نے اپنے شہر کو بہت ٹھنڈا اور نکھرا ہوا پایا تھا دن بھر ہوائیں باغ کے نئے پھلوں کی تر و تازہ مہک منڈلاتی تھی اور گنّی ملہار گاتی تھی) پھر صبح ہوئی۔ گل شبّو نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ آجاؤ گل شبّو۔ اس نے آواز دی اور لیمپ بجھا دیا۔ کیونکہ مدھم مدھم بارش کی پھواروں میں ملی جلی روشنی چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔

"بٹیا چاے بھیجئے گا؟" گل شبو نے پوچھا

"ہاں۔" اس نے اطمینان سے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ کیوں ڈر رہی تھی۔ وہ اپنے
کمرے میں، اپنے گھر میں، اپنی مسہری پر آرام سے سو رہی تھی۔ وہ راجپور اور مسوری میں
بڑا دلچسپ "سیزن" گذار کر آرہی تھی۔ اس کی پرانی، پیاری خادمہ اس کے سامنے
کھڑی تھی اور اس سے پوچھ رہی تھی۔ "بٹیا چاے بھیجئے گا؟" ہاں ـــ" اس نے گل شبو
کو جواب دیا۔

"بٹیا آپ کی ڈاک بھی ہے جو آپ کے پیچھے آئی رہی"۔ گل شبو نے کہا۔

"وہ بھی لیتی آؤ۔" اس نے جواب دیا اور مسہری پر اوندھی لیٹ کر دریچے سے
باہر دیکھنے لگی۔ جہاں باغ کے درخت بارش کی پھواروں میں جھکے جا رہے تھے۔ صبح
کی ہوا کا ایک بھیگا بھیگا جھونکا اندر آکر اس کے بالوں کو پریشان کرنے لگا۔

گل شبو چاے لے کر اندر آگئی۔

"گل شبو ذرا کھڑکی بند کردو۔" اس نے کہا۔

"اچھا بٹیا۔" چاے کی کشتی اور ڈاک کا انبار میز پر رکھ کر وہ دریچہ بند کرنے کے
بعد "ارے راما ساون بیتا جائے" الاپتی ہوئی باہر چلی گئی۔ سب ہی خوش تھے
یہ موسم کا اثر تھا۔ ساری دنیا بشاش تھی۔ اپنے کمرے کے دریچے سے باغ کے
نکھرے پتوں پر نظر ڈال کر اسے ہمیشہ یہی خیال آتا تھا کہ ساری دنیا بے حد خوش ہے
اس نے اپنی سہیلیوں کے خطوں پہ ایک سرسری نظر ڈال کر ایک بڑے مستعد اور
فرض شناس اڈیٹر کی طرح پہلے ان پلندوں اور لفافوں کو کھولنا شروع کیا جو ریویو
کے لئے آئے تھے۔

دفعتہً اس کی نظر اپنے نام ایک طویل سے لفافے پر پڑی جس کے اندر ایک طولانی دفتر تھا۔ اس میں مختلف طریقوں سے اسے دھمکیاں دی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض بڑی عجیب وغریب تھیں۔ اگر اس نے اپنی سیاسی جماعت سے قطع تعلق نہ کیا تو اس کا نتیجہ اس کے لئے بہت برا ہوگا۔ اس کی ساری نجی باتیں ڈاکٹر سلیم سے اس کی دوستی، اس کے اور اس کے ساتھیوں کے سارے "حالات"، اس کی تصویریں جو کہیں سے حاصل کر لی گئی ہیں۔ یہ سب چیزیں منظر عام پر لائی جائیں گی۔ نیو ایر اکے وہ سارے زہریلے مضامین لکھنے کی سزا اسے اس مناسب طریقے سے دی جائے گی کہ وہ بھی کیا یاد کرے گی۔ اس سے پورا خط ختم نہ ہو سکا۔ کیونکہ روتے روتے اس نے آنکھیں سجا لیں۔ دوپہر کی ڈاک سے اسے اسیطرح کے چند خط اور ملے۔ اس نے کمرہ اندر سے بند کر لیا اور وہیں مسہری پر اوندھی لیٹی رہی۔ اس کو پتہ نہ چلا کہ سارا دن گذر گیا اور اب شام ہو رہی ہے۔ اندھیرا پڑے وہ باغ کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔ چنانچہ یہ انجام ہے — وہ بار بار دل میں دہراتی رہی چراغ جلنے کے وقت وہ آیا۔ اس کی رخصت ختم ہو گئی تھی اور وہ اپنے ضلع کو واپس جانے والا تھا اور زعفران منزل والوں کو خدا حافظ کہنے اور مسوری کی میزبانی کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ اس نے حسب عادت پی چو کے سٹنگ روم کا رُخ کیا اور اس نے دیکھا کہ سب کمرے خالی پڑے تھے۔ کنور صاحب اوپر کی منزل میں اور کنور رانی اندر رہی ہوں گی۔ پی چو اور ریپو کلب گئے ہوئے تھے۔ عباسی خانم باہر آئیں۔ "بٹیا کہاں ہیں؟" اس نے ان سے پوچھا۔ "بٹیا؟ — پتہ نہیں۔ ابھی تو یہیں تھیں۔ صبح سے تو وہ اپنے کمرے ہی میں ہیں۔ شاید ان کا جی ماندہ ہے۔"

عباسی خانم نے کہا۔

پھر بٹیا کی ڈھونڈیا مچی۔ وہ باغ کے اسی کونے میں اسیطرح بیٹھی ہوئی ملی۔ وہ شاید اس وقت تک روتی رہی تھی۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اسے بالکل نہ رونا چاہئے۔ وہ اس کے قریب آیا۔ "ارے بھئی کیا بات ہے رخشندہ بیگم؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں"۔۔۔ وہ اس شخص، اس سلیم سے ہمدردی کی طالب نہ تھی۔ یہ بھی بڑی عجیب بات تھی۔ "کچھ نہیں"۔ اس نے الٹے ہوئے گملے پر سے اٹھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "آؤ اندر چلیں۔ پی چو آتا ہی ہو گا تم پر تاپ گڈھ کل جا رہے ہو؟"۔۔۔ برساتی میں پہنچتے ہی انہیں پی چو مل گیا۔ وہ اسی وقت کلب سے آیا تھا اور رخشندہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر جب سلیم انہیں خدا حافظ کہہ کر اور اگلے اتوار کو آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا اور وہ دونوں سٹنگ روم میں اکیلے رہ گئے تو اس نے پی چو کو وہ سارے پلندے دکھائے۔

"فوں۔۔۔ فوں۔۔۔ فوہ"۔ پی چو پیر پٹخ پٹخ کر بہت دیر تک سٹنگ روم اور برآمدے میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ "تم جانتی ہو روشی۔۔۔ ان خطوں میں چودھری شمیم کا ہاتھ ہے"۔

"اور سید افتخار۔۔۔؟" رخشندہ نے پوچھا

"وہ چیر کٹ چڑیمار؟ اس کی ابھی اتنی ہمت نہیں ہو سکتی۔۔۔ لیکن کتنی قیامت ہے کہ ہمیں اپنی عزت کے لئے خاموش رہنا پڑے گا"!

"ہائے اللہ۔۔۔"

"لیکن روشی ہمیں نیو آبرا کی پولیسی میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑے گی۔۔۔ میاں کی خاطر۔۔۔ اور۔۔۔ کرو ا ہاراج کی خاطر"۔۔۔ اس نے چپ رہنے کے بعد کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو پی چو — نیوابیرا کی پولسی میں تبدیلی —؟" رخشندہ نے آنکھیں پوری طرح کھول کر کہا۔ باغ میں رات کی ہواؤں نے سنسنانا شروع کر دیا تھا

"تم کو نہیں معلوم — سید افتخار اور ان کی جماعت کا ریاست میں کتنا اثر ہے۔ پچھلے پانچ چھ سال سے یہ اثر روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں اس کا کوئی تدارک نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں حقیقتوں کو دیکھنا پڑے گا۔ رعایا ہمارے خلاف بڑی آسانی سے مشتعل ہو سکتی ہے" — پی چو نے اسی طرح ٹہلتے ہوئے کہا۔

"لیکن پی چو ایک پھیچڑ ریاست کی خاطر ہم اپنے اصولوں کو قربان کر دیں گے — تم کو کیا ہو رہا ہے؟ — تم پیتے تو ہو کہ نہیں آتے ہو کلب سے؟" اس کی آواز رندھ گئی۔

"اصول — اصول — ان اصولوں کی وجہ سے میں تنگ آچکا ہوں رخشی۔ یہ نہ کرو اصول کے خلاف ہے۔ وہ نہ کرو روایات سے بغاوت ہے۔" پھر وہ یکلخت چپ ہو گیا۔

"پی چو ہمارے سارے آئیڈیلز —" رخشندہ نے آہستہ سے کہا۔ پھر اسے بھی محسوس ہوا کہ اس نے کتنی بیکار، بے معنی لغو بات کہی ہے۔

"جہنم میں بھیجو اپنے آئیڈیلز کو۔" پی چو کو کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔ وہ جنگلی بلے کی طرح غرایا۔ "اب تک تمہارے رسالے کی اپیل بڑے اچھے، بڑے اصول پرست بڑے ایماندار پڑھنے والوں کے حلقے کے لئے تھی۔ لیکن وہ حلقہ اب قومی شعور حاصل کر رہا ہے اور اپنی اصول پرستی اور اپنے ضمیر کو پرانے کوٹ کی طرح اتار کر نخاس میں پھینک چکا ہے۔ اب قوم کو مکتی ملنے والی ہے — لہٰذا تمہارے رسالے کو بھی

اپنے پڑھنے والوں جیسا بننا پڑے گا۔ ورنہ اس کے لئے تیار ہو جاؤ کہ یہ ملت کے جان نثار تمہارے دفتر پر آ کر دھاوا کر دیں۔ آج ہی میرے ایک سب انسپکٹر نے بتایا ہے کہ ان کے سیاہ جھنڈوں والے روزان کا جلوس سب سے پہلے عفران منزل کا راستہ لے گا۔"

"پی چو یہ تو ہرگز نہیں ہوگا۔" رخشندہ نے دروازے کے پاس جا کر کہا۔ "تم برٹش گورمنٹ کے بڑے نمک خوار اور فرض شناس ملازم ہو۔ یہ سب باتیں تم میرے لئے چھوڑ دو۔ کہ واہا راج یا عفران منزل پر اگر "غنڈوں" کا حملہ ہوا تو تم بڑے شوق سے اپنی ملٹری پولیس کے ذریعے اس کی حفاظت کروا لینا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ چودھری شمیم جیسے لفنگوں سے تم ڈر جاؤ گے۔"

"تم اس کے لئے تیار ہو کہ —— وہی سب باتیں جن کی دھمکی ان خطوں میں دی گئی ہے۔ تصویریں —— اور —— اور ——" وہ ٹہلتے ٹہلتے دوسری طرف مڑ گیا۔ اس سے آگے وہ نہ کہہ سکا اور سلیم کا نام اس کے حلق میں آ کر اٹک گیا۔ اپنی بہن سے ایسی باتیں کرنا پڑ رہی تھیں۔ درختوں میں ہوائیں سنسناتی رہیں۔

اور دفعتہً رخشندہ کو محسوس ہوا کہ یہ سب کتنا بیکار ہے۔ اور اس کے سامنے پی چو اس کا بھائی کھڑا تھا اور ابھی جو کچھ وہ کہنے والا تھا۔ وہ اس کے ذہن میں کوندگیا

اور عفران منزل غیر معمولی طور پر خاموش اور سنسان پڑی تھی۔

رات کا کھانا کھائے بغیر پی چو اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا اور اپنی مسہری پر آن گری۔

ایک اور صبح ہوئی اور گل شبّو نے پی چو کے کمرے میں جا کر کہا "پی چو بھیا کرسٹابل بٹیا کا پھون آوا ہے"۔ اور اس نے چلا کر کہا "میں کیا کروں فون آیا ہے تو۔ چلی جاؤ میرے سامنے سے"۔ وہ سہم کر باہر چلی گئی اور وہ وردی پہن کر شوں شوں کرتا پولس لائینز پریڈ لینے چلا گیا۔

پھر گل شبّو رخشندہ کے کمرے کی طرف آئی۔ "بٹیا"۔ اس نے آہستہ سے پکارا "ہاں۔ کیا ہے گل شبّو"۔ اندر سے بٹیا کی آواز آئی۔ اب تک وہ خوب گہری نیند سو رہی تھیں اور وہ چاء لے کر تین دفعہ دروازے سے واپس جا چکی تھی۔ اس نے سوچا۔ کل سے بٹیا اور بھیا کا مزاج بگڑا ہوا ہے۔ کہیں بٹیا بھی اسے نہ ڈانٹ دیں اس نے رسان سے کہا "ابھی کرسٹابل بٹیا پھون کئے رہن چھوٹے بھیا کو پوچھت رہن بھیا ہم پر بگڑے لاگے ———"

وہ پوری طرح جاگ کر ایک طویل انگڑائی لینے کے بعد اٹھ بیٹھی۔ کرسٹابل نے سویرے سویرے غالباً کسی پکنک کا پروگرام بنانے کے لئے فون کیا ہو گا۔ کیونکہ موسم اتنا بہترین ہو رہا تھا اور پی چو اس سے بات کئے بغیر بگڑ کر چلا گیا۔ اس نے دریچے سے باہر پھر نظر ڈالی۔ موسم بہت ہی پیارا اور بھلا معلوم ہو رہا تھا اور بارش رات بھر برس کر کھلی تھی۔ ایسے میں بیٹھ کر میں چودھری شمیم کے خطوں کا سوگ مناؤں۔ ہشت ——— یعنی کہ ہتّو وشت ——— ارے پی چو اتنے جلدی پریڈ پہ کیوں چلا گیا (یہ سب تو اتنی بیکار، بیحد حماقت زدہ باتیں ہیں) اور پھر گل شبّو نے آہستہ سے پکارا۔ ابھی کرسٹابل بٹیا پھون کئے رہن۔ وہ مسہری پر کاہل بلی کی طرح اوندھی لیٹی رہی اور ہوا میں اس کے بال اڑتے رہے۔ اس نے گل شبّو سے کھڑکی بند کرنے کے لئے نہیں کہا۔ اسے

اب یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ واقعی اللہ میاں۔ اب میں ان ساری باتوں کا کہاں تک سوگ کروں۔ لیکن پی چو اتنے سویرے ہی پولس لائینز جا چکا تھا (کرسٹابل سے فون پہ بات کئے بغیر) — کرسٹابل۔ کرسٹابل۔ کرسٹابل۔ ٹھیک ہے۔ بس یہی بات ہے ساری۔ در اصل۔ لیکن یہ غلط ہے۔ بالکل اصول کے خلاف بات ہے۔ (بہت ہی خوفناک قسم کا واقعہ ہے درحقیقت۔ وہ یکلخت اٹھ بیٹھی اور تکیوں کے سہارے ہاتھوں پر ٹھوڑی ٹکا کر غور کرنے لگی) گویا یہ بالکل صحیح ہے کہ پی چو، اس کا بھائی، اس کے علاوہ کسی اور ہستی کو بھی چاہ سکتا ہے۔ خواہ کرسٹابل، حفیظ احمد جیسی دلکش ہستی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بچپن سے ان سب گدھوں سے چپکے چپکے اور نہایت شدت کے ساتھ جلا کرتی تھی جو پی چو کو پسند کرتے تھے۔ پی چو کی محبت پر صرف اس کا حق تھا۔ صرف وہ ہی پی چو کی بہن تھی اور سب کمبخت کیوں اسے خواہ مخواہ چاہنا شروع کر دیتے تھے۔ پی چو بے حد خوبصورت تھا اور یہ بڑی مصیبت تھی۔ سینٹ جوزفز کے وہ بڑے لڑکے اور اس کے اسکول اور کالج کی ساری لڑکیاں وائلڈ فلاور ہال اور زعفران منزل محض اسی لئے آتی تھیں۔ حالانکہ پی چو کو صرف اس کا ہونا چاہیئے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ سے توام بچوں کی طرح زندگی گذاری تھی۔ انہوں نے آج تک سب کام اکٹھے کئے تھے۔ ساری باتیں اکٹھی سوچی تھیں۔ اپنا خوبصورت، کبھی واپس نہ آسکنے والا بچپن اکٹھا گذارا تھا۔ وہ نینی تال کی چاندنی راتوں میں لمبے لمبے پہاڑی راستے، ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے، طے کرتے، ایک ساتھ نئی نئی شرارتوں کے پروگرام بناتے۔ وہ چڑیوں کے انڈے چراتی، جھیل میں اکیلی ناؤ کھینے کی کوشش کرتی۔ اسکول کا کام کبھی نہ کرتی۔ اور پھر بھی جانے کس طرح ہمیشہ فرسٹ آجاتی۔ پی چو کی چیزیں کھو دیتی

اور جو چیزیں کھونے سے بچ رہتی تھیں۔ انہیں بڑی صفائی سے چرالیتی۔ وہ اسے خوب ڈانٹتا۔ پولو ان دونوں سے بہت بڑا اور بہت سنجیدہ اور الگ تھلگ رہنے والا انسان تھا صرف پی چو کے لیئے وہ ایک مستقل قیامت تھی۔ وہ اسے ڈانٹتے ڈانٹتے اور لڑتے لڑتے تھک جاتا تو اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ وہ اس سے پورے سات برس بڑا ہے۔ پورے سات برس۔ اسے اس کے سارے حکم ماننے چاہئیں پھر وہ گھنٹوں روتی اور اسے منانا پڑتا۔ وہ کبھی برداشت نہ کر سکتا تھا کہ یہ شیطان کی اپنی نواسی بھولی خرگوشنی کی طرح بگڑی رہے۔ پھر وہ نہایت رقت بھری آواز میں مظلومیت سے کہتی "پی چو چو کو بازر کھلاؤ گے" جب وہ خوب لڑ بھڑ لیتے۔ تو وہ اپنا چوکولیٹ یا آئس کریم کا وعدہ پورا کرتا اور وہ دونوں خوش خوش کسی ریسٹوران یا میٹروپول میں جاتے۔ وہ بے حد لیڈی لائیک طریقے سے کرسی پر بیٹھ کر پی چو کے لئے چائے بناتی اور بڑے اخلاق اور تکلف سے پوچھتی "پی چو ڈارلنگ کتنی شکر؟" اور بڑے اہتمام سے شکر گھول کر چمچہ طشتری میں رکھتی اور پتلی پتلی انگلیوں سے، ایک انگلی بڑے آرٹسٹک انداز اور بڑی نزاکت سے اٹھا کر بالکل جس طرح میٹروپول کے ڈرائینگ روم میں بیگمات پیالی اپنے ہونٹوں تک لے جاتی تھیں۔ وہ چائے پیتی تھی اور پی چو میز کی سطح پر کوئی گت بجاتے ہوئے دریچوں کے شیشے سے باہر، برستی ہوئی بارش کو بے دلی سے دیکھتا رہتا اور بارش کے قطرے جھیل کی سطح پر ان گنت چھوٹے چھوٹے بھنور بناتے رہتے۔ ان دونوں کی یہ دنیا بڑی مکمل تھی لیکن پھر دفعتہً اس میں یہ کمبخت رقیب پیدا ہونے شروع ہو گئے — کرسٹابل۔ کرسٹابل۔ کرسٹابل والے یار شادی شدہ عورتوں اور مردوں سے عشق لڑانا غالباً زیادہ دلچسپ اور زیادہ

فلیش ایبل مشغلہ ہے۔ اس میں سُنا ہے کہ بہت "گلیمر" ہوتا ہے۔ کسی دوست نے پی چو سے ایک رات دلکشا کلب میں کہا تھا۔ ارے بھائی گولی مارو گلیمر کو یہاں رستی گم ہوئی جارہی ہے۔ پی چو نے بیحد اکتا کر اسے جواب دیا تھا)۔۔۔

اصول کے خلاف۔۔۔ بالکل اصول کے خلاف یہ شادی شدہ لڑکی سے عشق لڑانا۔۔۔ (وہ کنور عرفان علی خان کی بیٹی تھی) وہ کروٹ بدل کر پھر لیٹ گئی اور ہوا میں اڑتے ہوئے بالوں کو پیشانی سے ہٹا کر پھر غور و خوض میں مصروف ہو گئی۔۔۔ اور پھر اسے خیال آیا کہ اگست کی وہ تاریخ بالکل قریب آن پہنچی تھی۔ جب ملک بھر میں سید افتخار کے ساتھی سیاہ جھنڈے نکال کر اپنے غم و غصے کا اظہار کرنے والے تھے۔ ارے بھئی اللہ میاں۔۔۔ سوچتے سوچتے تھک کر وہ اٹھی اور گیلری میں جا کر اس نے کرن کو فون کیا۔ دوسرے سرے پر کرن بڑا خوش اور بشاش معلوم ہوتا تھا (غالباً یہ بھی اس پیارے سہانے موسم کا اثر تھا) اس نے بیحد عاجز آکر رنجیدہ آواز میں کرن سے کہا۔ "دیکھو تو کرن بھائی۔ پی چو کتنا جنگی خرگوش ہو گیا ہے میسوری میں سارے وقت مجھ سے لڑتا رہا۔ میاں کے پاس اوپر نہیں جاتا۔ ممی سے تو اس نے اس امبر پور ہاؤس کے قصے کی وجہ سے مدتوں سے لڑائی ٹھان رکھی ہے اور پھر ممی مجھ پر بگڑتی ہیں کہ میں اسے نہیں سمجھاتی اور پھر اگلے ہفتے وہ کالے جھنڈوں والی تاریخ آرہی ہے۔ جب قوم آکر ہمارے گملے اور کھڑکیوں کے شیشے توڑے گی اور اخباروں میں اس کی خبریں چھپیں گی۔ یہ سب سنکر کرن کو اس کی اس بچوں کی سی شکایت پر ہنسی آگئی۔

وہ بھی ہنس پڑی۔ باہر بارش پھر شروع ہو گئی۔

بارش ہو رہی ہے اور برآمدے میں پرانے پرانے ریکارڈ بج رہے ہیں اور
اسوک کے درخت پانی کی بھواروں سے جھکے جا رہے ہیں۔ شہلا ڈارلنگ یوں
نہیں۔ ایسے قدم رکھو۔ کوئیک کوئیک سلو سلو۔ کوئیک کوئیک (اور یہ
سب کمبختیں ایک دوسرے کے ساتھ ہی ناچے جا رہی ہیں اور باہر کی گیلی زمین میں
سے کتنی سوندھی خوشبو نکل رہی ہے) پندرہ برس پہلے کے ایک نغمے کے ریکارڈ
کے ساتھ ساتھ شہلا رحمٰن برآمدے کے فرش پر اپنے قدم رکھتی رہی۔ زینت آپا
اسے سکھاتے سکھاتے تھک کر آرام کرسی پر جا بیٹھیں (یہ نور منزل ہے۔ یہ
میں ہوں۔ یہ شہلا رحمٰن ہے جس کا اصلی نام صالحہ خاتون ہے۔ شہلا اس کا قلمی
نام ہے۔ کتنی رومینٹک، گھنگھریالے بالوں والی لڑکی ہے۔ کتنا رومینٹک موسم
ہے۔ شہلا انگریزی رقص سیکھ رہی ہے۔ ڈوروتھی سب پرانے پرانے ریکارڈ
کومن روم میں سے اٹھا لائی ہے۔ کاش یہ کمبخت برکھا کا موسم کیلنڈر میں سے
ہی نکل جاتا۔ یہ سب کمبختیں ایک دوسرے کے ساتھ ہی ناچے جا رہی ہیں وائی
ڈبلیو۔ سی۔ اے کی یہ اتنی بڑی کوٹھی جو نور منزل کہلاتی ہے۔ اس کے چاروں
طرف پھیلے ہوئے یہ ہرے لان، یہ اونچے اونچے بارش میں جھومتے ہوئے اسوک
کے درخت، لان کے سرے پر پہرہ دیتا ہوا یہ اونچا، بھورا چرچ، یہ سب چیزیں
پانی میں خاموشی سے بھیگتی جا رہی ہیں اور اتنی خاموشی طاری ہے۔ ہر چیز اتنی سنسان
پڑی ہے۔ وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے میں رہنے والی یہ بیچاری اولڈ میڈز! اس لڑکی
اس رخشندہ نے اتنے ترحم آمیز لہجے میں اپنی دوست گنّی سے کہا تھا۔ ان میں
سے کچھ برآمدے میں گراموفون کی موسیقی کے ساتھ رقص کرنے کی کوشش میں مصروف

ہیں اور باقی سب کومن روم میں شاید کیرم کھیل رہی ہیں اور امریکہ سے ہر مہینے آنے والے رسالے "مائی چرچ" کے پرچے دیکھ رہی ہیں)

"زبینت آپا دوسرا ریکارڈ لگاؤں؟" شہلا اپنی پارٹنر کے ساتھ ناچتی ناچتی برآمدے کے دوسرے حصّے کی طرف چلی گئی۔ زبینت ریاض آرام کرسی پر لیٹی رہی (آج آج تو ہفتہ ہے۔ شام کو سیٹرڈے کلب کی میٹنگ کے لئے میں کونسی ساری پہنوں ــــ انھوں نے سوچا) زبینت ریاض 'اعلیٰ تعلیم یافتہ' لڑکیوں کے اس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں جنھوں نے اپنے خیال میں 'سوسائٹی کے قوانین' اور 'دنیا کے طے شدہ اصولوں' اور اپنے 'خاندان کی روایتوں' سے گویا بڑی زبردست بغاوت کی تھی۔ انھوں نے کالج کے زمانے میں بڑی بڑی اسکیمیں بنائی تھیں۔ یہ کریں گی وہ کریں گی اور بالآخر ایک معمولی سے گرلز کالج میں چار سو روپے ماہوار (معہ گرانی کے الاؤنس) پرنسپل ہو گئی تھیں اور باقی روپیہ گھر سے منگاتی تھیں اور وائی ڈبلیو۔ سی۔ اے میں رہتی تھیں اور عورت کی 'ذہنی' اور 'معاشی' اور 'سماجی' آزادی کی سخت قائل تھیں (شہلا رحمٰن سیٹرڈے کلب کی نشستوں میں بحث کرتے ہوئے بڑے دلکش انداز سے ہاتھ ہلا کر کہنا شروع کرتی۔ دیکھئے نا ــــ کتنی آپ لوگوں کی زیادتی ہے۔ کہ مرد تو جو چاہتا ہے۔ کرتا ہے۔ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی ــــ لیکن بچاری لڑکیاں ــــ واقعی بچاری لڑکیاں، سب ہمدردی سے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر مردوں کے بنائے ہوئے سماج کی زیادتیوں پر غور کرنے میں مصروف ہو جاتے) ــــ زبینت آپا کے خیال میں اس 'ذہنی آزادی' کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ دنیا جہان کی ساری باتوں پر بالکل

بے لاگ اظہار خیال اور تبصرہ کیا جائے۔ خدا کی اس خوبصورت، آزاد کھلی فضاؤں والی دنیا میں انسان نے اپنے آپ کو قدم قدم پر کتنا مقید کر رکھا ہے۔ لیکن اس بلند انٹلکچویل سطح پر پہنچ کر، سیٹرڈے کلب کی ان نشستوں میں ایک دوسرے سے یہ بحثیں کرتے ہوئے مخالف جنسوں کے ممبروں کو دفعتہً یہ پتہ چلتا کہ ارے یہ تو شدید قسم کے عشق کی ابتدا ہے اور کچھ عرصے تک وہ انٹلکچویل باتیں تکلفاً اور اخلاقاً گھسیٹی جاتیں اور پھر دنیائے آب و گل میں اترآنا پڑتا اور دونوں طرف سوچا جانے لگتا کہ اباّ میاں کو کس طرح اطلاع دلوائی جائے اور امی سن لیں گی تو کیسے ڈانٹیں گی اور نہ معلوم اس کی تنخواہ کتنی ہے یا یونہی انٹلکچویل بنتا ہے۔ زینت آپا کے دوستوں کا حلقہ روز بروز وسیع تو ہوتا جاتا تھا۔ نور منزل میں مختلف دفتروں اور کالجوں میں کام کرنے والی جتنی لڑکیاں اور عورتیں رہتی تھیں۔ ان سب پر زینت آپا کا کافی رعب تھا۔ زینت آپا نے قسطوں پر ایک چھوٹی سی فورڈ خرید رکھی تھی۔ ان کا اپنا ٹیلی فون نمبر تھا۔ وہ لکھنؤ کی اعلیٰ ترین سوسائٹی میں شامل رہتی تھیں۔ پچھلے دنوں سے انہوں نے لال باغ کے ایک مغربی موسیقی کے اسکول میں پیانو بھی سیکھنا شروع کر دیا تھا اور "ای فلیٹ میجر اور مائنر" کے سارے رموز جان گئی تھیں۔ دوستوں نے تو یہاں تک تجویز کیا تھا کہ اگلے الیکشن میں اسمبلی کی ممبری کے لئے کھڑی ہو جایئے۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ ایک بہت ہی کامیاب اور قابل تقلید کیریر وومن تھیں اور آج صبح سے بارش رکنے کا نام نہ لیتی تھی اور شہلا رحمٰن کو جو ان کے کمرے کے برابر والے کمرے میں رہتی تھی انہوں نے رقص سکھانے کا وعدہ کیا تھا اور اپنی سائیکل یا رکشا پر اس وقت وہ کہیں نہ جا سکتی تھیں۔ حالانکہ موسم اتنا دلچسپ تھا موٹر کے کوپن صرف ڈاکٹر سکینہ کے

کے ذریعے بہت سے مل جاتے تھے اور ڈاکٹر سنگسینہ آج کل اپنی ولایت پلٹ بیوی سے ملنے شملہ گئے ہوئے تھے) سنہلا رحمن تو اتنی جلدی فوکس ٹروٹ والمز سب سیکھ گئی کہ اس نے ایک کے بعد دوسرے ریکارڈ بجانے شروع کر دیئے اور دوپہر کے کھانے کی گھنٹی بجنے کے وقت تک برآمدے میں ڈورو تھی منوہر لال کے ساتھ ناچتی رہی۔ اتنی جلدی دن ڈھلنا شروع ہو گیا۔ ایک اور دن ختم ہوا۔ آج سیٹر ڈے کلب کی نشست ہے اور کل اتوار ہے۔ ٹھنڈا، آرام دہ، مطمئن اتوار جب صبح صبح لان کے اس پار چرچ میں گھنٹے بجنے شروع ہو جائیں گے۔ کل دھوبی ڈے ہے۔ مراری کو دھونے کے لئے کپڑوں کی لادیاں دینے کے بعد یہ سب اپنی اپنی روحوں کی صفائی کے لئے چرچ جائیں گی۔ وہاں شاہ بلوط کی لکڑی کی قربان گاہ پر ریورنڈ چارلس فریزر کرم سنگھ وہی ساری باتیں اس اتوار کو دوبارہ دہرائیں گے جو خداوند ہمارے خدا کو پہلے ہی سے اچھی طرح معلوم رہی ہوں گی۔

"بارش ہو رہی ہے۔ سلیم اس اتوار کو پرتاب گڈھ سے نہ آسکے گا۔" کرن نے پورٹیکو میں بیٹھ کر آم کھاتے کھاتے آسمان کو دیکھ کر کہا۔ بارش ہو رہی ہے۔ ساون کے بادل بہت نیچے جھک آئے ہیں۔ زمین میں سے سوندھی سوندھی خوشبو اڑ کر ہواؤں میں گھل مل رہی ہے۔ ہوا کے جھونکے اپنے ساتھ بارش کے قطرے بکھیرتے جا رہے ہیں۔ وہ قطرے گنّی کے بالوں پر آپڑتے ہیں۔ رخشندہ کی ساری پر گر جاتے ہیں۔ برآمدے میں پھوار کا پانی دیوار تک آگیا ہے۔ گنّی کے بال بھیگے جا رہے ہیں چلو کیچڑ میں چھپک چھپّا مچائیں۔ چلو باہر چل کر جامنیں گرائیں۔ آم کے باغوں پر کالی

گھٹائیں جھکی کھڑی ہیں۔سلیم نہیں آسکے گا۔سلیم کہیں اپنے ریسٹ ہاؤس میں بیٹھا ہوگا۔جس کی پھونس کی چھت پر مینہ برس رہا ہوگا جس کے چاروں طرف آم اور فالسے کے جھنڈ ہوں گے۔

"بارش ٹھہر گئی۔چلو کہیں باہر چلیں"۔گنتی چلائی۔چلو کافی ہاؤس تک پیدل جائیں بڑا خوشگوار خیال تھا بھیگی ہوئی طویل، کالی، چمکدار خاموش سڑک بے حد اچھی معلوم ہوتی ہے۔جی چاہتا ہے اس پر آرام سے بلیوں کی طرح لیٹ جائیے۔یا اس کے کنارے ٹھنڈی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر قریب لگی ہوئی مہندی کی باڑ میں سے پتے توڑ توڑ کر پھینکتے رہئے۔وہ سب اٹھ کھڑی ہوئیں۔انہوں نے چھتریاں اور برساتیاں سنبھالیں اور درختوں کی ڈالیوں کو جو ہوا اور پانی کے بوجھ سے بہت نیچے جھک آئی تھیں اور جن میں سے بکلخت پانی کی بوندیں ٹپک پڑتی تھیں۔اپنے سامنے سے ہٹاتی ہوئی وہ باغ کی روش پر آگئیں۔جب یہ بوندیں پتوں میں سے ایک دم سے برس پڑتی ہیں اور بھیگے ہوئے تر و تازہ پھولوں کی خوشبو ناک میں گھستی ہے تو بہت عجیب سا لگتا ہے۔لیکن کافی ہاؤس تو بہر حال جانا ہے۔رخشندہ آگے آگے چلتی رہی۔پورٹیکو کی سیڑھیوں پر کرن بیٹھا تھا۔کرن ہم کافی ہاؤس جا رہے ہیں۔جاؤ اس نے ویسے ہی بے تعلقی سے جواب دیا۔کیا اینیچیوں کی طرح مراقبے میں مصروف ہو۔ہم حضرت گنج جا رہے ہیں۔تمہیں وہاں سے کچھ چاہئے تو نہیں؟" "نہیں"۔ اس نے جواب دیا۔"کرن کے لئے ٹافی لیتے آئیں گے"۔ڈائمنڈ نے فیصلہ کیا۔وہ سب آگے چلی گئیں۔

نہیں اسے تو کچھ نہیں چاہئے تھا"۔ وہ غفران منزل کے پورٹیکو کی سیڑھیوں پر

بیٹھا تھا۔ بارش دوپہر بھر برس کر ٹھہر چکی تھی۔ اسے ٹافی، گنّی، عالمگیر امن، انڈونیشیا کی آزادی کچھ نہیں چاہیئے تھا۔ ہوا اس کی ناک میں گھس رہی تھی۔ اس میں باغ کے سارے پھولوں، پھلوں اور نئے ہرے پتوں کی خوشبوؤں کی لپٹیں امنڈ رہی تھیں۔ غفران منزل کے پچھلے حصّے میں اودے، سُرخ اور سبز لہنگوں والی مہریاں اپنے بسنتی دوپٹے اڑاتی کڑے بجاتی ادھر سے اُدھر آجا رہی تھیں۔ گھاس میں سُرخ مخمل جیسی بیر بہوٹیاں رینگ رہی تھیں۔ نہیں۔ اسے کرن بہاور کا لجو کو کچھ نہیں چاہیئے تھا۔ اس کا دل بیٹھ رہا تھا اور یہ بڑا اچھا لگ رہا تھا (ارے ہائے۔ یہ رنگ۔ تیز سبز گھاس۔ سُرمئی بادل۔ سُرخ پھول، اُودی جامنیں)

وہ پھاٹک سے نکل کر اوٹرم روڈ پر آگئیں۔ گنّی کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ ڈائمنڈ نے اپنے بال اسکارف میں چھپا لئے تھے۔ رخشندہ نے غرارے کے پائنچے اٹھا لئے تھے۔ وہ سب بارش کے پانی میں سے سنبھل سنبھل کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ گنّی کے بال بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ گنّی بڑی پیاری لڑکی ہے۔ ڈائمنڈ اور بھی زیادہ پیاری ہے۔ میں تو خیر ہوں ہی بے انتہا سویٹ۔ کرن بھی سویٹ ہے پی چو بھی۔ دنیا بڑی اچھی جگہ ہے۔ رخشندہ نے طے کیا۔ "سلیم نہیں آسکے گا۔" ڈائمنڈ نے چلتے چلتے رک کر پانی سے بھرے ہوئے ایک چھوٹے سے گڑھے پر سے کودتے ہوئے کہا۔

"کیا بارش اب بھی ہو رہی ہے؟" پی چو نے برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹے لیٹے ایک آنکھ آدھی کھول کر پوچھا۔ "سلیم نہ آسکے گا۔"

"ہُمم۔ بالکل نہ آسکے گا۔ پی چو آم کھاؤ گے؟" کرن نے وہیں سیڑھیوں پر

بیٹھے بیٹھے پوچھا۔ وہ دراصل اس وقت اتنا سنجیدہ نظر آرہا تھا کہ کرن کو خوف ہوا کہ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہے۔

"نہیں ہیں آم نہیں کھاؤں گا" پی چو نے برآمدے میں سے جواب دیا۔ "لڑکیاں ٹافی خرید کر ابھی واپس نہیں آئیں؟" (تم اسے جو چاہو کہہ لو کرن بھائی۔ یہ بہرحال تمہارا جرمن فلسفہ نہیں ہے۔ تمہارے حماقت زدہ سیاست اور آرٹ اور کلچر کے نظریئے نہیں ہیں) لڑکیاں ٹافی خرید کر ابھی نہیں لوٹیں؟" اس نے پھر پوچھا

نہیں، اسے، کرن بہادر کا بجو کو کچھ نہیں چاہئے تھا۔ وہ سیڑھیوں پر پتلے کی طرح چڑھا بیٹھا رہا۔ ہوا میں درختوں کی ڈالیاں ہلیں اور بہت سی بوندیں گھاس پر گریں وہ تینوں واپس آگئیں کشمیر فروٹ مارٹ کے بہت سے کاغذ کے پیکٹ اٹھائے وِمل ان کے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔

"ہم ریڈیو اسٹیشن سے وِمل کو بھی پکڑ لائے"۔ گنی نے بیحد شگفتگی سے کہا "کافی ہاؤس میں ہمیں شہلا رحمٰن اور زینت آپا ملی تھیں۔ ہم نے انہیں بھی مینگو پارٹی کے لئے مدعو کر لیا"۔ ڈائمنڈ نے بہت خوش ہو کر اطلاع دی۔

"کافی ہاؤس میں گلیمر تو اٹے بھی نظر آیا تھا۔ بے حد ہینڈسم لگ رہا تھا" رخشندہ نے بتایا (وہی رسی؟ پی چو نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے آدھی آنکھ کھول کر یاد دلانا چاہا)

"آج دن بھر کی خبریں کیا ہیں؟" وِمل نے سیڑھیوں پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا

"سلیم اب تک پرتاب گڈھ سے نہیں آیا"۔ پی چو نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اسے مطلع کیا۔

"رمینا اور گیندا میں آج پھر لڑائی ہوئی"۔ رخشندہ نے ٹافی کا ڈبہ کھولتے ہوئے وہل کو بتایا۔

"چلو انہیں دیکھ آئیں"۔ ڈائمنڈ نے تجویز کیا۔

وہ سب پورٹیکو میں سے نکل کر باغ کی بھیگی ہوئی سڑک پر ٹہلتے ہوئے اصطبل کی طرف آ گئے۔

پولو کے سائیس رام بھروسے کی پہلی بیوی رمینا منہ پھیلائے ایک طرف کو بیٹھی جھما جھم برتن مانجھ رہی تھی۔ اس کی طرف سے پشت کئے اس کی سوت گیندا ایک پیڑھی پر بیٹھی آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔ سینئر اور جونیئر دونوں مہارانیوں کا ڈاٹیلوگ اپنی کلائمکس پر تھا۔ گیندا کو رام بھروسے چند ماہ پہلے باضابطہ گونا کرا کے گاؤں سے لایا تھا۔ لیکن رمینا کہتی تھی کہ صفا بھاگ کر آئی ہے چڑیل۔ رمینا بڑی طبع موزوں کی مالک تھی۔ اپنی سوت کے لئے اس نے ایک دوہا کہا تھا "گیندا مرے کوئی رو نہ بو ہی نہ۔ گیندا کا پھول کوئی چھو نہ بو ہی نہ" جسے سن کر رخشندہ بٹیا اتنا ہنسی تھیں۔ بٹیا اور بھیا لوگ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ دونوں ہڑ بڑا کر کھڑی ہو گئیں گیندا نے جلدی سے گھونگھٹ کھینچ لیا۔ رمینا عفران منزل کے اندر مہریوں میں کام کرتی تھی اور شعلہ پری، گل شبو، الماس اور زمرد کی صحبت میں رہ کر خاصی تعلیق ہو چکی تھی۔ اس لئے اس نے گھونگھٹ نہ کھینچا۔ بلکہ بڑے انداز سے اپنے گھنے سیاہ بالوں کی لٹوں کو جو برتن مانجھتے میں چہرے پر بکھر گئی تھیں۔ پیچھے سمیٹتے ہوئے اس نے پوچھا۔ کہ پی چو بھیا کا زکام اب کیسا ہے اور بٹیا لوگ کیا آج پکوان نہ پکائیں گی۔ دیکھئے کتنی گھور کالی بدلی گھر آئی ہے۔

وہاں۔ چلو پکوان پکائیں"۔ ڈائمنڈ نے اور بھی زیادہ خوش ہو کر تجویز کیا۔ وہ اور گنی اور رخشندہ فوراً بڑی شگفتگی سے غفران منزل کے اندر چلی گئیں۔

بس یہ بات ہے ساری۔ یہی سارا قصہ ہے دراصل"۔ گرن نے دفعتہً محسوس کیا۔ لڑکیاں جہاں ہوتی ہیں۔ وہاں چاؤ ہوتی ہے۔ خلوص ہوتا ہے۔ گرمی، روشنی اور زندگی ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ باورچی خانہ ہوتا ہے (روشی بی بی ذرا وہ لگری بک بھجوا دینا جو تم نے کل یونیورسل سے خریدی ہے۔ گنی کو چاہیئے۔ ایک روز جب اُس نے غفران منزل کے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا تو دوسرے سرے پر مسز لشیو دھرا کول کو کہتے سنا۔ یہ چاہے آئی۔ سی۔ ایس کی لونڈیاں ہوں۔ چاہے قوم کی لیڈری کرتی ہوں۔ پکوان ضرور پکائیں گی۔ یقیناً مسٹر کول کے ہاں کوئی بردکھوا ہونے والا ہے۔ اُس نے سوچا تھا)

وہ تینوں ٹہلتے ہوئے برآمدے کی طرف واپس چلے گئے۔ مینہ چھما چھم برسنا شروع ہو گیا۔

اوہ گوش۔ بارش اب تک کم نہیں ہوئی۔ پیاری ایمیلی نورمنزل میں سینٹ جوزف کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے ہیں۔ پیاری ایمیلی مما شام کی چاء کے لئے کیک تیار کر رہی ہے۔ پیاری ایمیلی آؤ اپنی دعائیں کہیں سینٹ میری کی تقدیس اور فضل کی دعائیں (سینٹ میری جس نے کسی آدمی کو جانے بغیر ہمارے لارڈ کو جنم دیا۔ اور ہمارا لارڈ جس نے میرے اور تمہارے لئے کانٹوں کا تاج پہنا۔ چلو ایمیلی کرسمس ماس کا وقت بہت قریب آگیا ہے) برآمدے کی لکڑی کی ہری جالی پر جو بیل

باہر سے جھک آئی ہے اور اس کے سُرخ پھول بارش کی پھواروں میں جھومتے ہوئے اتنے خوبصورت لگ رہے ہیں۔ یہ موسم اتنا پیارا ہے۔ یہ دنیا اتنی اچھی ہے۔ لیکن جب مما اسٹوو پر آلو ابالتی ہے اور چائے کی کیتلی گنگنانے لگتی ہے تو کھانے کی میز پر آ کر گریس کہنے کے بجائے تم چپکے سے کہتی ہو ڈیم اٹ آل ——) خداوند ہمارے خدا کا نام پاک ہو جس نے آج کے دن ہمیں روٹی دی۔ ایملی سسٹر یہ تو میں ہوں تمہارا چھوٹا، پیارا بھائی جم۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ میں آج سنڈے اسکول نہیں جاؤں گا میں کتھک ناچ نہیں ناچوں گا۔ یہ اتنی حماقت ہے۔ ایملی ڈارلنگ یہ تمہارا اتنا دیوانہ خیال تھا کہ میں ہندوستانی ناچ سیکھوں اور مرد ہو کر گھنگھرو پہنوں۔ ڈارلنگ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ یہ مجھے بالکل سوٹ نہیں کرتا۔ میں نیوی میں جاؤں گا۔ ڈارلنگ میں سیلر بنوں گا میں تمہیں اپنے ساتھ ساری دُنیا گھماؤں گا۔ نیلے نیلے سمندر اور سفید برف کی چٹانیں اور —— اور یہ سب کچھ۔ خداوند ہمارے خدا کی اتنی بڑی دُنیا بہت خوبصورت، بہت اچھی ہے۔ تمہارے اس حماقت زدہ نے فیئر سے آگے بھی ایک بہت وسیع کائنات ہے۔ اس میں بڑے اچھے اچھے انسان بستے ہیں۔ بڑی اچھی اچھی چیزیں نظر آتی ہیں۔ میری پیاری سسٹر ایملی تم تو آرام کرسی پر لیٹے لیٹے سو رہی ہو (جانے پانی کب رُکے گا)

ہاں۔ بارش ہو رہی ہے۔ وہ نہیں آسکے گا۔ وہ اپنی بڑی سی کوٹھی یا کسی خوبصورت ریسٹ ہاؤس میں بیٹھا ہوگا جس کے چاروں طرف آم کے جھنڈ ہوں گے۔ سینٹ جوزف کے گھنٹے بجے جا رہے ہیں اور اتنا اچھا موسم ہے۔ یہ آلو بی کوارٹ ہے۔ یہ میں ہوں، میرا چھوٹا پیارا بھائی جم ہے۔ ماسٹر جیمس مک گریگر۔ میرا اصلی نام ایملی مک گریگر تھا

کوئین روز میرا پروفیشنل نام ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں بہت تھک گئی ہوں۔
میں آج کہیں نہیں جاؤں گی۔ برآمدے کی سُرخ پھولوں والی بیل پانی میں اتنی خاموشی
سے بھیگتی جارہی ہے۔ اتنی بارش میں وہ نہیں آئے گا۔

وہیں آرام کرسی پر لیٹے لیٹے اسے نیند آگئی۔ کیونکہ اسے گھنٹوں کیبرے کی نئی
نئی قلابازیاں سیکھنی پڑتی تھیں اور پپا کا چقندر ایسا منہ بہت ہی سُرخ رہتا تھا۔ پہلے وہ
ریل کا انجن چلایا کرتا تھا۔ اب دن بھر صوفے پر پڑا اونگھتا تھا۔ جب وہ ای۔آئی۔آر
کے دفتر میں سو روپے پاتی تھی تو وہ سب نظر باغ میں صرف دو کمروں میں رہتے تھے
جس کے آگے ایک پتلا سا برآمدہ تھا اور اتوار کے روز وہ ای۔آئی۔آر انسٹیٹیوٹ
ناچنے جاتی تھی۔ لیکن ٹرینوں میں لوگوں کی سیٹیں ریزرو کرانے کے کام سے وہ سخت
اکتا گئی اور جب سے پپا لوکو شیڈ چھوڑ کر آگئے تھے۔ اسے بھی جھاڑی پانی کے
اوک گروو اسکول سے (جو ریلوے والوں کے بچوں کے لئے مخصوص تھا) واپس آنا
پڑا تھا۔ پپا ہر وقت بہت زیادہ سُرخ رہتے تھے اور ممارات کو بہت دیر سے
گھر آتی تھی۔ لیکن جب مما کی ایک ٹانگ موٹی ہونی شروع ہو گئی تو اس نے رات کو باہر
جانا چھوڑ دیا اور پپا نے اسے ایک کمرشل اسکول میں ٹائپ سیکھنے کے لئے داخل
کر دیا۔ وہاں بہت اچھا لگتا تھا۔ گرمیوں میں وہ سب کلاس کے بعد برآمدے
اور ٹیرس پر چلے جاتے تھے اور گراموفون بجایا کرتے تھے۔ لڑکے ٹافی اور چاکولیٹ
کے پیکیٹ لاتے تھے۔ اتوار کو وہ سب سینڈوچز اور چاء کے تھرموس اور
چلغوزے لے کر بنارسی باغ، دلکشا یا بیلی گارد جاتے اور بے حد مزا آتا تھا۔
جب سڑکوں پر دونوں طرف پھول کھلے ہوتے تھے اور نیلے آسمان پر بادل چھا

جاتے تھے۔ وہ گھاس پر لیٹ کر اپنی بڑے بڑے پھولوں اور بڑے گھیر والی ٹوپی منہ پر ڈھانپ لیتی تھی اور اس کے تنکوں میں سے چھن کر جو ہوا اس کے چہرے کو لگتی تھی۔ وہ بہت ہی اچھی معلوم ہوتی تھی (دل بیٹھ ساجاتا تھا اور یہ بہت اچھا لگتا تھا) پھر مے فیئر کے سندھی مینیجر نے جس کی ہوائی جہاز ایسی اسٹوڈی بیکر ہے۔ اس سے کیبرے میں شامل ہونے کے لئے کہا۔ اس نے ان سندھی لڑکیوں ملکی جانی سسٹرز کی رڈ ڈانس اکیڈمی میں ہندوستانی ناچ بھی سیکھ لیا۔ وہ سب نظر باغ سے آبوی کورٹ میں آگئے (خداوند ہمارے خدا کی یہ دُنیا بہت خوبصورت، بہت اچھی ہے۔ اس میں بڑے اچھے اچھے انسان بستے ہیں۔ بڑی اچھی اچھی چیزیں نظر آتی ہیں۔ پانی میں بھیگتے ہوئے یہ خوبصورت پھول اتنے پیارے لگ رہے ہیں)

"ہاں یہ موسم اتنا پیارا ہے۔" اس نے آنکھ کھول کر جم سے کہا۔

مینہ جھما جھم برستا رہا۔

"ہاں۔ یہ بہرحال تمہارا جرمن فلسفہ نہیں ہے۔" پی چُو نے کہا

کِرن بلّے کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ برآمدے میں لڑکیاں مینگو پارٹی کی تیاریوں میں مشغول تھیں (کلکتے کے قتلِ عام کے حالات دیکھنے کے لئے اپنے اخبار کی طرف سے اسے وہاں بھیجا جانے والا تھا اور اس کی روانگی سے پہلے ہی ان سب نے اس اتوار کو اپنے سارے دوستوں کو بلا لیا تھا۔ روشی بی بی چائے کب ملے گی؟ باہر سے حفیظ احمد چلّایا) وہ سب باہر گھاس پر چائے کی میزوں کے گرد جمع ہو گئے پی چو کاہلی سے ایک طرف کو آرام کرسی پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا

"بارش ٹھہر گئی ہے۔ سلیم آ گیا۔ سلیم یہ پلیٹ لے کر ادھر جاؤ۔ شہلا رحمٰن اسے باتیں کرو۔ وہ بچاری ہماری پارٹیوں میں ہمیشہ نہایت شدّت سے بور ہوا کرتی ہے" وہ سب، ان کے سارے دوست میزوں کے قریب آ گئے (ارے یہ مرد۔ چاء بنوانے کے لئے خود کو کتنا Helpless محسوس کرتے ہیں۔ کرسٹابل پیاری یہ سموسہ لو) ارے پی چو کو تو نیند آ رہی ہے۔ پی چو تم رات بہت دیر تک جاگے ہو۔ تم رات پھر ڈیڑھ بجے تک کلب میں رہے" "ایک بج کر اکیس منٹ تک روشی" ۔ اس نے ایک آنکھ آدھی کھول کر تصیح کی (مرد کا اصل مقام اس کا گھر ہے۔ ورنہ اس میں سب عورتوں والی عادتیں آ جاتی ہیں۔ وہ نہایت باقاعدگی سے کلب جانے لگتا ہے۔ دن بھر دوستوں میں بیٹھا رہتا ہے۔ رات کے بارہ بجے تک برج کھیلتا ہے۔ رخشندہ نے کہا۔ وہ سب اپنی اپنی ملیٹیں ہاتھ میں لئے گھاس پر ادھر ادھر گھومتے اور ہنستے رہے)

"ٹھیک ہے۔ محبت کے لئے ضروری نہیں کہ اس میں ابدیت بھی ہو۔" کرن نے بے حد اپنچھیوں کی طرح سوچا۔ وہ سب، اس کی پیاری بہنیں رخشندہ، ڈائمنڈ اور کرسٹابل بڑی مصروفیت سے گھاس پر بیٹھی آئس کریم بنا رہی تھیں۔ باغ پر بادل پھر گھر آئے۔

"ہاں۔ محبت کے لئے ضروری نہیں کہ اس میں ابدیت بھی ہو۔ یہی بہت کافی ہے کہ مولسری کے پھول ہوا کے جھونکوں سے نیچے گر رہے ہیں اور ہمارے ساتھی ہمارے پاس موجود ہیں"۔ رخشندہ کچھ کلیاں اپنے بالوں میں ٹھونس کر آئس کریم کا سامان سنبھالنے میں مصروف ہو گئی۔

بارش شروع ہو گئی۔" ارے بھئی سب لوگ اندر آ جاؤ"۔ گنّی نے آواز دی

رخشندہ اس قدر تازہ اور بشاش اور صحت مند معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے بالوں میں جلدی جلدی چند شگوفے پتوں سمیت ٹھونس لیے تھے اور ایک آم کھاتی جارہی تھی سٹنگ روم میں داخل ہوتے ہی وہ دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ گویا تم بھی میری طرح خوش کیوں نہیں ہونے " ان دنوں کچھ تازہ ترین اسکنڈلز کے امکانات معلوم نہیں ہوتے " اس نے چاروں طرف دیکھ کر جلیبی سونگھتے ہوئے کہا۔

" فوہ ۔ جلیبی وائلڈ کیٹ " ۔ سلیم نے چپکے سے کہا۔ زینت ریاض بالکل اس کے قریب بیٹھی تھیں۔ وہ فوراً ان سے فسادات کی تازہ ترین صورتِ حال پر گفتگو کرنے میں مشغول ہو گیا۔

" وِمل بھائی دراصل قصہ یہ ہے " وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی کہ " اسکنڈلز کا وجود بڑی طوالت ہے۔ لیکن اسکنڈلز کا فقدان اس سے بھی زیادہ بور کر دیتا ہے " وِمل یہ سُن کر بڑے عالمانہ انداز سے پلکیں جھپکاتا رہا۔

" سمجھے تم۔ تمہارے آرٹ اور کلچر کے حماقت زدہ نظریئے " پی چو چپکے سے غرّایا کرن بالکل چپکا بیٹھا رہا " ارے پی چو۔ کرن۔ سلیم۔ سب لوگ جلدی سے یہاں آؤ۔ آسمان پر اتنی سویٹ دھنک نکلی ہے۔ اتنا اچھا لگ رہا ہے " برآمدے میں سے ڈائمنڈ چلّائی۔ سب پھر باہر چلے گئے۔ وہ وہیں بیٹھا رہا " تم لڑکیوں کے پاس کوئی باضابطہ فلسفہ حیات تو ہے ہی نہیں۔ بس جذبات۔ جذبات " ۔ اس نے بہت ہی عالمانہ طریقے سے کہا۔

" یہ تو واقعی بڑی ٹریجڈی ہے " حفیظ احمد بولا " لو کرن بھائی۔ یہ آم کی آئیس کریم کھاؤ۔ رخشندہ اور کرسٹابل نے بنائی ہے "

"نہیں میں آم کی آئس کریم نہیں کھاؤں گا۔ میں ٹافی بھی نہیں کھاؤں گا۔ جو گنّی لائی تھی۔ کوئی باضابطہ فلسفہ حیات نہیں۔ فوہ۔" ہوا کے بھیگے ہوئے جھونکے سے مولسری کے بہت سے پھول ایک دم نیچے ٹھنڈی زمین پر ٹوٹ پڑے۔

وہ پھول رخشندہ نے اپنے بالوں میں لگا لئے۔ ہاں۔ یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے ساری محبت ہی ٹریجڈی ہے۔ محبت میں پائداری تو بہت ہی مٹیر اف فیکٹ اور ان رومینٹک چیز ہے۔ اس کی ساری ٹریجڈی، ساری خوبصورتی اسی وقت محسوس ہوتی ہے جب اس میں ابدیت اور پائداری کا فقدان ہو (تمہارے لئے اور چاء بناؤں کرسٹابل ڈارلنگ؟)

"یہ کاہے کا فلسفہ ہے رخشندہ بیگم؟" سلیم نے زینت ریاض سے باتیں کرتے کرتے اس کی طرف مڑ کر پوچھا

"یہ — یہ کنفیوژن ازم ہے۔" اس نے بڑی شگفتگی سے بتایا۔

"کنفیوشس — ازم —؟"

"ارے نہیں بھئی۔" اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔" مولسری کے پھول چاروں طرف بکھر گئے۔

ہاں تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ارے نہیں وہ تو سبھی کچھ جانتا ہے۔ ارے وہ تو دیولوک سے آیا ہے (اتنا ونڈرفل۔ سوپر ڈیلیشر اسمبلشر۔ ڈائمنڈ نے کہا تھا) وہ کہے گا دن ہے تو وہ بھی اس کی رائے سے اتفاق کرے گی کہ دن ہے۔ اگر وہ کہے گا کہ رات ہے تو وہ بھی کہے گی کہ یقیناً رات ہے۔ ارے وہ تو اسے کوئی فلسفہ سمجھانے کی کوشش نہ کرے گی۔ بالکل چپکی بیٹھی رہے گی۔ اس کے لئے چاء بنائے گی۔ زندگی

کے ان سارے زلزلوں اور آندھیوں کو دبا اور روک کر اس قدر احتیاط اور اہتمام سے جو توازن قائم کیا گیا تھا۔ وہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ ارے اپنی اس اتنی پیاری دنیا کی ساری ترتیب اور تناسب کو اس نے آکر بالکل تہ و بالا کر دیا) اس نے پھولوں کے بھیگے ہوئے گچھے میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"فیروز بھی آن پہنچا۔ سلیم جاؤ فیروز کو یہیں باغ میں بلا لاؤ" (اس نے پھولوں پر سے چہرہ اٹھا کر دوسرے لمحے پکارا۔" فیروز؟" (یہاں سب کم بخت اس طرح باتیں کرتے ہیں۔ گویا طے شدہ بات ہے کہ سب ایک دوسرے کو ہمیشہ سے جانتے ہیں۔ تعارف کی ضرورت ہی نہیں) "فیروز؟" — "ہاں"۔ اس نے کہا۔ کیا وہ بھی بہت انٹلکچوئیل ہے؟" سلیم نے پوچھا۔ تم نے ہمارے یہاں کون سے خوفناک انٹلکچوئیل کو دیکھا ہے؟ (نہیں۔ وہ انٹلکچوئیل نہیں ہے بچارہ۔ ابھی اس کی ناک طویل ہونی شروع نہیں ہوئی) اس نے کہا تھا۔ یہ چھٹو پادھیا ہے۔ یہ کرن ہے۔ یہ حفیظ احمد ہے۔ "ہاؤ ڈو یو ڈو مسٹر چٹو پادھیا"۔ ول نے بڑی رحم طلب نگاہوں سے بہت بیکسی کے عالم میں اسے دیکھا تھا کہ رخشندہ بیگم میں چٹوپادھیا قطعی نہیں ہوں۔ پھر اس نے سمجھایا تھا۔ دیکھو بھئی سلیم ہم نے سب کے مناسب نام رکھ چھوڑے ہیں۔ تم جالینوس ہو۔ ڈون الورڈی گریٹ گلیمر بوائے ہے۔ یہ چٹوپادھیا ہے۔ یہ نجانے کیوں اس قدر قابل بے تحاشا عالم فاضل معلوم ہوتا ہے کہ اس کا چٹوپادھیا سے بہتر کوئی نام ہو ہی نہیں سکتا۔ ول کمار چٹوپادھیا۔ اور اسی وقت فیروز نے قریب آکر کہا۔ روشی آج تم لوگوں کے پروگرام کی ریہرسل دیکھنے مسز پنڈت بھی آئیں گی۔ تو وہ جمائیں کھاتے کھاتے مڑ کر بولی۔ "واقعی؟ — کتنی کیوٹ بات ہے۔"

ارے یہ دیوانگی، یہ دیوانگی۔ ہوا سے مولسری کی کلیاں برستی رہیں۔ بارش ٹھہر گئی۔ چلو سب لوگ باہر آجاؤ۔" ڈائمنڈ پھر چلائی۔

"رخشندہ بیگم آج تم بے حد خوش معلوم ہوتی ہو۔" اس نے پوچھا

"خوش؟ — ارے بالکل نہیں۔" وہ ٹھنڈا سانس بھر کے رنجیدگی سے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ "ارے ملک میں اتنی تباہی مچ رہی ہے۔ ذرا سوچو تو۔ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے"۔ اس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ گویا اب وہ یونیورسٹی یونین میں اپنی کوئی تقریر شروع کرنے والی ہے۔ "دیکھو تو۔ کرن سوئیٹ کلکتے جارہا ہے۔ ہم سب شام کو ریلیف فنڈ کے لئے پروگرام کی ریہرسل کرنے والے ہیں ہم تمہیں بھی ساتھ لے چلیں گے۔ تم ہمارے ہاں کی آرٹ کی نمائش بھی دیکھنا۔ کل سیٹر ڈے کلب کا زینت آپا کے ہاں جلسہ تھا۔ تم اس میں گئے تھے۔ اس میں اتنے خوفناک سپر انٹلکچوئیل نظر آتے ہیں" "تم سیٹرڈے کلب کے جلسے میں کبھی نہیں گئیں؟" اس نے پوچھا۔ "نہیں۔ مجھے یہ لمبی لمبی ناکوں والے سپر انٹلکچوئیل بالکل پسند نہیں وہ سب ہمیشہ اپنے ہی متعلق باتیں کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ میں چاہتی ہوں کہ وہ صرف میرے متعلق باتیں کریں۔ آؤ باہر چلیں"۔

وہ سب باہر جاکر گھاس پر بیٹھ گئے۔ کرن ایک طرف کو اپنی مخصوص سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ پی چو بڑی کاہلی سے اپنی آرام کرسی پر لیٹے لیٹے زینت آپا سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ سب ہمیشہ کی طرح خوب قہقہے لگا رہے تھے (پی چو ڈارلنگ یہ کچالو کھاؤ۔ جو لوگ کھانے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ وہ بہت ہی سطحی ہوتے ہیں۔ رخشندہ نے اس سے کہا۔ وہ سب کھانے کی میزوں کی طرف چلے گئے۔ شام کا اندھیرا چھانا شروع ہو گیا

انہوں نے پورچ کا قمقمہ جلا دیا اور اس کی روشنی گھاس پر بہنے لگی۔ ہوا میں برساتی پھولوں اور نئے پتوں کی مہک تیز ہو گئی)

یہ سب کھائے جائیں گے اور بحثیں کریں گے اور قہقہے لگائیں گے۔ ہمیشہ ان کے یہاں یہی ہوتا ہے۔ یہ روشنیاں آنکھوں میں گھسی جاتی ہیں۔ یہ لڑکے آنکھوں میں گھسے جاتے ہیں۔ یا اللہ، کہیں اندھیرا ہو۔ کہیں اندھیرا ہو۔ زور کی بارش آجائے اور یہ سب اٹھ کر یہاں سے چلے جائیں۔ واللہ یہ عجیب لوگ ہیں۔ دیوانے۔ جنوں کا سودائی۔ زینت ریاض تھک کر برآمدے کی سیڑھیوں پر جا بیٹھیں۔ عجیب لوگ ہیں بس گھوڑے۔ سیاسیات اور موسیقی۔ خواتین سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ سب یقیناً ہومو ہیں (اکثر جب وہ اتوار کے روز زعفران منزل آتیں۔ اور عباسی خانم یا لالہ اقبال نرائن سے معلوم ہوتا کہ بھیا بٹیا سب جنے گھوڑوں کے پاس ہیں تو وہ ٹہلتی ہوئی اصطبل کی طرف چلی جاتیں اور وہاں کسی جنگلے کی لکڑی پہ جھک کر ان سب کی طرف دیکھنے لگتیں۔ گویا ان کے اس مشغلے میں بڑی ذہین قسم کی دلچسپی لے رہی ہیں۔ وہ اسی طرح اپنے کام میں مگن رہتے۔ یا انہیں دیکھ کر دوم بوائیش انداز میں پکارتے ہلو زینت آپا۔ ہم ستارہ سحری کی تیمارداری کر رہے ہیں۔ آؤ ہماری مدد کرو۔ کسی کاہل کو شام کی چاء نہیں پلائی جائے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ درخشندہ، گنی یا کرسٹابل اور ڈائمنڈ کو پکارتے تھے۔ ارے وہ تو گھڑی ہیں اور پی جو کہتا ہے۔ زینت آپا۔ آپ کو ہمارا یہ گھوڑا پسند آیا؟ ارے بھئی تم خود ہی پسند ہو۔ تمہارا گھوڑا تو الگ رہا اور پھر پی جو اپنی خالص اصطبلوں کی سیاست شروع کر دیتا۔ آپا اس گھوڑے کے لئے ہم نے بہت محنت اٹھائی۔ ستارہ سحری کی ماں جو میاں نے روشنی

کے لئے خریدی تھی۔ اسے چند سال ہوئے رانی کھیت میں لکڑ بگا اٹھالے گیا تب سے ہم نے یہ کوشش کی کہ اس کی نسل کا گھوڑا ہمارے پاس سے نہ جانے پائے۔ پچھلے سال راجہ پرتاب گڈھ نے جو گھوڑے منگائے تھے۔ ان میں سے ایک ۔۔۔ اُرے ہائے۔ ارے ہائے اللہ) ارے یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں۔ یہ سب کہیں بکھر کر اپنے اپنے راستے کیوں نہیں چلے جاتے۔ یہ سب کیوں اتنی باتیں کر رہے ہیں (اس وقت گھاس پر بیٹھے ہوئے وہ بڑے زور شور سے خرگوشوں اور سفید ولایتی چوہوں کے لئے مناسب ترین سائنٹیفک غذا پر بحث کر رہے تھے اور رخشندہ کرسٹابل سے پوچھ رہی تھی۔ تمہارے لئے اور کچالو منگاؤں کرسٹی ڈارلنگ ؟) ارے اندھیرا ہو جائے۔ بہت گھرا اندھیرا ہو جائے" زینت آپا۔ بھئی یہاں آئیے۔ آپ دُنیا تیاگ کر اتنی دور کیوں جا بیٹھیں" حفیظ احمد نے پکارا پھر انہوں نے ایک اور بحث شروع کر دی (کنور صاحب نے رخشندہ کے نام سے برآری کوک کے بہت سے حصے خرید دئے تھے اور وُہ غالباً بڑے جوش و خروش اور انتہائی انسانی ہمدردی کے ساتھ اس طرح مزدوروں کا ذکر کر رہی تھی جیسے بہار کے یہ سارے ہزاروں لاکھوں کان کن صرف اسی کی ذمے داری ہیں۔ تمہارے یہ حماقت زدہ ٹریڈ یونین ۔۔۔ باغ کے اندھیرے میں سے اس کی آواز آئی) ہاں یہ سب کہیں بکھر کر اپنے اپنے راستے کیوں نہیں چلے جاتے۔ انہیں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ جُٹے رہنے میں کیا مزا آتا ہے۔ یہ سب یقیناً ہومو ہیں۔ زینت ریاض نے فیصلہ کیا۔ کوئلے کے کان کنوں اور ٹریڈ یونین ازم سے چل کر ان سب کی گفتگو کا رُخ کمیونزم اور سوشلزم اور مذہب پر پلٹ آیا۔ گنتی جو ہر سال علی گنج کے میلے میں جاتی تھی اور اکثر

منگل کے روز مسز یشودھرا کول کے ساتھ امین آباد پارک والے مندر بھی ہو آئی تھی چپکی بیٹھی سب کی باتیں سنتی رہی اور پھر خصوصاً یہ ہمارے علمائے کرام جواب مذہب کی موشگافیاں کرتے کرتے سائنس کی طرف توجہ فرما رہے ہیں"۔ سارنگ پور کا راجہ حفیظ احمد خان جو خیالات کے لحاظ سے بڑا پکا سرخ بنتا تھا اور طالب علمی کے زمانے میں کرسٹابل سے شادی کرنے سے پہلے روس تک ہو آیا تھا، کہہ رہا تھا "ذرینہ کے انفلوئینزا سے اچھے ہونے کی خوشی میں اماں بیگم نے میلاد شریف کہہ دایا۔ اس میں مجتہد العصر مولانا جھمن صاحب وعظ فرما رہے تھے۔ اے مومنین سن کہ ثابت ہوا کہ یہ ہوائی جہاز کوئی نئی چیز نہیں۔ اے مسلمانو چشم بصیرت وا کرو کہ تخت سلیمان کیا شے تھی؟ — اللھم صلی علیٰ — اور جناب رسالتماب حبیب شب معراج آسمان پر تشریف لے گئے تو گویا یہ کیا تھا — ریڈیو کی لہریں — !! پڑھو درود پڑھو عاشقو درود پڑھو — درود سے کبھی غافل نہ ہو۔ درود پڑھو — (بھئی آپ لوگ بس مذہب پر ہی عنایت کیجئے۔ اس ترقی پسندی سے ہمیں معاف رکھئے) — اور اے مومنو صبح صبح باغ میں نکل جاؤ۔ کیا کیا پھول پتے رنگ برنگے کھلے ہیں کہ سبحان اللہ لازم آیا کہ ہم پوچھیں کہ یہ کس نے بنائے ہیں؟" — حفیظ نے ہنستے ہوئے حاضرین سے دریافت کیا "کسی کمیونسٹ نے بنائے ہونگے"۔ پی چو نے جل کر کہا۔ سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ کرن سیڑھیوں پر چپکا بیٹھا سب کی باتیں سنتا رہا (وہ اپنا ہر مضمون یا نظم شروع کرنے سے پہلے کاغذ پر غیر ارادی طور سے "اوم" لکھ لیا کرتا تھا اور پھر مضمون پر نظر ثانی کرتے ہوئے اسے کاٹ دیتا تھا)

اندھیرا ہوتا جا رہا ہے۔ چلو بھئی سب لوگ ہمارے ساتھ ہماری ریہرسل دیکھنے

ڈائمنڈ نے کہا "ہم اتنا بہترین ورائٹی شو کرنے والے ہیں"۔ اس نے بڑی بشاشت سے سب کو اطلاع دی (یہ لڑکیاں اپنی پروپگنڈہ سکرٹری خود ہی ہیں۔ بڑی قابل لڑکیاں ہیں۔ گنی جیمز جو اس پر مقالہ لکھ رہی ہے۔ رخشندہ امرناتھ جھا سے الجھتی ہے۔ مگر ان کی کلاسیکل موسیقی تم بالکل نہ سمجھ پاؤ گے سلیم بھائی۔ اہت انہت بھید ناد کے پرتھم بھید — رخشندہ کہتی ہے یہ ایمن کلیان کا لکشن گیت ہے۔ لکشن گیت۔ سمجھے تم۔ اتنی سنسکرت مجھے نہیں آتی۔ حفیظ احمد نے کہا، پی چو چلو ہمارے ساتھ۔ ڈائمنڈ نے اس کے پاس جاکر کہا۔ چلوں گا بھائی چلوں گا۔ اس نے بہت اکتاہٹ کے ساتھ آرام کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ سب گھاس پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس وقت جانے کہاں سے رخشندہ کو بھولا بھٹکا ایک شعر یاد آگیا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی

دوانہ مر گیا آخر کو، ویرانے پہ کیا گذری

ارے کتنا غضب کا شعر ہے۔ بالوں میں سے مولسری کی کلیاں جھاڑتے ہوئے اس نے سوچا۔ غزالاں تم تو واقف ہو — ارے ہائے اردو ادب اتنا سویٹ ہے۔ یقیناً اس وقت وہ اردو ادب کی عظمت پر ایک زوردار تقریر کر ڈالتی لیکن وہ سب ریہرسل میں چلنے کے لئے باغ کی سڑک پر آگئے تھے۔ وہ چپ چاپ ان کے ساتھ ہولی۔

"تمہارے اس پروگرام میں سب سے زیادہ خوبصورت اور اہم کون ہے" حفیظ احمد نے پوچھا۔ "میں ہوں"۔ اس نے آگے آگے چلتے ہوئے مڑکر بے حد اعتماد اور شگفتگی

کے ساتھ کہا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی (ارے یہ ان لوگوں کی انانیت۔ کوئی باضابطہ فلسفۂ حیات نہیں۔ کرن نے سر ہلا کر سوچا اور سب کے ساتھ ساتھ چپکا چلتا رہا)

ندی کے کنارے کنارے چلتے ہوئے وہ سب آرٹ اسکول کے سایہ دار راستوں پر آگئے (چاند کے مقابل میں انہیں شانتی نکیتن کا اوشیر لہری نظر آیا۔ جو آہستہ آہستہ ندی کی سمت جا رہا تھا۔ غزالاں تم تو واقف ہو — اسوک کی قطار کے سائے میں شہلا رحمٰن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اسے دفعتہً پھر یاد آیا۔ بہت ہی نفیس شعر ہے) وہ سب باغ کی طرف مڑ گئے۔ جہاں رات کی ہوائیں دھیرے دھیرے بہتی آرہی تھیں اور عمارت کے قمقمے جگمگا اُٹھے تھے

یہ دنیا اتنی خوبصورت ہے۔ یہ موسم اتنا پیارا ہے۔ یہ سب ایسے اچھے لوگ ہیں۔ شہلا رحمٰن ان سب کے ساتھ اسوک کی قطاروں کے درمیان چلتی رہی (آج کل وہ اتنی بہت سی باتوں سے، اتنے اچھے اچھے انسانوں سے محبت کر رہی تھی اور چونکہ اس کی محبت کا کسی نے اب تک جواب نہ دیا تھا۔ اس لئے اس کے سارے الوژن اپنی اپنی جگہ پر قائم تھے۔ ہاں یہ دنیا اتنی خوبصورت ہے زینت آپا) وہ سب رہرسل کے ہال میں پہنچ گئے۔ لڑکیاں اسٹیج کے پیچھے چلی گئیں۔

وہ چپ چاپ کونے میں ایک صوفے پر بیٹھا اپنی لمبی، کالی پلکیں جھپکاتا یہ سب دیکھتا رہا۔ یہ راجپوتانہ کا جھومر ہے۔ یہ گجرات کا گربا ہے۔ یہ پورب کی کجری ہے۔ دیکھو کرن بھائی۔ اسٹیج پر سے اتر کر رخشندہ نے ان سب کو یہ ساری باتیں تفصیل سے بتائیں۔ مدرا کے سارے مشکل اسرار سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ سیکھرا ہے۔ یہ اردھا

چندرا ہے۔ یہ شولنگ ہے۔ ناتیہ، نرتنہ اور نرتیہ کے سارے اختلاف انہیں ہی ذہن نشین کرائے۔ تم ہمیں سمجھتے ہو؟ اس نے پوچھا۔ اور یہ دیکھو تم نے ہماری استادوں کی گیلری کی تصویریں نہیں دیکھیں۔ یہ انند باگچی اور روی ورما اور ابنندرا ناتھ ٹیگور ہیں اور یہ ہمارا مانی نشی ڈے اور ایل۔ ایم۔ سین اور اویا ما ہے (یہ ہندوستان ہے کرن بھائی۔ جہاں اویاما مر گیا اور کسی کو پتہ تک نہ چلا۔ کسی کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اتنا بے مثل ایسا زبردست فن کار ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔ راجپوتانہ کی ایک گمنام ریاست میں جوان مر گیا۔ اس نے کہا) اور یہ نندلال بوس اور ذختنگیر اور ایشور داس ہے۔ سمجھے تم؟

"ارے میں تم کو نہیں سمجھ سکتا بھئی۔" سلیم نے اپنی کالی لمبی پلکیں جھپکاتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔

"نہیں سمجھ سکتے؟ یہ تو اور بھی مزے کی بات ہے۔" وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی جو ایک طرف کو پائپ ہونٹوں سے لٹکائے نسبتاً سنسان گیلریوں میں اکیلا اکیلا ٹہلتا رہا۔ کرن خرگوش کی طرح جا کر باغ میں ایک سرخ پتھر کے ٹوٹے پھوٹے مجسمے کی ٹانگ پر بیٹھ گیا جس کے چاروں طرف اونچی برساتی گھاس اگ آئی تھی۔ گنی دس بارہ لڑکیوں کو ایک گربا کی مشق کرا رہی تھی۔ رخشندہ بالکل خاموش ہو گئی اور چپ چاپ اسٹیج کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر گھنگھروؤں کو تال کے ساتھ بجاتی رہی (گنی ڈارلنگ اتنی رنجیدہ، اتنی اسپچیت مت ہو۔ نا جانے کس بھیس میں نارائن مل جائیں۔ رخشندہ نے اس سے کہا)

"ہاں میں کچھ نہیں سمجھ سکتا بھئی۔ (ہال میں بہت ساری لڑکیاں ایک

"فوک ڈانس" کی مشق کرتی رہیں) سلیم ٹہلتا ہوا برآمدے میں نکل آیا۔ گیلری کے سہرے پر اسے زینت ریاض نظر آئیں (اس نے ایک لحظے کے لئے پلکیں جھپکا کر آنے والے خطرات کا اندازہ لگانا چاہا۔ لیکن گیلری بہت طویل تھی اور ہال کا دروازہ وہاں سے بہت دور تھا) "ہلو سلیم"۔ انہوں نے قریب آ کر کہا۔ "تم نے یہ تصویریں دیکھیں۔ ایشور داس کی تصویروں میں اس قسم کی یاسیت ہے جو صرف بنگال اسکول میں نظر آتی ہے۔" (یہ کمبخت ان کے سامنے کھڑا اتنی بے فکری سے اپنی سیاہ پلکیں جھپکا رہا تھا۔ یکلخت ہال میں سے سارے سازوں اور گھنگھروؤں کی آواز آنی شروع ہو گئی "زینت آپا چلئے ان لوگوں کا ناچ دیکھیں۔" شہلا رحمٰن ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اس کے سامنے سے نکل گئی اور او۔شیر لہری کی تصویروں کے سامنے اس نے اپنے آپ کو تنہا موجود پایا۔ ارے تم کہاں ہو او۔شیر بھائی۔ زندگی کو کھوجنے آج کی رات تم کدھر گئے ہو۔ زندگی زندگی۔ اس کے چاروں طرف اس جیسے بہت سے انسان بکھرے ہوئے تھے اور وہ زندگی کا ناچ اسے سمجھا رہی تھی۔ دیکھو یہ کتھا ہے۔ یہ رادھا چندر لا ہے۔ یہ شِو النگ ہے۔

"یہ اتنی ساری ان گنت لڑکیاں جو ہر طرف گیلریوں میں تیرتی نظر آ رہی ہیں۔ انہیں آرٹ سے اتنی ہی شدید محبت ہے یا یہ ہمارے کنور صاحب کی وجہ سے یہاں آئی ہیں؟" ہال میں سے باہر آ کر فیروز نے اپنی روایتی بشاشت کے ساتھ کرن سے پوچھا۔

"فوں — مجھے پتہ نہیں۔" اسے تو کچھ پتہ نہیں۔ وہ تو پاروتی کے اس ٹوٹے پھوٹے سُرخ مجسمے پر خرگوش کی طرح چڑھا بیٹھا ہے۔ اسے دنیا میں کچھ نہیں چاہئے

"ارے بھئی کنور صاحب بہادر" فیروز نے چلا کر پی چو کو پکارا۔ پی چو نے اسوک کی قطاروں تلے ٹہلتے ٹہلتے اکتا کر مڑ کے اسے دیکھا۔ چلو بھئی ذرا ندی تک گھوم آئیں بہت دیر سے بارش رکی ہوئی ہے اور ہوا بند ہے۔ فیروز نے اس سے کہا۔

"چلو۔ میں خود اتنا تھک گیا ہوں۔ روشی اور گنّی مجھے یہاں گھسیٹ لائیں مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہئے۔" پی چو ٹہلتے ٹہلتے بولا۔" یہ سارا تمہارا آرٹ وارٹ جھمر جھمر" وہ رک گیا۔" اسے تم جو چاہو کر ان بھائی۔ یہ تمہارے آرٹ اور کلچر کے حماقت زدہ نظریئے نہیں ہیں۔ چلو ندی تک گھوم آئیں"۔

وہ تینوں اسوک کا سایہ دار تاریک راستہ طے کر کے ندی کی طرف چلے گئے

تب امبر پور راج کا انور اعظم درختوں کے سائے میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا پاربتی کے اس ٹوٹے پھوٹے مجسمے کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اندھیرے بادلوں میں سے جھانک کر چاند نیچے کی اس دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ درختوں کے پرے عمارت میں تیز روشنی ہو رہی تھی اور اس میں سے سازوں اور رات کی راگنیوں اور چاندی کے گھنگھروؤں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چاند کے سامنے آ کر مجسمے کے ستون پر بیٹھ گیا۔ اس کے چاروں طرف جھکے ہوئے برساتی پھولوں نے ایک دوسرے سے چلا کر کہا۔ اسے یہاں سے نکالو۔ گلاب کی جھاڑیوں نے غصّے میں آ کر اپنے سُرخ کانٹے کھڑے کر دیئے۔ یہ مولسری کے شگوفے آج ہماری پاربتی نے اپنے کالے بالوں میں سجائے ہیں۔ ارے تم انہیں کیسے چھو رہے ہو۔ بھائی گلیمر بولا۔ یہ ہماری پاربتی نے اپنے کالے بالوں میں سجائے ہیں۔

ہماری پاربتی آج ان احمق گدھے دنیا والوں کو رقص حیات کی

ساری مدراؤں کے اسرار سمجھانا چاہ رہی ہے۔ لیکن وہ کچھ سمجھ پانے کے بجائے پاپ پی رہے ہیں اور ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں کہ آج ریہرسل دیکھنے مسز بنڈٹ آرہی ہیں اور واقعی یہ کتنی کیوٹ بات ہے)

بارش بہت دیر سے ٹھہری ہوئی تھی اور ہوا بند تھی۔ تین لڑکیاں اسوک کے درختوں کی طرف سے دوڑتی ہوئی آئیں اور اس کے قریب آکر کھڑی ہوگئیں۔ چاند کے مقابلے میں ان کے سائے زمین پر پڑ رہے تھے۔ اس نے فوراً تعظیماً ان کے لئے جگہ چھوڑ دی اور ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

"ہم جنگل کے پریزادوں کو ڈھونڈنے آئے ہیں"۔ انہوں نے کہا۔

"جنگل کے پریزادوں کو ——؟"

"ہاں۔ جب راتیں گرم ہوتی ہیں اور چاند بھیگے ہوئے ارغوانی پھولوں پر جھک جاتا ہے۔ اس وقت ہم جنگل کے پریزادوں کی تلاش میں ہری وادیوں میں نکل آتے ہیں لیکن ہمیں جنگل کے سایوں میں اڑتے ہوئے وقت کے پروں تلے صرف پرانے گیت ٹوٹے پھوٹے بکھرے پڑے ملتے ہیں اور جنگل کے پریزاد کہیں نہیں ملتے ہمیں اب آگے جانے دو ——" وہ تینوں اسی طرح دوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئیں اور ان کی نقرئی آوازیں بھیگتے سناٹے میں رفتہ رفتہ دور ہوتی چلی گئیں (ازابلا تھوبرن کالج کی ان تینوں لڑکیوں نے اپنے اس مکالمے کی مشق خوب اچھی طرح کر لی تو باغ کا راستہ طے کر کے وہ اسٹیج کے پچھلے دروازے سے ہال میں واپس چلی گئیں جہاں گرما گرم ریہرسل ہو رہا تھا اور مسز بنڈٹ کا انتظار کیا جا رہا تھا)

وہ پھر مجسمے کے ستون پر بیٹھ گیا۔

ہوا بالکل خاموش تھی اور پتے گہرے گہرے متوازن سانس لے رہے تھے۔

ایک اور سایہ درختوں میں سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"آپ — ار — آپ — کون ہیں؟" اس نے سٹپٹا کر پوچھا اور پھر تعظیماً

سنتون کی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم مجھے نہیں جانتے؟" سائے نے گہری شیریں آواز میں پوچھا۔

"نہیں — کیا تم بھی جنگل کے پریزادوں کو ڈھونڈنے آئی ہو؟" (اسے اپنی اس

بے تکلفی پر تعجب ہوا۔ لیکن صورت حال ہی اتنی بے ساختہ تھی)

"جنگل کے پریزاد؟ — بالکل نہیں۔ مجھے تم نہیں پہچانتے؟" اس نے آہستہ

آہستہ پھر پوچھا۔

"تم — تم کوئی راجکماری تو نہیں ہو؟" اس نے رکتے ہوئے پوچھا۔ کیونکہ

اسے معلوم تھا کہ راجکماریاں اتنی بے تکلفی اور بے ساختگی سے باتیں نہیں کرتیں۔

"راجکماری؟" — سائے نے اس کا سوال دہرایا۔ "ہرگز نہیں۔ کیا تم مجھے نہیں

پہچانتے؟ — میں زندگی ہوں۔" اس نے آہستہ سے سرگوشی میں کہا۔

پتوں میں جنبش ہوئی اور ہوا دھیرے دھیرے ندی کے رُخ بہنے لگی۔

"رات گرم ہے اور ہوا کے راگ بہت مدھم ہیں۔ آؤ ہم یہاں سے آگے

چلیں۔" سائے نے کہا

چاند بادلوں میں سے نکل آیا اور اس کی روشنی میں اس نے دیکھا۔ کہ وہ کوئین

روز تھی۔

"ہاں۔ آؤ۔ ہم یہاں سے آگے چلیں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ سائے

کے راستے پر قدم رکھتے ہوئے وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

رات گہری ہوتی گئی۔ ندی کی لہریں ساکت تھیں۔ درختوں کے جھنڈ چپ چاپ کھڑے تھے۔ ہوا دھیرے دھیرے پچھم کے رخ بہہ رہی تھی ——— (کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ پتوں کی جنبش کے ساتھ ساتھ اس کی سنسناہٹ میں کوئی یہ کہتا سنائی دیا۔ ہوا بڑی کاہلی سے خوابیدہ درختوں میں سرسراتی رہی)

ان کی ریہرسل ختم ہوگئی۔ مسز پنڈت اپنی بیوک میں بیٹھ کر کاسلز روڈ واپس چلی گئیں۔ سب باہر نکل آئے۔ "کیوں اتنی رنجیدہ ہوتی ہو گئی ڈارلنگ"۔ تھکی ہوئی رخشندہ نے اس سے کہا "چلو اب گھر چلیں۔ راستے میں کسی جگہ رک کر کافی پئیں گے۔ کیسا خیال ہے؟" اس نے بڑی شگفتگی سے پوچھا۔ گنتی طلبہ اور بابایاں ایک طرف کو لڑھکا کر اسٹیج کی سیڑھیوں پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم ٹھیک کہتی ہو روشنی"۔ اس نے کہا "نا جانے کس بھیس میں نارائن مل جائیں"۔

سویرا ہوتے ہی امہرپور ہاؤس کے سربراہکار سید مرتضیٰ حسین پھر غفران منزل کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔

"بھیا ہم ابھی کوئی جواب نہ دیں گے۔ پچو میاں نے کہلوا دیا ہے کہ ابھی ان کا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے"۔ عباسی خانم نے پچھلے دالان میں آکر ان سے کہا۔ مرتضیٰ حسین بگڑ گئے۔ "واہ صاحب واہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہماری بٹیا پر گالی چڑھ چکی ہے۔ آج ایک برس ہونے آیا کہ آپ صاحبان ہی کے ایما سے تقریب کی گئی تھی۔ بی عباسی صاحب کنور رانی سے میری جانب سے عرض کر دیجئے کہ امہرپور راج

والوں کی آج تک ایسی توہین کیا نام کہ کبھی نہیں ہوئی (اہے ہے کیا غضب ہے قسم جناب عباسؑ کی میرا تو خون کھول رہا ہے)

عباسی خانم ان کا یہ پیغام لے جاکر اندر ہی رہ گئیں۔ تھوڑی دیر پہلو بدلنے کے بعد سامنے سے گل شبّو کو آفتابہ لئے اندر جاتے دیکھ کر انہوں نے گلا صاف کرکے پھر پکارا "بی مہری صاحب ذری عباسی خانم سے کہئے۔ ہیں یہاں گھنٹوں سے بیٹھتا سوکھتا ہوں اور ان سے کہئے گا کہ انور میاں کے لئے کیا ارشاد ہے۔ بندہ آج آخری جواب لے کر یہاں سے ٹلے گا" گل شبّو بھی جاکر اندر ہی کی ہو رہی۔

تھوڑی دیر بعد شعلہ پری اور الماس آپس میں باتیں کرتی دالان میں سے گذریں "لگتا ہے بھیّا کی طرح بِٹیا بھی ہاں نہ کرہیتیں۔ میاں مرتضےٰ حسین لے بس اب ستو کھا ئیے۔ کلائیڈ روڈ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ٹہلئے" شعلہ پری نے چپکے سے کہا (پرنجانے بِٹیا کو کیا ہو گیا ہے۔ ایکو آدمی ہی پسند نہیں آتا۔ نہ بِٹیا کی سمجھ میں آتا ہے۔ نہ بھیّا کی۔ وہ اسی طرح سرگوشیاں کرتی ہوئی نہر کی طرف چلی گئیں)

کنور رانی اپنے کمرے میں بیٹھی لالہ اقبال نرائن سے امبرپور والوں کے خط کا جواب لکھوا رہی تھیں۔ انہوں نے اسی وقت پی چو کو اندر بلوایا۔ لیکن وہ پریڈ لینے کے لئے بہت سویرے ہی جاچکا تھا)

"ہنہہ۔ نوابو چی کہیں کا" کچھ دیر بعد۔ جب سارے ملازمین اور لالہ اقبال نرائن کمرے سے چلے گئے تو انہوں نے گاؤ تکئے کے سہارے لیٹتے ہوئے اپنا خوبصورت سراپ۔ دلکش انداز میں ہلا کر غصے سے کہا" وہ کم بخت سارنگ پور والی قلماقنی" "کون قلماقنی ممی؟" ۔۔۔ وہ اسی وقت پیچھے سے چپکے سے آکر ان کے پاس

تخت پر بیٹھ گیا۔ "ممی تم ہم سے خفا ہو؟" — اس نے پوچھا

"لے بس اب رہنے دو پی چو میاں۔ ماشاءاللہ سے یہ ہمارے سامنے —"

انہوں نے انتہائی رنجیدگی اور غصّے سے کہا۔

"لیکن ممّی — سُنئے تو —"

"کچھ نہیں۔ اب ہم آرام کریں گے۔ تم جا سکتے ہو۔" کنور رانی نے تخت پر سے

اٹھ کر پاندان بند کرتے ہوئے کہا۔

وہ چپکا وہاں سے اُٹھ کر اپنے سٹنگ روم میں واپس آگیا اور ادھر سے

اُدھر ٹہلتا رہا۔ پھر اُس نے گھڑی دیکھی۔ خجستہ بھی سویرے سویرے ہی اپنے

پروگرام کے انتظامات کے لئے سائیکل اٹھا کر نکل بھاگی تھی۔ وہ دونوں اب

بہت کم اکٹھے رہتے تھے۔ بہت کم شور مچاتے تھے اور اب وہ اپنے بلیف فنڈ

کے قصوں میں جٹ گئی تھی۔ وہ اکیلا اکیلا ٹہلتا رہا۔

برساتی کی سیڑھیوں پہ زور سے ایک سائیکل گرانے کی آواز آئی۔ "پی چو"

ڈائمنڈ نے باہر سے پکارا۔

"ہلو ڈائمنڈ" اس نے دریچے میں جا کر جھانکا۔

وہ تیر کی سی تیزی سے سٹنگ روم میں آگئی۔ "پی چو مجھے ابھی ابھی یہ اسکرپٹ

ٹائپ کر کے کرائسٹ چرچ لے جانا ہے۔ روشی دوپہر تک نہ آسکے گی۔ وہ جلدی

سے دفتر کے کمرے میں جا کر ٹائپ میں مصروف ہوگئی۔ پی چو خاموشی سے برآمدے

میں ٹہلتا رہا۔ ڈائمنڈ اپنے کام کے جوش میں اتنی مگن تھی کہ اس نے یہ نوٹس نہیں

کیا کہ وہ اتنا خاموش کیوں ہے۔

باغ کی سڑک پر سے کرن آتا دکھائی دیا۔ وہ بہت تھکا ہوا، بہت رنجیدہ، بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ اندر آکر بھولے خرگوش کی طرح دیوان پر بیٹھ گیا۔ ڈائمنڈ نے اس خیال سے کہ متواتر کھٹ کھٹ کی آواز اسے پریشان نہ کرے ٹائپ رائٹر بند کر دیا (وہ سب کرن بہادر کانجو، اس بے انتہا سویٹ اور گڈو لڑکے کو اتنا چاہنے لگے تھے) وہ کشنوں کے سہارے چپکا بیٹھا رہا۔ پھر اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ "سکون —— ارے تم سب مل کر کہیں سے مجھے تھوڑا سا سکون لا دو۔ کاہے کے لئے یہ ساری جد وجہد کر رہے ہو تم لوگ"
—— ریلیف فنڈ کے ڈرامے کے کاغذات ہوا میں ادھر اُدھر بکھر گئے۔ ڈائمنڈ نے جلدی جلدی جھک کر ان سب کو سمیٹ لیا۔ "کرن بھیا۔ یہ اسکرپٹ دیکھ لو میں نے ٹھیک ٹائپ کی ہے نا؟" اس نے شگفتگی سے پوچھا

"کرن چائے پیو گے؟" پی چو نے گیلری کے دروازے میں جاکر عباسی خانم کو آواز دی۔

"نہیں میں چائے نہیں پیوں گا" (اسے تو کچھ بھی نہیں چاہئے) وہ دفعتہً دیوان پر سے اُٹھا اور پھر باہر چلا گیا۔

باہر برسات کی دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی اور ہوا کی سنسناہٹ میں پیپل کے کے پتے تیر رہے تھے۔ اور کول تار کی سڑک بہت گرم۔ بہت سنسان۔ بہت طویل تھی۔

(کرن اکتا کر پھر اپنے نیشنل ہیرلڈ کے دفتر میں جا بیٹھا اور لیڈنگ آرٹیکل ٹائپ کرنے میں مشغول ہو گیا)

ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ کے ساتھ ساتھ ایسی دل ہلا دینے والی، اکتا دینے والی خبروں کا اضافہ ہوتا گیا۔ کلکتہ۔ نواکھالی۔ بہار۔ پنجاب۔ ارے یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن اب دل و دماغ یہ سوچتے سوچتے بھی تھک گیا۔ وہ سب کچھ بھول کر اپنے اپنے طریقے سے کام میں مصروف تھے۔ مختلف قسم کے امدادی فنڈز کا سیلاب آگیا۔ وہ سب پچھلے برسوں میں جنگ کے زخمیوں اور بنگال کے قحط زدہ انسانوں اور آئی۔ این۔ اے کے سپاہیوں کے لئے کام کرتے کرتے اکتا چکے تھے ان سب چیزوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی فائدہ نہیں اور اب ان کے سامنے پھر چاروں طرف سے روپے اور طبی امداد اور ان تھک محنت کا مطالبہ تھا کیونکہ انسانیت دم توڑ رہی تھی)

مارو گولی۔ یہ انسانیت کمبخت ہمیشہ سے دم توڑتی آئی ہے (نہ جانے ایسی حماقت زدہ، بالکل اکتا دینے والی نسل انسانی کو چلائے رکھنے ہی کی کیا ضرورت ہے) رخشندہ نے سائیکل اٹھا کر کرائسٹ چرچ ہال کی طرف جاتے ہوئے سوچا (لیکن میں گویا CYNIC بنتی جا رہی ہوں اور یہ بڑی ٹریجڈی ہے) اسے راستے میں ریڈیو اسٹیشن سے ڈرامے کا اسکرپٹ لینا تھا۔ لیکن وِمل اسے غفران منزل کے پھاٹک ہی پر مل گیا۔ وہ بے حد اکسائیٹڈ معلوم ہو رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ جلدی سے سائیکل پر سے اتر آیا۔

"تم نے ایک خبر سنی رو شی" اس نے جلدی جلدی اپنی پیشانی پر سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کہیں اور پانچ چھ ہزار جانداروں نے ایک دوسرے کو مار ڈالا" رخشندہ نے

بے فکری سے پوچھا۔ وہ دونوں سٹرک پر آگئے

"نہیں۔ لیکن تم یقین ہی نہیں کرو گی"۔ وِل نے منہ لٹکا کر کہا

"مجھے تو وِل بھائی ہر بات کا یقین آجاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ بالکل ناقابل یقین ہو"

اس نے بے پروائی سے سر ہلا کر کہا اور پھر ہنسنے لگی۔ اس کے بال ہوا میں اڑتے

جا رہے تھے۔

"چنڈو خانے کی تازہ ترین اطلاع ہے کہ وہ تازہ وارد ڈون ژوان کا بھتیجا صاحبزادہ

سعید احمد خان ہماری گنّی پر بالکل یعنی کہ جان دے رہا ہے قریب قریب"۔ وِل

نے جلدی جلدی کہا۔ گویا ریڈیو پر موسم کی رپورٹ سُنا رہا ہے۔

وہ ایک لمحے کے لئے پلکیں جھپکاتی رہی۔ پھر اس نے سائیکل سنبھال کر

آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "سو وٹ"؟

"ایں"؟ وِل نے بھی ایک لمحے کے لئے پلکیں جھپکائیں۔ "ارے روشی۔

یعنی کہ تمہیں شوک نہیں پہنچا۔ سوچو تو کہ گنّی۔ یعنی کہ گنّی کول۔"

"فُوہ۔ (بچارا ہمارا سوئیٹ گڈو کہ ان بہادر کا لچو؟ ہٹاؤ اس قصے کو وِل

بھائی۔ ارے تم جانتے ہی نہیں ہیں تو CYNIC ہوں) ہاں ہٹاؤ اس قصے کو۔

گولی مارو"۔

"ایں"؟

"ارے تم تو سویرے سویرے اتنا بور کر رہے ہو۔ کہہ تو رہی ہوں بھائی۔ گولی

مارو سب کو۔ تم نے اسکرپٹ رنجنا کو دے دیا"؟

وِل پلکیں جھپکاتا رہ گیا۔ وہ دونوں اوٹرم روڈ پر سے نکل کر کرائسٹ چرچ

آئیں گے)

دھوپ میں سڑک کا ایک چکّر لگا کر وہ واپس آگئیں۔

ٹھنڈے اندھیرے کمرے میں مسہری پر گر کر اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں "ہاں، زندگی اتنی دیوانی، اتنی دلچسپ ہے کہ پینتیس سال کی عمر کے بعد تو میں خودکشی کر لوں گی۔" اس نے جمائی لے کر اطمینان سے طے کیا۔

گنّی اور ڈائمنڈ قالین ایک طرف ہٹا کر کمرے کے ٹھنڈے فرش پر جھمر کی مشق کرنے لگیں (ایسی اچھی، ٹھنڈی، آرام دہ دنیا میں انہیں ان مارتے مرتے جانداروں کی وجہ سے جو انسان کہلاتے ہیں۔ دوپہر کو سونے کے بجائے گھنگھروؤں کے بوجھ سے تھکنا پڑ رہا تھا)

باہر، نیلے روشن آسمان کے نیچے فضا میں تیز رفتار بگولے چکّر کاٹتے رہے (پہلا کانٹ سماپت بھیا — سڑک کے موڑ پہ اپنی ہرے رنگ کی گمٹی میں بیٹھے بیٹھے بلدیوا نے اپنی یکساں آواز میں آخری سطر تک پہنچ کر زور سے رامائن بند کی اور پان کے سرخ کپڑے پر تازہ پانی چھڑکنے میں مصروف ہو گیا)

(۲)

ڈھلتے ہوئے ساحل

ہاں بھائی سلیم۔ فیروز نے کہا۔ یہ سب عجیب چیز ہیں۔ واللہ۔ انہیں پتہ چلا کہ پی چو نمائش اور ریہرسل دیکھنے آئے گا۔ سارا کالج کا کالج تصویر کی گیلریوں میں پہنچ گیا۔ انہیں کسی سے معلوم ہوا کہ پوٹو فلائنگ کلب کا سکرٹری ہے اور اپنا ہوائی جہاز اڑاتا ہے۔ ان کی پلٹنیں ایک کے بعد ایک فلائنگ کلب کی ممبر بننی شروع ہو گئیں۔ چاہے ہوائی جہاز اڑانا تو کیا اس میں بیٹھنے کے خیال ہی سے ڈر لگتا ہو۔ لیس لے کے امہٹسی کے جنگل میں منگل لگا دیا۔ سب کی بھیڑ چال ہوتی ہے۔ واللہ ایک ایک کی بھیڑ چال دو مل، ڈائمنڈ اور روشنی کے چنڈو خانے سے اطلاع ملی ہے کہ جب سے مس شہلا رحمٰن کو پتہ چلا ہے کہ ہمارے بھائی سلیم اور کنور پی چو اور ان سب کو پکوان پکانے، آم کی آئس کریم بنانے اور گھریلو کام کرنے والی لڑکیاں زیادہ پسند ہیں، تو انہوں نے یونیورسل بکڈپو سے

"موڈرن اسکرین" اور "فیشن اینڈ بیوٹی" کے بجائے "ویمن اینڈ ہوم" قسم کے رسالے خریدنے شروع کر دیئے ہیں۔ جب کوئی ان کے گھر جاتا ہے۔ وہ فوراً باورچی خانے کا رُخ کرتی ہیں۔ اور بے نیازی سے اپنی کوئی نظم گنگناتے ہوئے سموسے بنانے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ اس نے چپکے سے پی چو کی کرسی کی طرف جھک کر کہا۔ وہ سب کلب کی لاؤنج کی طرف دیکھنے لگے۔ جہاں شہلا رحمٰن اپنی کچھ دوستوں کے ساتھ بیٹھی تھی)

"جی بُولا رہا ہے بھائی قسم خدا کی" پی چُو نے اکتا کر کہا (رخشندہ اور اس کی سہیلیاں اپنے پروگرام کے سلسلے میں ہر وقت مصروف رہتی تھیں اور اسے اکیلے ہی کلب آنا پڑتا تھا) ہال میں رقص شروع ہو گیا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے ہاتھ چھوڑ کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور لمبے لمبے قدم رکھتا دفع الوقتی کے خیال سے شہلا رحمٰن کے پاس چلا گیا۔ "آپ میرے ساتھ ناچیئے گا؟" اس نے ذرا جھک کر پوچھا۔

وہ سٹ پٹا گئی۔ اس موقع پر کیا کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی آدمی رقص کی درخواست کرے تو کیا شکریہ کہتے ہیں یا خاموشی سے اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یا ایکسکیوز می کہتے ہیں۔ زینت آپا نے نور منزل کے برآمدے میں اسے یہ سب نہیں بتایا تھا۔ وہ پی چُو کے ساتھ ہال کی طرف چلی گئی۔ اور وہ مجمع میں گھُل مِل گئے اور شہلا رحمٰن بے حد احتیاط سے پی چو کے ساتھ قدم رکھنے لگی (اس کو مستقل یہ خدشہ رہا کہ پی چو کے پاؤں اس کے سینڈلز سے دب نہ جائیں)

—— تب وہ فلور پر آئے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کتنا خوبصورت جسم ہے سنہرا، اور گرم اور لوچدار اور کاؤ بیئر اسٹائل کے اس کے بال اس کے شانوں پر پڑے تھے۔

اس کے سیاہ بال اور گہری بھوری آنکھیں اور سرخ ہونٹ، وہ پہلی دفعہ اس کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ گنی کول بہت اچھا ناچتی تھی۔ جیسے پانی پہ بہہ رہی ہو۔ وہ خود بھی بہت اچھا ناچتا تھا۔ وہ جو یورپ کے سارے بڑے بڑے ناچ گھروں میں اپنی راتیں بتا چکا تھا۔ ایسے ناچ گھر جن کے ایک کونے میں یہ سارا دلکشا کلب سما جائے۔ اور وہ ایسی لڑکیوں کا ہم رقص رہ چکا تھا جو گنی کول سے کہیں زیادہ خوبصورت تھیں۔ وہ ناچ ختم ہوا۔ تالیاں بجیں۔ بینڈ نے اپنی گت تبدیل کی۔ دوسرا ناچ شروع ہو گیا۔ پھر تیسرا پھر چوتھا۔ وہ سارے وقت اس کی ساتھی رہی۔ آخر میں "معاف فرمایئے گا" کا ناچ شروع ہوا۔ وہ اس بیہودگی سے بہت چڑتی تھی۔ وہ خاموشی سے ہال سے نکل کر باہر پام کے درختوں کے سائے میں آ گئے۔ اس کا خیال تھا۔ وہ اس کے ناچنے کی تعریف کریگی لیکن اس نے ناچ کے دوران میں اس سے ایک بات بھی نہیں کی جب اس کا کوئی جاننے والا جوڑا ان کے قریب سے سوئم کرتا ہوا گذرتا وہ انہیں دیکھ کر مسکرا دیتی اور اس کو بڑی شدید بے چینی ہوتی۔ وہ چاہتا تھا۔ وہ صرف اسی کے لئے مسکرائے اسی سے باتیں کرے۔ صرف اس کے ساتھ ہی ناچے۔ چاء کی پیالی بنا کر صرف اس کو ہی دے۔ وہ جو سوہو کے بوہیمین نگار خانوں اور وی آنا کی خوبصورت عورتوں اور پیرس کے سارے اعلیٰ درجے کے ریڈ لیمپ ہاؤسوں سے واقف تھا لیکن گنی کول دنیا کی سب سے زیادہ دلکش، سب سے زیادہ ذہین، سب سے زیادہ پیاری لڑکی تھی۔ اور اس نے کہا تھا۔ اگلے مہینے ہمارا ایک بہت ہی گرینڈ قسم کا کونسرٹ ہونے والا ہے۔ اس میں آپ ضرور آئیے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ ضرور آئیگا۔ اس میں گنی کول پیانو بجانے اور کتھا کلی ناچ ناچنے والی تھی۔ اور گنی کول دنیا کی بہترین پیانو بجانے والی اور کتھا کلی ناچنے

والی لڑکی تھی۔ رامپور کے صاحبزادہ سعید احمد خاں نے یہ سب سوچا۔

"معاف کیجیے گا"، کا ناچ شروع ہو گیا۔ اور پی چو نے محسوس کیا کہ اس کی پارٹنر غالباً پہلی دفعہ اس ناچ میں شریک ہونے سے گھبرا رہی ہے۔ وہ اسے فلور کے متحرک مجمع سے باہر نکال لایا (آپ کا بہت بہت شکریہ کیونر صاحب شہلا رحمٰن نے ایک سوئینگ کے ساتھ باہر آتے ہوئے کہنا چاہا۔ کیونکہ رقص کا ایسا دیوانہ طریقہ زینت آپا نے بالکل نہ سکھایا تھا لیکن وہ پھر خاموش رہی۔ کیونکہ اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ ناچ کے بعد پارٹنر کا شکریہ ادا کرتے ہیں یا نہیں۔ وہ واپس لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئی اور اس کی دونوں سہیلیاں جو دلکشا کلب کی ممبر نہیں تھیں اور کسی اور کے ساتھ وہاں شاید پہلی بار آئی تھیں۔ اس سے دل ہی میں بہت مرعوب ہوئیں کہ اُفوّہ تم تو کنور صاحب کے ساتھ ناچ بھی آئیں شہلا ڈارلنگ)

پی چو لمبے لمبے ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا ہال کا فاصلہ طے کر کے پھر اپنے مخصوص گوشے میں جا بیٹھا۔ فیروز اور سلیم وہاں سے اُٹھ کر شاید بار کی طرف جا چکے تھے۔ کلب کے پچھلے برآمدے میں کوئی کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ وہ دفعتاً اُٹھا۔ اور برآمدے میں گیا۔ وہاں نسبتاً تاریکی تھی اور ہال کے شور اور جگمگاہٹ کے مقابلے میں وہ جگہ بالکل ایک علیحدہ دنیا معلوم ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اور اس کا دل ایک لحظے کے لئے اپنی جگہ پر ٹھہر گیا۔ وہ تو محض رخشندہ تھی جو غالباً اسی وقت کرائسٹ چرچ ہال سے وہاں آئی تھی۔ اور گیتی کو بلانے کے لئے ہنستی ہوئی پام کے درختوں کی طرف جا رہی تھی۔

وہ برآمدے کی سیڑھیوں سے اترا اور کلب کی ساری عمارت کا چکر لگا کر

باغ کی خاموش روشوں پر گھوم پھر کے دوبارہ اپنے گوشے میں آن بیٹھا۔
ایک سرو اور اکتایا ہوا چاند پام کے جھنڈ کے پیچھے سے آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔

تب حفیظ احمد اور کرسٹابل "معاف کیجیے گا" سے نپٹ کر ہال سے باہر نکلے۔
انہوں نے اسے آواز دی "یہ تم وہاں بیٹھے کیا مراقبے میں مصروف ہو۔ پی چو بھائی" حفیظ احمد نے اس کی سمت آتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر سگریٹ لائیٹر ٹھیک کرنے لگا۔ "چلو ہمارے ساتھ "لالہ رخ" راستے میں قوم کی لیڈر کو کرائسٹ چرچ ہال سے ساتھ لیتے چلیں گے۔ کرسٹابل نے اسے اتنا پھولا ہوا دیکھ کر شگفتگی سے تجویز کیا۔
"قوم کی لیڈر کلب آگئی ہے۔ میں یہاں سے سیدھا گھر جاؤں گا۔" وہ چپکے سے غرّایا۔
"ارے ہمارے ساتھ چلو بھئی۔ مدتوں سے برج نہیں جما۔ سلیم کہاں ہے؟" حفیظ احمد نے پوچھا۔
"نہیں ـــــ میں گھر جاؤں گا۔ کہہ جو رہا ہوں تم سے!" اس نے اس طرح کہا گویا حفیظ احمد اور کرسٹابل دونوں کو سالم کھا جائیگا۔
"اچھا بھئی تمہاری مرضی۔ پولیس میں رہ کر انسان واقعی بالکل اودبلاؤ بن جاتا ہے۔" حفیظ احمد نے کہا۔
"اودبلاؤ نہیں بالکل بگڑ بگّا ــــــ!" کرسٹابل بولی۔ اور وہ دونوں ہنستے ہوئے برساتی میں اتر گئے۔

پر ایک زوردار ہاتھ مارا اور انتہائی پنجابی انداز سے بولا۔ "کہئے کنور صاحب آپ
تو آج کل نظر ہی نہیں آتے ہو مس عرفان علی بھی کہیں دکھائی نہیں پڑتیں" اور وہ انتہا
بداخلاقی سے شانہ جھٹک کر وہاں سے ٹہل گیا (رامپور کے صاحبزادہ سعید احمد خاں
کی خاموش آنکھوں نے گنی کول سے پوچھا یہی وہ تمہارے مشہور و معروف بھائی
ہیں۔ جن کی خوش خلقی کے تم اتنی دیر سے قصیدے پڑھ رہی تھیں ؟)

فوں ——— شوں۔ میں ان دونوں کو قتل کر دوں گا۔ اس نے بڑ آمدے میں
آکر ادھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے سوچا (اس کپٹن ٹوبی نے دِمل کو یہ گھونس دی تھی
تھی کہ اگر تم مجھے عفران منزل کی پارٹیوں میں مدعو کروالیا کرو۔ تو جب تم بمبئی جاؤ
میں تمہیں اپنی بہن کے نام تعارفی خط دیدوں گا اور تم بڑے ٹھاٹھ سے اس کے
میرین ڈرائیو میں ٹھہر جانا۔ اس کی چھوٹی بہن کچھ عرصہ پہلے اپنی فلم ایکٹرس بھا
کی ترغیب پر فلموں میں شامل ہو گئی تھی اور مہالکشمی ادر تاج میں ہندوستانی پرنس
کے ساتھ نظر آتی تھی اور انڈین اسکرین کی اُدھ صفت گرل کہلاتی تھی، اور اب اس
ہمت تو دیکھو، کہتا ہے کہ مس عرفان علی کہیں دکھائی نہیں پڑتیں) فوں۔ پپ۔ پ
وہ چپکے سے غرایا۔ وہ یقیناً ان دونوں کو جان سے مار ڈالیگا۔ سب کو جان سے
ڈالے گا۔

پی چو ——— !! گنی کو شوک پہنچ گیا۔ پی چو ایسے الفاظ بھی استعمال کر سکتے
"پی چو بھائی ہمارے ساتھ گھر چلو گے ؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں گنی بی بی۔ میں سیدھا عفران منزل جا رہا ہوں۔ میں کل تمہارے
آؤں گا۔ آپ تو ابھی لکھنؤ ہی میں تشریف رکھتے ہیں صاحبزادہ صاحب ؟ آپ

پھر کسی روز ملاقات ہو گی۔" اس نے مڑ کر کہا اور پھر ان دونوں کو شب بخیر کہہ کر لمبے لمبے قدم رکھتا برساتی میں اتر گیا۔

موٹروں کے قریب رخشندہ اسے ملی۔ شہلا رحمٰن بھی اس کے پاس ہی کھڑی تھی اُسے دیکھتے ہی رخشندہ نے چلّا کر کہا۔ "پی چو میں گنّی کے ساتھ جا رہی ہوں۔ تم ذرا مس رحمٰن کو ان کے گھر اتارتے جاؤ۔" اور اپنی باتوں میں حد سے زیادہ مصروف وہ دوسری طرف مڑ گئی۔

شہلا رحمٰن اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کار کے نزدیک آ گئی۔

"بیٹھیے مس رحمٰن"۔ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے اکتا کر کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ کنور صاحب۔"

وہ سڑک پہ آ گئے۔

"واقعی یہ بہت ہی آپ کا سوئیٹ پنا ہے" شہلا رحمٰن نے پھر کہا (یہ لفظ سوئیٹ یقیناً اس نے رخشندہ کے گروپ کی علیگڈھ اور آئی۔ ٹی کی لڑکیوں سے سیکھا ہے' پی چو نے سوچا) اگر آپ اِس وقت مجھے نہ پہنچاتے تو بڑی دقّت پڑتی"۔

نہیں تو۔ اس نے کہا۔ فیروز یا سلیم آپ کو پہنچا دیتے۔ مجھے کوئی خاص محنت تو نہیں کرنی پڑی۔ مجھے اسی طرف سے گذرنا ہے (چاند بالکل ان کے مقابل میں تیزی سے ختم ہوتی ہوئی سڑک کے سرے پر چمک رہا تھا اور اس کی کرنوں میں چمکتی ہوئی چوڑیوں سے مزیّن ہاتھ شہلا نے بڑے خوبصورت انداز سے اپنے سامنے رکھ لئے تھے)

"آپ کہاں اتریئے گا؟"

نور منزل پہنچ کر اس نے جواب دیا (راستہ اتنی جلدی ختم ہو گیا)

کار کی رفتار کم ہو گئی ۔ وہ نور منزل کے پھاٹک پر جا رکے ۔

آپ تھوڑی دیر کے لئے اندر آ کر تو وہ نہ بیٹھیے گا؟ اس نے کار سے اتر

ہوئے بے حد اخلاق سے پوچھا ۔

جی نہیں شکریہ ۔ اب تو بہت رات آ گئی ہے ۔ شب بخیر ۔ وہ جلدی سے کار اسٹ

کر کے آگے بڑھ گیا (تم ٹھیک کہتے تھے فیروز بھائی ۔ یہ سب عجیب چیز ہیں ۔ ان

بچنا بالکل ناممکن ہے ۔ بالکل ناممکن ۔ اور پھر میں تو یوں ہی ایک عرصے

مصیبت میں مبتلا) رات کی تیز ہوا اس کے بالوں کو پریشان کرنے لگی ۔ جہنم میں جاؤ

سب — ہش رخشندہ کے آبگینے، اور کرن کا فلسفہ اور زعفران منزل کی روایا

یہ سب مل کر اس کے دکھ کو کم نہیں کر سکتے ۔ کہیں سے اس کے لئے تھوڑا سا سکو

نہیں منگوا سکتے ۔ تھوڑا سا سکون ۔ ارے میں کتنا بدقسمت ہوں ۔ مال پر واپس پہنچے

لئے وہ ہیرو ڈرائنگ روم میں گیا جس کے سرہانے پڑا ایوی کورٹ میں خوب تیز روشنی

ہو رہی تھی ۔ اور وائلن کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں ۔ اس کے چہرے پر لکھی ہوئی ٹھنڈ

تھی ۔ ہوا بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی ۔ ہاں تو میں سوچ رہا تھا ۔ خیالات کے سلسلے کو جب

نور منزل کے پھاٹک تک پہنچ کر چند منٹ کے لئے منقطع کرنا پڑا تھا ۔ یہ سکون ٹھنڈ

سعد تھا مونٹی مال پر آ کر اس نے پھر جوڑا ۔ میں یہ سوچ رہا تھا ۔ ہش — سو بہت

سادہ سی بات یہ تھی کہ یہ کمبخت سرخ بالوں والی دلانی عورت کرسٹابی اس کے بجائے

اس کے دوست کی بیوی تھی ۔ اور اس حقیقت کے سامنے سارا جرمن اور ویدانت

فلسفہ بیکار تھا ۔ ہاں یہ حقیقت تھی ۔ اور وہ بے انتہا بدقسمت تھا بے حد دکھی

اور اسٹیج کے فرش پر تین رنگوں سے بنے ہوئے ہندوستان کے نقشے کے کنارے کنارے مٹی کے چراغ ایکبار پھر جھلملا اُٹھے اور بہت ساری آوازوں نے ملکر ایک نیا گیت اُٹھایا اور وہ پیانو جو کیتھولک حمدوں اور کلاسیکل مغربی نغموں اور کورس اور کمیونٹی کے گانوں کے سروں کا عادی تھا۔ اس کے پردوں میں سے ایک بڑا اجنبی، بڑا شیریں، بڑا انوکھا نغمہ بلند ہوا۔ جن گن من ادھینا یک جے ہے بھارت بھاگیہ ودھاتا — چراغ جھلملاتے رہے۔ ساز بجتے رہے۔ ملک بھر کے ان مارتے مرتے انسانوں کے لئے اتنے بہت سارے لوگ اپنے اپنے طریقے سے جو کچھ کر سکتے تھے کر رہے تھے۔ ان کے دلوں میں جذبہ تھا۔ خلوص تھا۔ جوش تھا۔ دکھ تھا بے انتہا شدت کا دکھ اور تکلیف۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے ہمیں اس طرح نہ مرنے دو۔ خدا کے لئے اس طرح نہ مرنے دو۔ زندگی بلند ہے۔ زندگی پاکیزہ ہے۔ زندگی مقدس ہے۔ خداؤں نے زندگی خون میں رگیدے جانے کے لئے تخلیق نہیں کی تھی۔ ساز تیزی سے بجتے رہے۔ یہ راجپوتانہ کا جھومر ہے۔ یہ گجرات کا گربا ہے۔ یہ لکھنؤ کا کتھک ہے۔ یہ ہندوستان ہے۔ ہندوستان کی اصل روح ہے۔ اس کی حیات کا نغمہ اس کے مٹی اور خون میں ملتے ہوئے آدرشوں کی تفسیر ہے۔ ہندوستان بلند ہے۔ اس کی بلندی اس کے آرٹ میں ہے۔ اس کی موسیقی میں ہے۔ اس کے رقص میں ہے، اس کی روایات میں ہے۔ ارے ہم بنگال اور بہار اور پنجاب کے خون کی دلدلوں کی اتھاہ پستی میں گرتے ہوئے ہندوستان کو کیوں نہیں تھام پاتے کیوں نہیں اوپر اٹھاتے ——

اسٹیج کے پیچھے اندھیارے میں گیتی کول بالکل خالی الذہن ہو کر پیانو کے

پردوں پر دوسرے سازوں کی دھن کے ساتھ ساتھ انگلیاں مارتی رہی دگنی کول
جو دنیا کی بہترین پیانو بجانے والی لڑکی تھی) پردوں کی دوسری طرف جگمگاتے ہوئے
اسٹیج کا لکڑی کا فرش ایک "فوک ڈانس" کے تیز تیز اور پرشور قدموں کی تھاپ سے
گونج اور لرز رہا تھا۔ "کما تھاری گوپین نے باجوبند سوہے۔ کما تھاری گوپین نے
باجوبند سوہے۔" پیانو کے ساتھ ساتھ ناچ کے بول ایک ہی لے ایک ہی آواز میں
یکسانیت سے دہرائے جاتے رہے۔ تیزی سے گھومتی ہوئی لڑکیوں کے سیاہ
اور سرخ دوپٹوں اور لہنگوں میں جڑے ہوئے شیشے اور چاندی کے گھنے رو پہلی
میں چکر کاٹ رہے تھے۔ یہ زندگی کی گرمی تھی۔ زندگی کی حرارت تھی۔ زندگی کی
تڑپ تھی۔ گینی کول رنگ اور راگ اور روشنی کی اس آندھی سے ہزاروں میل دور
اپنے سامنے دوڑتے ہوئے سفید پردوں پر انگلیاں مارتی رہی۔ "کما تھاری گوپین
نے باجوبند سوہے پگیا ماہیے رز ماماہے، زنک زنک نچے۔" کما تھاری گوپین تے
کما تھاری گوپین نے گھنگرؤں کا شور، اور پیروں کی دھمک اور طبلے کی چوٹ اس
کے دماغ پر پڑتی رہی۔ فٹ لائیٹس کے پرے، ہال کے وسیع اندھیارے میں وہ
سب بیٹھے تھے۔ وہ سارے جانے پہچانے پیارے پیارے لوگ (دوستوں اور
ساتھیوں کا وجود زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے گینی ڈارلنگ رخشندہ نے
کہا تھا) وہ سب، اس کے پیارے، ہمدرد، دلچسپ اور پُرخلوص ساتھی وہاں موجود
تھے۔ فیروزا در سروپ بخشی اور چندر ریکھا پنڈت اور شکنتلا اصانی اور ابراہام اور شکنتلا
قدوائی، یہ سب اچھے جانے بوجھے لوگ۔ اور اسٹیج پر جھلملاتے مٹی کے چراغوں کی
روشنی ان کے چہروں پر پڑ رہی تھی اور وہ سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے اپنی اپنی

سے چلتے رہے، گنتی کول نے پیانو پہ سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چاروں
طرف چکر کھاتا، گھومتا، امنڈتا اندھیرا دھیرے سے گہرا چھا گیا۔ یہ جد و جہد کاہے کے لئے
ہے۔ کہیں سکون نہیں ملتا۔ کہیں نہیں ملتا۔ یہاں پر کوئی سکھی نہیں۔ سب پوزیر ہیں
سب فریب خوردہ ہیں۔ سب مجبور ہیں۔

صرف ایک ڈون ژوان کا بھتیجا صاحبزادہ سعید احمد خاں صحیح راستے پر ہے
بڑے چین کی زندگی گزار رہا ہے۔

ہاں ستانے کی بات یہ ہے سو اصل یہ واقعہ تھا کہ وہ گنتی کول بے حد دکھی بہت
قسمت تھی۔ وہ جو سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔ جو دنیا کی سب سے زیادہ دلکش سب
سے زیادہ ذہین سب سے زیادہ پیاری لڑکی تھی۔ وہ جو اکثر ڈنر کے بعد کی گفتگو کا
موضوع رہتی تھی۔ کرشن نرائن کول آئی سی ایس کی بھوری آنکھوں والی لڑکی جو
سونے کے برتنوں کی مالک ہے۔ وہ جس کا اتنے دنوں انتظار کرتی رہی تھی وہ جو
اسے ایک خاموش شام دو بکشا کے پام کے درختوں کے نیچے مل گیا تھا۔ وہ جو ایسے
انسانوں میں سے تھا جنہیں وہ ہمیشہ پسند کر سکتی تھی جن کے متعلق اس نے ہمیشہ
سوچا تھا۔ وہ جو عورت کو سمجھتے، اس کی قدر کرنے والے ذہین صاحب نظر صاحب
دماغ نوجوان، بڑے بڑے [illegible] پڑھی [illegible] باتیں کرنے والے بڑے بڑے انٹلکچوئل
وہ کھدر پوش قسم کے سیر انٹلکچوئل نہیں جو امین آباد اور حضرت گنج کی سڑکوں
پر پیدل گھومتے ہیں اور ونڈر یا کافی ہاؤس میں شام کے وقت سب کو بور کرتے
ہیں، بلکہ وہ بڑے بڑے باپوں کے اسٹائلش لڑکے جو انگلستان کی یونیورسٹیوں
سے زندہ رہنے کا فن سیکھ کر آئے ہیں۔

اور اس کے متعلق آپ سے بڑی دلچسپ باتیں کر سکتے ہیں - اور جواب دلکشا یا چھتر منزل یا امپریل جم خانہ میں بے حد اسمارٹ طریقے سے اپنی زندگی گذار رہے ہیں - انٹلکچوئیل پن میں بھی "کلاس" ہوتی ہے) صاحبزادہ سعید احمد خان بھی بالکل ایسا ہی تھا - وہ بھی اپنے چہرے پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی قومی یا ادبی یا ترقی پسند کیفیت طاری کر کے بیٹھتا تھا - وہ بھی بے حد شولرس تھا - بہت عمدہ رقص کرتا تھا لیکن وہ ڈون ژواں کا بھتیجا شادی شدہ نکلا ویسے بھی وہ بھلا گنّی کول سے شادی کس طرح کر سکتا تھا - گنّی کول فردوسِ کشمیر کی برہمن زادی وہ رامپور کا پٹھان خالص رامپور کا پٹھان - کوئی مذاق تھوڑا ہی تھا) ———

بیفکری سے گھنگرو بجاتی اور "کماّ تھاری گوری نئے کی دھن گنگناتی ہوئی رخشندہ اسٹیج کے پیچھے آئی - اور جلدی جلدی چاروں طرف بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگی (ا سے پیانو کے پیچھے، اندھیرے کونے میں بیٹھی ہوئی گنی کول نظر نہیں آئی)

گنّی کچھ دیر تک متوقع رہی کہ رخشندہ باتیں شروع کرے - کسی طرح وہ سکوت، وہ روتا ہوا سناٹا منتشر ہو لیکن رخشندہ مزے سے اپنے کام میں مگن تھی (دوستی کی ایک اسٹیج وہ آتی ہے جب ایک دوسرے سے باتیں کرنے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور باتیں بہت ہی سطحی چیز معلوم ہوتی ہیں - چنانچہ رخشندہ ناچ کی دھن گنگنانے میں مصروف رہی -)

"دیکھا تم نے روشی - یہ کمبخت شادی شدہ تھا - گدھا - کچھ دیر بعد گنّی نے پیانو

پر سے سر اٹھا کر اسے بڑے سکون سے مخاطب کرنے کی کوشش کی (وہ قطعی نہیں روئے گی)

ہوں (کمّا تھاری گوپین نے باجو بند سوہے۔ کمّا تھاری گوپین نے باجو بند سوہے ؟ اور بیوی کو اپنی پردے میں رکھتا ہے سور) گنی نے کہا۔

"سووِٹ"۔ رخشندہ اطمینان سے دوپٹے تہ کرتی جا رہی تھی۔

"ایں —— روشی۔ تم کو شوک بالکل نہیں پہنچا ؟ یعنی سوچو تو کہ ——" اس کی پلکیں بھیگ گئیں (اندھیارا گہرا ہوتا گیا)

"قطعی نہیں۔" رخشندہ نے پیشانی پر سے بال ہٹا کر اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ مرد تو فطرتاً پرمسکوتس ہوتا ہی ہے (تم سب واللہ اتنا بور کر دیتی ہو۔ گولی مارو نا اِن سب قصّوں کو)

"لیکن۔ روشی ڈارلنگ ذہنی رفاقت ——" وقت کی وجہ سے اس کی آواز روندھ گئی۔ اس نے پیانو کے پردوں پر چہرہ رکھ دیا۔ جس کی وجہ سے دفعتاً بہت سارے سُر پیدا ہو گئے۔ جنہیں شوپان بالکل نہ سمجھ سکتا تھا (لیکن وہ قطعی نہیں روے گی۔ اس نے طے کیا)

"کیا ——" رخشندہ نے اپنی کالی آنکھیں پوری طرح پھیلا کے تقریباً چلّا کر پوچھا۔ چیزیں سمیٹتے سمیٹتے رک کر وہ ایک لحظے کے لئے پلکیں جھپکاتی رہی اور صورت حال کی ساری شدید ٹریجڈی جب اس کی سمجھ میں آئی تو وہ کوسٹیومز کی الماری کا پٹ زور سے بند کر کے اسٹیج کی پچھلی سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔ اور اپنے ہاتھوں پہ چہرہ ٹکا کر غور و خوض میں مصروف ہو گئی۔ تو یہ بات ہے ساری۔ یہ دراصل سارا واقعہ ہے

گرین روم میں ہمیشہ کی طرح بہت تیز خوشبوئیں امنڈ رہی تھیں۔ رنگوں کے ڈبے اور کیبرے کی ملبوسات اور سینڈلز کے انبار فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ اور سگرٹوں کے دھوئیں اور پرانے پھولوں کی مہک ناک میں گھسی جا رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا جو سے فیئر کے پچھواڑے، اونچے نیچے پتھروں والے فرش کی گلی میں کھلتی تھی۔ گلی کے اختتام پر سٹرک کے لیمپ کی نیلی روشنی بھیگتی رات کے دھندلکے میں مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ گرین روم کے پرے، گیلریوں میں سے لوگ آہستہ آہستہ ادھر اُدھر گذر رہے تھے۔ ریلیف فنڈ کے ورائٹی شو کی منتظم لڑکیاں پردوں کے پیچھے اور خالی اسٹیج پر اور سنسان ہال میں جلدی جلدی اپنا کام نپٹانے میں مصروف تھیں۔ ان ہی میں کروا ہاراج کی رخشندہ تھی۔ اور گیتی کول تھی۔ اور دوسری راجکماریاں اور اونچی اونچی لڑکیاں تھیں۔ وہیں کوئین روز بھی تھی۔ وہ لڑکیاں محض ملک کی ضرورت اور انسانیت کی خدمت کے لئے اس ماحول میں، گرین رومز کی خوشبوؤں اور فٹ لائٹس کی روشنیوں میں خود کو موجود پا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ہنستی، گنگناتی اور تفریح بھی کرتی جا رہی تھیں۔ کوئین روز خداوند خدا کی وعدہ کی ہوئی روزانہ کی روٹی کے لئے وہاں آتی تھی اور کیبرے کی قلابازیاں کھاتی تھی۔ اس میں اس کے لئے کوئی تفریح نہیں تھی۔ وہ ہنس اور گنگنا بھی نہیں رہی تھی۔ وہ چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھی اپنے بھورے بالوں میں سے روپہلی ستارے علیحدہ کرنے میں مشغول تھی۔ ہوا بالکل بند تھی اور فضا کی گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔

"ارے بھئی جالینوس —" باہر گیلری کے سرے پر سے رخشندہ کی شگفتہ آواز سنائی دی۔ وہ در یچے پر سے ہٹ کر دروازے میں آگیا۔

"اے جالینوس بہادر" گیلری کے مجمع میں سے نکل کر رخشندہ نے اُسے پھر پکارا۔

وہ باہر آ گیا
اور گھنگرووں کا انبار اٹھائے، بہت تھکی ہوئی رخشندہ نے دیکھا۔ کہ وہ کوئین ورز کے گرین روم میں سے نکل رہا ہے ——

وہ دونوں بالکل چپ چاپ پورٹیکو سے باہر کار میں آ بیٹھے۔
وہ ایک لمحے کے لیے بالکل خالی الذہن رہی۔ اور اپنی بڑی بڑی کالی آنکھیں کھولے اپنے سامنے سڑک کے دھندلکے کو دیکھتی رہی اور اس کے چاروں طرف چکر کھاتا، گھومتا، امنڈتا اندھیارا زور سے گرجنے لگا۔ حالانکہ وہاں پر خوب تیز روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور بڑی سرعت کے ساتھ کار کی مخالف سمت پیچھے کو دوڑتی جا رہی تھیں۔

دفعتاً اس نے، اسی طرح سامنے دیکھتے ہوئے، رفتار انتہائی تیز کر کے کار سیدھی سڑک پر چھوڑ دی۔ اور تیز —— اور تیز —— (جب وہ خوب تیزی سے کار چلاتی تھی یا فلائنگ کلب کے چھوٹے سے زرد رنگ کے ہوائی جہاز میں پولو کے ساتھ بیٹھتی تھی اور پولو خاموشی سے بادلوں کو کاٹتا ہوا کے زناٹے میں سے گذرتا آسمانوں کی نیلاہٹ میں آگے بڑھتا جاتا تھا۔ اس وقت وہ سوچتی تھی۔ مکمل اور بھرپور زندگی یہ ہے۔ یہ تیز رفتاری ہی اصل حیات ہے۔ اس سمے وہ سب کچھ بھول جاتی تھی۔ ایکسلریٹر کو اور زیادہ۔ اور زیادہ دباتے دباتے اس سمے اسے کچھ یاد نہ رہتا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ اور ہوا کے تھپیڑے اور فضا کی سنسناہٹ ایک ہیں۔

بالکل ایک۔ اس کا جسم، اس کا سوچنے والا دماغ، سب کچھ پیچھے رہ جاتا اور رفتار کے اضافے کے ساتھ ساتھ بس صرف اس کا دل دھڑکتا رہتا تھا۔ جب رفتار کی سوئی ساٹھ پر پہنچ جاتی۔ اس وقت وہ اپنے میں بہت ہی زیادہ ہمت پاتی تھی، وہ سوچتی اس وقت تو وہ جانے کیا کیا کر سکتی ہے۔ اس وقت اس میں اس کی ساری 'خود اعتمادی' اور 'بھروسہ' اور 'یقین' پہلے سے دوگنا ہو کر لوٹ آتا تھا۔ ان چند لمحات کے لئے وہ ——— کسی پریوں کی کہانی کی راجکماری کی طرح خوش ہوتی تھی۔ لیکن موٹر کو آخر کہیں نہ کہیں تو رکنا ہی ہوتا تھا۔ اور اور اس کی تیز رفتار ڈرائیو ہمیشہ اتنی ہی جلد ختم بھی ہو جاتی تھی۔ اور وہ پریوں کی کہانی کی راجکماری نہیں بلکہ اودھ کی ایک چھوٹی سی اور تنزّل پذیر زمینداری کی بہت معمولی اور بہت دکھی لڑکی تھی۔ اُس نے رفتار اور تیز کر دی، ہاں۔ وہ تو بہت ہی دکھی تھی۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلکا بڑھتا جا رہا تھا اور فضا کا سناٹا تیر کی طرح اس کے برابر سے گذر رہا تھا (سلیم اس کے برابر، اس کے قریب بیٹھا اس سے ورائٹی شو کی کامیابی اور آمدنی کے متعلق پوچھ رہا تھا) وہ زناٹے سے مال پر سے نکل کر شاہ نجف روڈ پر آ گئی۔ اور حسبِ عادت ایکسلریٹر پر اُس کے چھوٹے سے کنول ایسے پیر کا دباؤ زیادہ ہوتا گیا۔ رات کی ہوا میں جس میں سکندر۔ باغ کے پھولوں کی مہک ملفوف تھی، اس کے بال اڑنے لگے۔ دفعتاً اُس کا سوچنے والا دماغ اور کام کرنے والا ذہن پھر واپس آ گیا اور اُس نے طے کر لیا کہ اس وقت وہ پچاس کی رفتار پر اڑی جا رہی ہے۔ اور اُس کی ساری خود اعتمادی اور یقین واپس آ گیا ہے۔ وہ ستّر ——— اسّی ——— ایک سو میں

دوسو بالکل روکٹ کی رفتار پر پہنچ کر ایک دم بڑے زور سے چلّائے گی۔ اے ۔۔ ائی ۔۔ تم ۔۔ تم ۔۔۔ لیکن آناً فاناً بین کارلٹن آ پہنچا اور ہمیشہ کی طرح اس تیز رفتاری کی مدت بھی فوراً ختم ہو گئی۔

وہ اترا۔ اس نے جھک کر بڑے اخلاق سے دروازہ بند کیا۔ اور شب بخیر کہہ کے رومال سے ناک چھوتا پھاٹک کے اندر چلا گیا۔

دھیرے دھیرے کار پھاٹک سے آگے بڑھا کر بہت تھکی ہوئی، وہ شاہ نجف روڈ کو طے کر کے اوڈرم روڈ پر آ گئی۔ اور زعفران منزل کے تاریک باغ میں پہنچ گئی۔ پھر گیرج کا دروازہ بند کر کے گھنگروؤں کا انبار اٹھائے وہ اپنے کمرے میں گئی۔ اور مسہری کے کنارے پر بیٹھ کر اُس نے سوچا کہ اب وہ لباس تبدیل کریگی۔ پھر اُس نے طے کیا کہ اب وہ ریلیف فنڈ کے حساب کتاب پر نظر ثانی کرے گی۔ پھر اُس نے ارادہ کیا کہ ممّی کے کمرے تک ایک چکر لگا آئے گی۔ پی چو اور ریپو کو ابھی واپس نہ آئے تھے اور زعفران منزل بالکل خاموش اور تاریک تھی۔ وہ مسہری پر سے اُٹھ کر گیلری میں آ گئی۔ کھڑکی کے پردوں میں سے اس نے دیکھا کہ چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح چلتی ہوئی سنسان گیلری میں سے گذر کر وہ موسیقی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے ہر چیز کو چھو کر دیکھا۔ وہ کمرہ اپنی ہمیشہ کی سی لاابالی بے ترتیبی کے ساتھ اسی طرح موجود تھا (دنیا کی ہر چیز ویسی کی ویسی ہی تھی) دیوان پر ستار اوندھا پڑا تھا۔ تان پورہ دیوار سے لگا ایک کونے میں کھڑا اپنی جان کو رو رہا تھا۔ طبلہ اور بایاں ایک دوسرے سے روٹھا قالین پر پڑا تھا۔ پی چو کے وائلن اور مینڈولین اپنے بکسوں میں بند ایک طرف کو اوپر تلے

رکھے تھے۔ ایک الماری میں موسیقی کی تھیوری کی انگریزی اور ہندی کی کتابیں اور بہت سا الّم غلّم ٹھنسا ہوا تھا۔ اس نے روشنی کر کے ان سب پرانی، پیاری مانوس چیزوں کو غور سے دیکھا۔ دیوان پر بیٹھ کر اس نے طے کیا کہ اب وہ ستار ٹیون کرے گی۔

پھر اُس نے قطعی طور پر ارادہ کر لیا کہ وہ ان سب کمبخت سازوں کو زور سے ایک دوسرے سے ٹکرا دے گی۔ اور اُن کے پاش پاش ہوتے ٹکڑوں اور جھنجھناتے تاروں اور پردوں سے ایک ایسا، نئی قسم کا راگ ایجاد ہوگا۔ جسے سارے بیوقوف سنگیت وشارد اور خود بھگوان شیو تک نہ پہچان پائیں گے۔

اور پھر ایسا ہوا کہ دفعتاً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اِس قدر روئی کہ اس کی آنکھوں کے پپوٹے بالکل سُرخ ہو گئے۔ وہ جو ابھی ایک گھنٹہ قبل گپتی کول کو لکچر پلا رہی تھی۔ کیتنی ہنسی کی بات تھی۔

اور جب مے فیر تماشائیوں سے قریب قریب خالی ہو گیا۔ اور ساری موٹریں سائیکلیں، اور تانگے ایک ایک کر کے مال پر سے گذر گئے اور حضرت گنج کی دوکانیں بند ہونے لگیں اس وقت مے فیر بار کی پچھلی گیلری میں سے نکل کر ایک گروہ ڈھیلے ڈھالے بیفکرے قدم رکھتا سامنے پورٹیکو کی نیلی روشنی میں آکھڑا ہوا ان سب کے ہاتھوں میں پائپ اور تمباکو کے ڈبّے تھے۔ اور اُن کے چہروں پر شدید قسم کی ادبی اور قومی کیفیتیں برس رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے کرن کو ڈریس سرکل کے زینے پر سے اترتے دیکھ لیا۔ وہ سب اُسے پکڑ کر باہر کھینچ

لائے۔ سالے اتنا زوردار تمہارا پروگرام رہا۔ واللہ کیا چمکیلی لونڈیاں اسٹیج پر آئی ہیں کہ طبیعت گلیڈ ہوگئی۔ اِس خوشی میں براہمنوں کو بھوجن کراؤ۔ انہوں نے کہا اور اُسے اپنے ساتھ دھکیلتے ہوئے کیپوٹرز کی سمت چل پڑے۔

یہ وہ وقت تھا جب اندھیرے پراسرار آسمانوں سے ایک سحرزدہ سکوت اتر کے سارے شہر پر چھا جاتا ہے۔ کہیں کہیں کسی روشن فلیٹ سے کوئی وائلن چیخ اُٹھتا ہے۔ کوئی بھولی بھٹکی کار ایک طویل ہارن بجاتی گذر جاتی ہے۔ کوئی شب زندہ دار کتا دفعتاً چلانے لگتا ہے۔ اور پھر وہی سکوت طاری ہوجاتا ہے بال روڈ ناقابل یقین طور پر چپ چاپ پڑی رینگتی رہتی ہے، ساری عمارتیں ساری تفریح گاہیں ساری دنیا تاریک ہوجاتی ہے۔ صرف چینی ریسٹوران اور امبیسڈر اور کیپوٹرز کے دریچوں میں سے نکل کر روشنی کی نیلی اور سفید لکیریں باہر سنسان سڑک پر بہتی رہتی ہیں۔ اور چوراہے پر سڑک کے لیمپوں کی نیلی روشنیوں کی ایک خاموش جھیل سی بن جاتی ہے۔ وہ یہ سمجھے ہے۔ جب سارا عالم سوتا ہے۔ اور صرف کیپوٹرز اور امبیسڈر میں چند اللہ والے جاگتے ہوتے ہیں۔

کرن کو اپنے محاصرے میں لے کر وہ سب کیپوٹرز کے ایک کونے میں جا بیٹھے کرن کو نیند آرہی تھی۔ وہ گھر جانا چاہتا تھا۔ لیکن پھر بھی ان لوگوں کی دل شکنی کے خیال سے وہ زبردستی بڑی خوش خلقی سے اُن کے ساتھ ہنستا رہا۔ اِس مجمع میں بھی وہ خاصا ’ایٹ ہوم‘ محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ ان سب کی وجہ سے اُسے اپنی فلسفہ دانی، اپنی نظموں، ڈراموں اور نیو آیرا کے تنقیدی اور طنزیہ مضامین کے لئے کافی مسالہ مل جایا کرتا تھا۔ یہ شہر کے چوٹی کے ’انٹلکچوئیل‘

اور فن کاروں کا گروہ تھا۔ ایسا گروہ جو ملک کے ہر بڑے شہر دہلی، بمبئی، لاہور، حیدرآباد میں عموماً دن بھر فٹ پاتھوں پر گھومتا نظر آتا ہے اور رات کو شراب خانوں میں بیٹھ یا لیٹ کر دنیا کو، اپنے آپ کو، سرمایہ داروں کو، خدا کو، ان لڑکیوں کو جنہوں نے اُن کا نوٹس نہیں لیا۔ گالیاں دیتا ہے۔ کیو تزریں حسبِ معمول اس وقت رات کے پرند جمع تھے۔ یونیورسٹی کے بہت سینیئر طالب علم اور اولڈ ٹائمرز، جو وہاں بیٹھ کر یونیورسٹی کے پراکٹوریل اسٹاف کی شان میں قصیدے لکھتے تھے۔ مقامی فلم کمپنی کی چند انتہائی لاؤڈ اور چمکیلی ایکٹرسیں جن کے فیشن ایبل سوٹ پہننے والے بھائی ان کے میر شکار کی حیثیت سے ان کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے، بہت فلاکت زدہ ترقی پسند شاعر جو کرن کی طرح کے معزز اور دولتمند دوستوں اور جاننے والوں کو زبردستی کھینچ کر وہاں لے آتے تھے کہ بیٹا آج کا ہمارا بل تم ادا کرو، تم کمبختوں کے بیکار روپے سے ملک کی انٹیلیجنسیا کو کچھ تو فائدہ پہنچے۔ یہ گویا لوکل بوہیمیا تھی۔ وِمّل، راز، سلام اور کوشَل جو ریڈیو کراؤڈ کے دوسرے لوگوں کے ساتھ قہوہ ختم کر کے اب وہاں سے اُٹھنے والے تھے ان سب کو دیکھ کر ان کی میز کی طرف آ گئے۔

"آج کرن بھائی نے اپنے ڈرامے کی کامیابی کی خوشی میں قلندروں کی دعوت کا فیصلہ کیا ہے بائی —— را —— ادھر مانگتا۔" وہ سب چلائے۔

"آج ہم بہت خوش ہیں۔ ہم زندگی کا رقص دیکھ کر آ رہے ہیں۔" ان میں سے ایک نے راز سے کہا۔ زندگی جو کہیں نہیں ملتی۔ وہ اپنے اپنے گلاسوں کی طرف متوجہ ہو گئے (ارے یہ زندگی کی، جسم کی اکتاہٹ، جو پیٹھ پر، ریڑھ کی ہڈی پر رینگتی ہے۔ رینگتی جاتی ہے۔ یہ سب لوگ ایک ساتھ مل کر اتنا کیوں چلا رہے ہیں۔ کرن

تھک کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ سب زور شور سے کوئی بے سروپا بحث کر رہے تھے۔
"جسم —— ؟ اماں جسم اسٹیٹ کا۔ دماغ اسٹیٹ کا۔ میری نئی نظم پڑھو" ایک نے ترنگ میں آکر کہنا شروع کیا۔

"ارے چپ رہو خود تو کچھ جانتے نہیں۔ چار باتیں اِدھر اُدھر سے سن کر کان میں ڈال لیں اور ہر جگہ اپنی قابلیت بگھارنے آن بیٹھتے ہو۔ ہُنہہ۔ انارکسٹ بننے ہیں بیچارے" دوسرے نے بگڑ کر کہا۔ "بائی —— را —— اِدھر اور مانگنا۔"

شور مچتا رہا۔ جسم —— ؟ جسم کوئین روز کا —— تیسرے نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔ شور میں اضافہ ہو گیا۔

"جیتے رہو اماں جیتے رہو —— واللہ کیا بات کہی ہے کہ جی خوش ہو گیا۔ اگر لکھنؤ میرے باپ کا ہوتا تو اسی وقت تمہیں بخش دیتا" چوتھے نے کہا۔ اور رونے لگا۔

"اس کی اماں جانی کو ساڑھے چھ روپے ماہوار وثیقہ ملتا ہے" ان میں سے ایک نے بڑے رازدارانہ لہجے میں دل کو بتایا اور پھر خود بھی رونا شروع کر دیا (کپورز ان دنوں غالباً بہت عمدہ قسم کی وہسکی سپلائی کر رہا تھا)

اوشیر لہری پائنیر کے مدراسی کارٹونسٹ واسو کے ساتھ دوسرے کونے میں بیٹھا اپنی اسکیچ بک میں محو تھا۔ اسے دیکھ کر وہ سب پھر چلائے۔

"اوشیر بھائی آج کل تمہاری پریم آتما کس طرف کی آؤٹنگ کرنے گئی ہے؟" ایک نے پوچھا دکرن بیٹھے بیٹھے دفعتاً اٹھ کر باہر چلا گیا کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا)

"اوشیر تمہاری وہ رقص حیات والی راجکماری کہاں گئی؟ دوسرے نے

آواز دی۔

"کیوں میاں تمہیں کوئی راجکماری چاہیئے"۔ ایک نے اپنے ساتھی سے سنجیدگی سے پوچھا

"ارے بھائی ہمارا تو یہ حساب ہے کہ ملے تو واہ واہ اور نہ ملے تو واہ واہ"۔ اس نے بڑی قناعت سے جواب دیا اور پھر اپنے گلاس کے بلبلوں میں ایک تنکا ڈبونے میں مصروف ہو گیا۔

یک لخت وہاں پر مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ دل اور ریڈیو کراؤڈ میں سے کئی پہلے ہی اٹھ کر جا چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے وجود کی ٹریجڈی پر غور کرتے کرتے یک بیک رونا شروع کر دیا (ارے وہ اوشیر بھائی والی راجکماری تو اس بورژوا کرنل کے ساتھ عیش کر رہی ہے۔ ابھی ابھی پروگرام کے بعد اسے اپنی موٹر میں بٹھا کر یوں بجلی کی طرح کوندتی ہوئی سامنے سے نکل گئی کہ دل پر چھریاں چل کر رہ گئیں قسم خدا کی تیسرے نے چوتھے سے کہا جو پہلے سے رو رہا تھا۔ اس پر اور زیادہ رقت طاری ہو گئی)

اوشیر نے ایک لمحے کے لئے اسکیچ بک پر سے نظر اٹھا کر ان کو دیکھا اور پھر تصویریں بنانے میں مشغول ہو گیا۔ اس کے قریب بیٹھا ہوا ایک نووارد پنجابی کامریڈ خاموشی سے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خود بہت دل شکستہ تھا کیونکہ اسی روز بمبئی سے وہاں پہنچا تھا۔ بمبئی میں ایک مشہور و معروف ترقی پسند افسانہ نگار خاتون اس سے عشق کر رہی تھیں۔ اس نے ان سے شادی کی درخواست کی تھی جس پر انہوں نے فرمایا تھا کہ میں شادی تو آپ سے کر لوں گی۔ لیکن آپ کو اس کے لئے ابھی

تیار رہنا چاہیئے کہ میرے اور بھی مرد دوست رہا کریں گے۔ کیونکہ میں فطرتاً حسن پرست ہوں۔ اس روح افزا وارننگ کے شوک سے وہ اب تک اچھی طرح نہ سنبھل پایا تھا اور اپنے آپ کو انتہائی دل شکستہ محسوس کر رہا تھا۔ فضا کے اثر سے رقت اُس پر بھی طاری ہونے لگی)

"ہُنہہ۔ انارکسٹ ہے۔ کوئی سے روز بھی انارکسٹ ہے سالی۔" بلا نوشوں میں سے ایک نے باقی سب کو اطلاع دی۔ سب اس پر غور کرنے میں مصروف ہو گئے۔

یکایک اُن میں سے ایک اپنے سامنے سے زور زور سے کرسیاں ہٹاتا ادشیر کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا "تم کون ہو ـــــ؟" اُس نے بحید غور سے ادشیر کی شکل دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا تم بھی انارکسٹ ہو؟"

"ارے بھائی نہ میں انارکسٹ ہوں۔ نہ سوشلسٹ۔ نہ کوئی اور اسٹ لسٹ میں تو محض ایک آرٹسٹ ہوں"۔ ادشیر نے اکتا کر پنسل رکھتے ہوئے کہا۔ (اور اپنی Personal integrity. قائم رکھتا ہوں ــــ کوشل نے اسے یاد دلایا وہ ہنس پڑا) چار پانچ کرسیاں اور گریں۔ اور چند اور بلانوش اردو کے اس شعلہ بیان انتہائی دبلے پتلے مدقوق شاعر کو پکڑ کر اندر لے آئے۔ جسے اب دیسی شراب قریب قریب ختم کیے ڈال رہی تھی۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی بالوں والی بڑی ٹوپی ایک طرف پھینک کر اپنی چھوٹی چھوٹی اور کبھی کبھی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"ہمارا اندھیری رات کا مسافر آ گیا"۔ ایک بلانوش نے خوشی سے چلّا کر کہا۔ (سہاگی کی آنکھوں میں خوشی کے مارے پھر آنسو بھر آئے)

"اندھیری رات کے مسافر تمہاری کیا خاطر کی جائے ؟" انہوں نے پوچھا
"خاطر ـــــ ؟" وہ پھر منہ میں بڑبڑایا ۔ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے اُس کی زبان ہمیشہ لڑکھڑاتی رہتی تھی ۔

"ہاں ۔ آج کرن نے ہماری ساری دنیا کی ساری کائنات کی حضرت سلیمان کی طرح دعوت کی ہے ۔ ارے ہمارے پیارے کرن بہادر کا بچّو" (انہوں نے کرن کی تلاش میں چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن وہ کب کا وہاں سے جا چکا تھا)

"خاطر ـــــ ؟" نیسرا چلایا ۔ "منیر سلطانہ کو بلواؤ ـــــ واللہ منیر سلطانہ کو بلواؤ ۔"

"تم نے منیر سلطانہ کو کبھی دیکھا ہے ؟ اُس کے بال دیکھے ہیں ۔ اُس کی آنکھیں دیکھی ہیں ؟" سب نے شاعر سے پوچھا جو منیر پر اتنی بڑھیا بڑھیا شرابیں رکھی دیکھ کر اب تک طے نہیں کر پایا تھا کہ کہاں سے شروع کرے ۔

وہ بے حس و حرکت بیٹھا چاروں طرف دیکھتا رہا ۔ "کون ـــــ ؟" اس نے خالی، زندگی سے عاری آواز میں پوچھا ۔

"منیر سلطانہ ۔ وہ بنتِ مہتاب ہے ۔ پردوں میں چھپی بیٹھی ہے ۔" انہوں نے اسکرین کی دوسری طرف جھانک کر دیکھا ۔ پام کے گملوں سے چھپا ہوا وہ کونہ خالی پڑا تھا (مقامی فلم کمپنی کی ایکٹرسیں اپنے میرشکار بھائیوں سمیت شوٹنگ کے درمیان کا وقفہ وہاں گذارنے کے بعد ابیٹ روڈ کے اسٹوڈیو واپس جا چکی تھیں

"ارے وہ تو بنتِ مہتاب تھی، اپنے گردوں کو لوٹ گئی ۔" انہوں نے بڑی بیکسی کے عالم میں گلاسوں کی طرف دوبارہ متوجہ ہوتے ہوئے کہا (وجو کی ٹریجڈی میں اضافہ ہو گیا)

"ارے منیر سلطانہ —— ارے وہ تو کل صبح لاہور واپس چلی جائے گی۔ اسکے بال کہاں نظر آئیں گے۔ اس کی آنکھیں کہاں نظر آئیں گی۔ وہ بھی نہیں ملتی۔ وہ بھی نہیں ملتی۔"

"جاؤ بھائی اسے یہاں واپس بلا کر لاؤ۔ ہمارا اندھیری رات کا مسافر آج اتنا رنجیدہ ہے۔" ایک بلانوش نے اس سے کہا جس کی اماں جانی کو ساڑھے چھ روپے ماہوار وثیقہ ملتا تھا۔

"ہاں ہاں جائیے قبلہ۔ فوراً جائیے۔ بلی کی چال جائیے اور چوہے کی چال ہماری منیر سلطانہ کو لے کر واپس آ جیئے۔" دوسرے نے یک لخت بے حد اخلاق کا لہجہ اختیار کر کے اس سے کہا۔

"جاتا ہوں بھائی جاتا ہوں۔" اُس نے گلاس پرے رکھ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ اور ریسٹوران میں سے نکل کر باہر سڑک پہ آ گیا۔ اور تیزی سے ایبٹ روڈ کی سمت روانہ ہو گیا۔

(کپور کے سائے کے سانپ رینگتے رہے۔ رینگتے رہے۔ سلام نے اوشیر کے قریب بیٹھے بیٹھے اپنے ذہن میں نئی نظم شروع کر دی جو اگلے مہینے کے ساقی میں شائع ہو گئی)

وہ سب چپکے بیٹھے اپنے ساتھی کا انتظار کرتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر دروازے پر نمودار ہوا۔

"کہاں ہے ہماری منیر سلطانہ؟" انہوں نے پوچھا۔

"منیر سلطانہ نہیں آئے گی۔ وہ رجعت پسند ہو گئی ہے۔" اُس نے بڑی رقت،

بھری آواز میں کہا۔

سب ہکا بکا رہ گئے۔ اور چند لمحوں تک ساکت بیٹھے اسے غور سے دیکھتے رہے

تھوڑی دیر بعد ایک بلانوش نے آہستہ آہستہ کہا "سنا بھائی اندھیری رات

کے مسافر۔ منیر سلطانہ نہیں آئے گی۔ وہ رجعت پسند ہو گئی ہے"۔ پھر سب پھوٹ پھوٹ

کر رونے لگے۔ منیر سلطانہ بھی رجعت پسند ہے۔ کومنین روز بھی رجعت پسند ہے۔ اوشیر

کی راجکماری بھی رجعت پسند ہے۔

وہ جس کی اماں جانی کو ساڑھے چھ روپے وثیقہ ملتا تھا۔ دبے دبے قدم

رکھتا ہوا اوشیر کے قریب آیا اور اس کی کرسی کے پاس فرش پر بیٹھ کر بڑی ہچکیاں

آنسوؤں بھری آواز میں آہستہ آہستہ کہنے لگا ——— اوشیر بھائی ——— میرے ہمدم ———

میرے ندیم ——— میرے دوست ——— ارے تم تو میرے بہت پیارے دوست ہو

——— سنا تم نے ——— وہ بھی نہیں آئے گی ——— منیر سلطانہ بھی نہیں آئے گی ———

زندگی کہیں نہیں ملتی ——— کہیں نہیں ملتی۔

باہر سڑک کے نیلے دھندلکے میں لپٹا ہوا سناٹا زیادہ تیزی سے چیخنے لگا۔

رات کے ان گرجتے طوفانوں میں سے گذرتا وہ ان اندھیرے راستوں پر جا

نکلا جہاں بھرپور زندگی کی خاموشی اور اطمینان لرزاں تھا زندگی کے اس شور و

غل، اس کارنیول جیسی دیوانگی سے پرے اور بہت سی چیزیں تھیں۔ بہت سی چیزیں

تھیں لیکن وہ سب کی سب ایک طرح کے دھندلکے میں چھپی ہوئی تھیں۔ جیسے

ستارے کہرے میں چھپ جاتے ہیں۔ دھندلکے اور کہرے میں چھپی ہوئی چیزیں

بڑی خوبصورت لگتی ہیں۔ لیکن بھاگتے ہوئے وقت کی پرواز روک کر ان خاموش خوبصورت چیزوں کی ایک جھلک دیکھنا بڑا مشکل تھا۔ وقت کی پرواز روکنے کا مطلب فرار تھا۔ فرار — فرار — ارے یہ تو بڑا عجیب لفظ ہے ہم نے سب قسم کے الفاظ اپنے اطمینان کے لئے گھڑ رکھے ہیں۔ جن کا کوئی مطلب نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔ ان کے ہونے نہ ہونے سے کسی چیز پر اثر نہیں پڑتا۔ کسی چیز کے ہونے نہ ہونے سے کسی بات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وجود کا چکر چلے جا رہا ہے۔ چلے جا رہا ہے۔ ارے کچھ تو کرو۔ کچھ تو کرو۔ آؤ ہم یہاں سے آگے چل کر کہیں ڈاکہ ڈالیں کسی کا خون کر دیں ان ساری چیزوں کو ایک دوسرے سے زور سے ٹکرا دیں۔ کچھ تو کرو۔ یہ زندگی بار بار حاصل نہیں ہوگی) ان راستوں کے کنارے کنارے رات کے پھول کھلے تھے اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت گھروں میں روشنی ہو رہی تھی اور ان میں سے فرشتوں کی موسیقی بلند ہو رہی تھی۔ سلیم آگے چلتا گیا۔ موسیقی رفتہ رفتہ قریب ہوتی گئی۔ کیا تم مجھے تلاش کر رہے ہو ڈارلنگ؟ کسی نے سازوں کی دھن پر قدم رکھتے رکھتے اس کے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ وہاں پر موجود نہ تھا۔ وہاں سامنے کی خوبصورت عمارت میں مدھم روشنی ہو رہی تھی اور آدھی رات کی حمدیں گائی جا رہی تھیں اور اس پرسکون دھندلکے میں ہر طرف پوئنسٹے اور للی کے سُرخ اور سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور وہاں پر اندھیارے میں صد یقۂ مریم کے مجسمے کے سامنے اکیلی شمع جل رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر ان مجسموں کو غور سے دیکھنے لگا۔ جو دھندلکے میں اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ تم مجھے تلاش کر رہے تھے میری جان؟ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سائے نے اس سے

پھر پوچھا۔ وہ اس اندھیارے میں داخل ہوا جہاں مریم کے مجسمے کے آگے شمع جل رہی تھی۔ ہوا بہت تیز تھی اور اس کے جھونکوں سے شمع کی لو بھڑک رہی تھی اور پوستے کے پھولوں کے سائے میں چھپا ہوا زہرہ کا مجسمہ اس کی روشنی میں جھلملا رہا تھا۔
وہ اپنی لمبی کالی پلکیں جھپکاتا تاریکی میں سامنے کی طرف دیکھتا رہا۔ ہوائیں کالے آسمان کے نیچے سنسنا رہی تھیں۔ زہرہ صدیقہ مریم کو کبھی شکست نہ دے گی۔ کبھی شکست نہ دے گی۔ ہواؤں نے ایک دوسرے سے سرگوشی میں کہا اور روتی ہوئی آگے روانہ ہو گئیں۔ وہ آگے بڑھا۔ اور اس نے دھندلکے میں مریم کے سامنے جھک کر پوچھا۔ ورجن میری۔ خدا کی مقدس ماں۔ کیا تم اس ٹھنڈی مرمریں زہرہ، اس خاموش لرزہ خیز وینس سے خوفزدہ ہو؟ کیا تمہاری الوہیت کی مقدس لو ابھی سکون سے یونہی چپ چاپ جلتی رہتی ہے۔ روح کی حیوانیت اور جسم کی پاکیزگی یہ چیزیں کیا ایک دوسرے کو شکست نہیں دیں گی؟ (یہ سب کچھ بھی نہیں ہے کچھ بھی نہیں ہے۔ ہوائیں روتی رہیں) شکست ۔ فرار۔ فرار۔ ارے وہی خالی بے معنی الفاظ۔ الفاظ۔ الفاظ۔ پوستے کے پھولوں کی پنکھڑیاں آدھی رات کے جھونکوں سے نیچے گر پڑیں۔ ارے میری پیاری زہرہ۔ تم نے اپنے بالوں میں وہ لوسری کے شگوفے کیوں نہیں سجائے۔ تمہاری آنکھیں اتنی پُرسکون کیوں ہیں۔ تم تیزی سے موٹر کیوں نہیں چلاتیں۔ کہ وہ جا کر سامنے کسی کمبخت چٹان سے ٹکرا جائے۔ تم چپ چاپ کھڑی ہو۔ تم روز شام کو صدیقہ مریم کے سامنے شمع جلاتی ہو۔ تم خوفزدہ نہیں ہو۔ تم بالکل خوفزدہ نہیں ہو۔ تم زندگی سے نہیں ڈرتیں۔ تمہیں کوئی تکلیف کیوں نہیں پہنچتی۔ تم کیوں خوب زور زور سے چلا کر نہیں روتیں۔ تم یہاں سے اٹھ

کر چلی کیوں نہیں جاتیں۔ تم پھولوں کے ٹھنڈے، بھیگے ہوئے گچھے میں اپنا چہرہ کیوں نہیں چھپا لیتیں۔

"اب تم کیا سوچ رہے ہو ڈارلنگ۔ "دھندلکے میں سے وہی آواز آئی (سرخ جاپانی کیمونو میں لپٹی ہوئی کوبین روز آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں روپہلے ستارے اٹکا رہی تھی۔ اور موسیقی کی دھن پر ادھر اُدھر قدم رکھتی جاتی تھی۔ ممّا دوسرے کمرے میں انگیٹھی پر مچھلی تل رہی تھی۔ رحیم لکڑی کی سبز جالی والے برآمدے میں کھڑا "سائیلنٹ نائیٹ ہولی نائیٹ" الاپ رہا تھا۔ فضا کی گرمی کی وجہ سے گلاب اور پوستے کی سرخ پنکھڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گلدان کے پانی میں تیر رہی تھیں۔ پیانو پر ایک بلوریں مرتبان میں چند بڑے بڑے سفید پھول رکھے تھے۔ ان کے سیدھے، ہرے، ملائم ڈنٹھل شفاف پانی میں ڈوبے ہوئے، آنکھوں کو بہت اچھے معلوم ہو رہے تھے۔

جس طرح ریگستان کے کنارے کنارے سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے)

مے ریاں ناپو گیو رے —— لیکن تم نے جو زخم لگائے تھے —— تم نے جو زخم لگائے تھے —— ارے بھئی اللہ میاں، کسی طرح یہ پڑھائی ختم نہیں ہوتی۔ ڈائمنڈ نے زور سے کتاب بند کر دی "تم نے جالینوس کے متعلق نازیبا ترین اسکنڈل سنا کرسٹی ڈارلنگ۔" اس نے "لالہ رخ" رنگ کر کے کہا۔ "گوش۔ وہ روز بروز دلچسپ تر ہوتا جا رہا ہے۔" وہ اس وقت بے حد خوش تھی اور اُس کا جی پڑھنے میں نہیں لگ رہا تھا۔ پچھلی شام گلبہر بو آئے نے اسے پروگرام کی کامیابی پر خوب مبارکباد دی تھی "لیکن وہ اتنا اچھا، اتنا سوئیٹ ہے کرسٹی ڈارلنگ کہ اسے اچھی طرح جان کر، اس سے

مل کر ذرا اکسائیٹ منٹ نہیں ہوتا۔" اس نے کہا۔ میں نے اُسے پی چُو کی رخصتی دعوت پر مدعو کر لیا ہے۔ پی چُو اور سب لوگوں کو میرا گوڈ بائی کرسٹی ڈارلنگ۔ اب میں پڑھنے جارہی ہوں۔ کل پروفیسر احمد شاہ کا پرچہ ہے۔ شام کو فیسٹ میں ضرور آنا۔ نطشے کا نظریہ ہے۔ نطشے کا نظریہ ہے۔ ٹیلیفون زور سے بند کر کے وہ پھر کتابوں میں مصروف ہوگئی)

ٹیلیفون بند کر کے کرسٹابل اپنے تنبیشوں والے برآمدے کے صوفے پر آن بیٹھی۔ درختوں پر ہلکا ہلکا مینہ برس رہا تھا۔ صوفے پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں (جب تمہاری خواہش ہو کہ کوئی تمہیں چاہے، کوئی تمہارے لئے مرے تو کوئی بھی نہیں مرتا ورتا۔ لیکن وہ لمحے، وہ وقت گذر جاتا ہے تو بہت بعد میں پتہ چلتا ہے کہ کوئی خوب ہی مر رہا تھا۔ لیکن ٹھکانے سے وہ بھی نہیں مرسکتا۔ کیونکہ وقت گذرتا جاتا ہے) پی چُو دریچے میں پیر لٹکائے بیٹھا سگریٹ کے دھوئیں کے لچھے بنا رہا تھا، دھوئیں میں سے اسے دیکھتا رہا۔ یہ چھوٹے چھوٹے سفید پھندوں والی عورت اس کے سامنے، اس کے اتنے قریب لیٹی ہوئی تھی اور دریچے کی زرد گلاب کی بیل پر سے پانی بہہ بہہ کر نیچے گر رہا تھا۔ پھر وہ وہاں سے اُٹھ کر باہر بارش میں چلا گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔ پھر وہ اُٹھ کر دریچے میں جا کھڑی ہوئی۔ اور اُسے پھواروں میں بھیگتے ہوئے دور جاتا۔ دھندلکے میں اوجھل ہوتا دیکھتی رہی۔ اس نے دوسرا سگریٹ جلایا۔ یہ سب وقتی جذبے ہیں (اس نے سوچا) لمحات کا اثر۔ اور جسموں کی کشش کی پیدا ہوئی امپلسز۔ ان وقتی جذبات کے زیر اثر ہم کیا کیا سوچتے ہیں۔ کیا کیا چاہتے ہیں لیکن وقت گذر جاتا ہے۔ اور ہم تبدیل ہو جاتے ہیں۔ وقت بہت غلط موقعوں پر آگے

بھاگ جاتی ہے ہم اسے واپس نہیں لا پاتے۔ کتنی ہنسی کی بات ہے۔

باغ کی روش پر سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کی پیاری دوست رخشندہ عرفان علی برآمدے میں آکر حسب عادت اس کے صوفے کے قریب ٹھنڈے فرش پر دیوار کے سہارے بیٹھ گئی اور نٹینگ سنبھال کر زرینہ کا کلوک بننے میں مشغول ہوگئی۔

"ہلو رونی ڈارلنگ"۔ اس نے کہا۔

"ہلو کرسٹی ڈارلنگ"۔ رخشندہ نے جواب دیا۔

"کتنا پیارا موسم ہے"

"ہاں۔ بے حد پیارا موسم ہے"۔

"کل کا ہمارا پروگرام کتنا اچھا رہا۔ آج شام کو چاند باغ کی فیٹ میں چلیں گے"۔ کرسٹابل نے کہا۔

"بہت اچھا رہا۔ ضرور چلیں گے"۔ رخشندہ نے اس کے خیال سے اتفاق ظاہر کیا۔

زرد گلاب کی بیل پر سے پانی بہہ بہہ کر نیچے گرتا رہا۔

دفعتاً کرسٹابل دریچے سے ہٹ کر رخشندہ کے قریب آگئی۔

"جانتی ہو ابھی پی چو نے مجھ سے کتنے مزے کی بات کہی ——— ؟" اس نے جھک کر پوچھا۔

"نہیں جانتی۔ تم بتاؤ۔"

اس نے کہا حفیظ احمد سے علیحدگی حاصل کر کے مجھ سے شادی کر لو"۔

بارش یکسانیت سے درختوں پر برستی رہی۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے؟" رخشندہ نے خانے گن کر سلائی تبدیل کی۔

"میں نے —— اوہ —— میں حفیظ سے علیحدگی تو حاصل کر رہی ہوں۔ لیکن میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ میں گھر واپس جا رہی ہوں۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔"

رخشندہ خاموش رہی۔

"رخشندہ تم میری دوست ہو نا؟" اس نے تھوڑی دیر بعد آنکھیں اٹھا کر دفعتاً سوال کیا۔

"ہاں"۔ رخشندہ نے آہستہ سے جواب دیا

وہ یکایک اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنے خوبصورت سرخ بال پیچھے کو سمیٹے اور صوفے پر جھک گئی۔ وقت کی بات —— یہ وقت کی بات —— جو لمحے گذرتے جاتے ہیں، وہ واپس نہیں آپاتے۔ وہ اپنے گذرنے کا بڑا شدید تکلیف دہ احساس چھوڑتے جاتے ہیں تم وقت کی حماقت کو پہچانتی ہو۔؟

مینہ برستا رہا۔ رخشندہ زرینہ کا کلوک مکمل کرنے میں مشغول رہی۔

"روشی ڈارلنگ"۔ کچھ دیر بعد کرسٹابل نے انگڑائی لے کر صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہوں ——" رخشندہ چپ چاپ دیوار کے سہارے بیٹھی سامنے کی طرف دیکھتی رہی جہاں درخت خاموش کھڑے تھے۔ فضا کا سکوت ناقابل برداشت تھا۔

"ارے ——" کرسٹابل نے دفعتاً اسے غور سے دیکھ کر پوچھا۔ کیا تم بھی موڈ بن

گئیں؟ یہاں سب موربڈ بن گئے ہیں۔ یہ سب اتنی اکتا دینے والی باتیں ہیں" اُس نے کہا۔

(چپ رہو کرسٹابل، الفاظ — الفاظ — الفاظ۔ موربڈ، اور فرار اور شکست — خالی، بے معنی الفاظ جس طرح کی موڈ ہوئی اسی طرح کا ریکارڈ گراموفون پر لگا کر بیٹھ گئے۔ ان کے ہوتے نہ ہونے سے کسی چیز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ سب اتنی بکواس ہے۔ یہ سب کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہوائیں سنسناتی رہیں چلو ڈارلنگ چاند باغ فیٹ میں چلیں۔ برستی بارش میں سے، دور سے کرسٹابل کی آواز آئی۔)

رخشندہ نیٹنگ سنبھال کر فرش پر سے اٹھی۔ وہ لالہ رُخ کے پھاٹک میں سے نکل کر بھیگی ہوئی شاہ نجف روڈ پر آگئیں۔

پھر شام پڑے تک وہ کالج کی پرانی لڑکیوں کے سالانہ میلے میں انتہائی انہماک اور تندہی سے اِدھر اُدھر کام کرتی پھریں۔ انہوں نے ہر سال کی طرح اسٹالوں پر سامان بیچا۔ لاؤڈ اسپیکرز پر نئے نئے ریکارڈ بجائے تماشائیوں کو ہوائی جہاز کی جوائے رائیڈ کے لیے لے گئیں۔ وہاں پر سب لوگ تھے۔ جالینوس تھا۔ گلیم محبانے تھا۔ پی چو تھا۔ وہ سب حسب معمول خوب تفریح کر رہے تھے۔ پھر ہمیشہ کی طرح یہ شام بھی ختم ہوئی کرائیسٹ چرچ کا باغ رفتہ رفتہ خالی ہوتا گیا۔ اپنے کام ختم کر کے وہ کار کے انتظار میں پھاٹک کے باہر سڑک کے کنارے گھاس پر آ بیٹھیں انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ جگہ جہاں کچھ دیر قبل دنیا بھر کی رنگینیاں اور چہل پہل سمٹ آئی تھی اب بالکل سنسان پڑی تھی۔ آسمان پر سے بادل چھٹ گئے تھے اور چاند کی کرنیں فضا میں دھیرے دھیرے جھلملا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پھاٹک میں سے رنجنا سدھانتا کی کار نکلی۔

"ہلو پیاری بچو ـــــ ہمارا اس سال کا فیٹ کتنا کامیاب رہا۔" اس نے کار میں سے پکارا۔ "کل تم سب یاد سے حساب کتاب کرنے کے لئے میٹنگ میں آنا۔ پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ اگلے مہینے وہ کولمبیا یونیورسٹی جانیوالی تھی اور بے حد خوش تھی۔ چند لمحوں تک اس کی کار کی پچھلی سرخ روشنیاں اندھیرے میں نظر آتے رہنے کے بعد ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ ہوا ساکت رہی۔

وہ چپ چاپ بیٹھی کار کا انتظار کرتی رہیں جسے حفیظ احمد اب تک واپس نہیں لایا تھا۔ رخشندہ گھاس میں چھپے ہوئے ایک سنگِ میل پر بیٹھی رہی۔ گنی الی کے نیچے کھڑے ہوئے ایک خالی سڑک کے فٹ بورڈ پر بیٹھی تھی۔ کرسٹابل اپنی بچی سے ان کھلونوں کے متعلق باتیں کرتی رہی جو اس نے اس شام فیٹ سے خریدے تھے۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گئی۔ کل کیا ہوگا۔ اگلے سال اس وقت کیا ہوگا ہم سب کہاں ہونگے۔ کیا کر رہے ہونگے۔ آنے والے وقت کی رفتار ہمارے لئے اپنے ساتھ کیا لائے گی۔ کوئی کچھ نہیں جانتا۔ کوئی کچھ نہیں جانتا۔

پھر دفعتہً گنی نے آہستہ آہستہ کہا۔ "تم لوگ جانتی ہو۔ میری شادی ہونے والی ہے۔ آج مجھے اپنے ہونے والے میاں کی تصویر دکھائی گئی جو بے حد موٹا ہے اور اس کی طوطے کی ایسی ناک ہے اور عینک لگاتا ہے۔ اور مال بار ہل پر رہتا ہے اور ولنگڈن کلب کا ممبر ہے۔" اس کی آواز بہت دور سے آ رہی تھی۔ اس میں صدیوں کی ویرانی، شکست اور تنہائی تھی۔

وہ خاموشی سے اپنے سامنے دھندلکے میں دیکھتی رہیں۔ جہاں کبھی کوئی موٹر ایک لمحے کے لئے اپنی روشنی بکھیرتی گذر جاتی تھی۔ آسمان اب شفاف ا[illegible]

نقرئی ہوگیا تھا۔

کرسٹابل گھاس پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ اور ایک تنکا توڑ کر گلہری کی طرح کترنے لگی "تم مجھے سمجھتی ہو؟" اُس نے آہستہ آہستہ رخشندہ سے پوچھا۔

"ہاں"۔ رخشندہ نے آہستہ سے کہا "میں تمہیں سمجھتی ہوں"۔ رات کا سناٹا وسیع ہوگیا۔ ہوائیں روتی رہیں۔ سڑک کے دوسری طرف لوریٹو کی خانقاہ کی خوبصورت سرخ عمارتوں کے نقوش بارش کے بعد کی دھلی دھلائی نکھری چاندنی میں رفتہ رفتہ واضح ہوتے جا رہے تھے۔

کوئی نتیجہ نہیں۔ کوئی نتیجہ نہیں۔ کنور صاحب نے پیچوان کی نے رکھ دی۔ نیچے باغ میں دوپہر کا سناٹا طاری تھا۔ لالہ اقبال نرائن امرودوں کے جھرمٹ میں چھپے ہوئے گسٹ ہاؤس کی صفائی میں مشغول تھے۔ شاید سلیمان قدر پھر آنیوالے ہیں۔ راجہ صاحب پیرپور کی لڑکی کی شادی ولیعہد رامپور سے ہو رہی ہے۔ راجہ صاحب ناناپارہ نے مسوری میں کوٹھی خرید لی ہے دی اِلڈ فلاور ہال کا فرنیچر رخشندہ مصر ہے کہ اس سال بدلوا دیا جائے۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو کھائے جا رہے ہیں۔ لکھیم پور کھیری کے جنگلوں کی لکڑی کا نرخ گر گیا ہے۔ دنیا کے واقعات گویا اس وقت اس اسٹیج پر تھے۔ کنور صاحب نے جمائی لے کر دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ کاش ہیلٹ ابھی نہ گیا ہوتا۔ انہوں نے سوچا۔ کاش وائیلی اتنا خوشامد خورا اور سی۔ پی ہارڈی اتنا نیدرسول سے بھی زیادہ بدمعاش نہ ہوتا۔ موڈی سندھ چلا گیا۔ لوئیس لائیڈ اور مارش اسمتھ ولایت گئے۔ کوئی شریف آدمی باقی نہیں۔ اس

دنیا میں زندہ رہنے کی گنجائش اتنی کم ہے۔ کاش کم ازکم رخشندہ اس قلاپخ بنگالی
نواب کے لڑکے سے ہی شادی کر لیتی۔ کچھ نہیں۔ ان سب باتوں کا کوئی نتیجہ نہیں۔
کنور صاحب اوپر کی منزل میں اپنے کمرے میں بیٹھے نیچے باغ کی طرف دیکھتے رہے
وہاں پر درختوں کے پتے ساکت تھے اور روشیں سنسان پڑی تھیں۔ انہوں نے
بہت دنوں سے پی چو کے کمرے سے بلند ہوتے قہقہوں کی آوازیں نہیں سنی تھیں
ان کے کھلنڈرے بچوں کی نت نئی پارٹیوں اور پکنکوں کی تعداد بھی بہت کم
ہوگئی تھی۔ وہ الوکھا، خوبصورت، مغرور اور خود پسند شخص سلیم بھی اب ہر اتوار کو وہاں
نہ آتا تھا۔ انہیں وہ شخص بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ اسی نودولتے متوسط طبقے کا ایک
نمائندہ تھا جس سے وہ انتہی نفرت کرتے تھے۔ وہ کسی تعلقدار یا زمیندار خاندان
کا لڑکا نہ تھا۔ اُس کے دادا یا پردادا کے پاس شاہی کے وقتوں کے یا انگریزوں
کے دئے ہوئے خطابات نہ تھے۔ یعنی وہ اس طبقے کا فرد تھا۔ جو اپنے پیشوں سے روزی
کماتا ہے۔ چاروں طرف چھائے ہوئے ان نودولتے لوگوں کی دنیا کا ایک فرد تھا جو
جو اپنی تدبیروں یا قسمت کے زور سے پرانے خاندانوں سے ٹکر لینے کی جرأت کرتے
ہیں سلیم کے خیال پر انہیں امیر پور راج کا۔ انور اعظم یاد آیا (صبح لالہ اقبال نرائن
نے اُن سے کہا تھا کہ روشنی بیٹا انور میاں کے ہاں کا پیغام منظور کر لینے کے لئے
تیار رہیں) انور اعظم بہت اچھا نیک، شریف، صالح لڑکا تھا۔ وہ اور سلیم دو بالکل
مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ انور اعظم پرانی دنیا کے سفیروں کے آخری
نمائندوں میں سے تھا۔ وہ اب تک ان بندھنوں کا پابند تھا اور پابند رہنا چاہتا
جنہیں روایات اور وضعداری اور کلچر کہا جاتا ہے۔ وہ رخشندہ کی اپنی دنیا

کاایک فرد تھا اسی ماحول اور اسی فضا کا پروردہ تھا جو جہانگیر آباد پیلس اور ٹیلر پیلس
اور ناپارہ ہاؤس سے لیکر عفران منزل اور رامپور ہاؤس تک میں ابھی موجود تھی
جو قیصر باغ کے چھوٹے سے دائرے میں ابھی زندہ تھی۔ جو رودولی اور سنڈیلے
اور ملیح آباد اور رمانا کھیڑ میں اب تک سسک رہی تھی دا اور سلیم ان رنگ محلوں
کی طرف سے بالکل بے پرواہ اور بے تعلق تھا وہ ان کی دم توڑتی ہوئی جگمگاہٹ
سے بالکل متاثر نہ تھا، اور اس لحاظ سے کوئی زینت ریاض کوئی شہلا رحمٰن کوئی
حمیدہ تنویر اس سے کہیں زیادہ قریب تھی۔ کیونکہ وہ اسی کی دنیا کی رہنے والی تھی
اُسے یہ دیکھ کر ہنسی آتی تھی کہ یہ لڑکیاں غیر شعوری طور پر ہمیشہ اس کوشش میں
مصروف رہتی تھیں کہ رخشندہ کی مکمل تقلید میں کامیاب ہوسکیں۔ اسی طرح جیسے
اس کے طبقے کے بہت سے نوجوان "ڈون انور" یا کنور پی چوپا را جکمار جے
کے اسٹائل کو اپنانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے تھے۔ اسے یہ بھی پتہ تھا
کہ کنور صاحب اُسے پسند نہیں کرتے۔ اور یہ بات اُسے اپنی جگہ بڑی مزیدار لگتی
تھی۔ یہ لوگ یقیناً بہت دلچسپ تھے۔ یہ کنور اور کنور رانی اور راجکمار کہلانے
والے لوگ جن کی سالانہ آمدنی کسی کانپور یا بمبئی کے تاجر کی ایک مہینے کی کمائی
سے بھی کم تھی۔ یہ لوگ جو شیشے کے ٹوٹے پھوٹے گھروں میں رہتے تھے اور مصر تھے
کہ انہیں شیش محلوں کا باسی سمجھا جائے) کنور صاحب پیچوان کے چند کش اور
لینے کے بعد تھک کر اپنی خوابگاہ میں چلے گئے تھوڑی دیر بعد انہیں نکلسن کے
رخصتی لنچ پر جانا تھا جو اگلے مہینے اپنے ساتھ کے کئی اور برطانوی افسروں کے
ساتھ ہوم کی طرف "کوچ" کر رہا تھا۔

ارے اِس اندھیرے کے اس پار کیا ہے۔ اس اندھیرے کے اس پار کیا ہے
مجھے ایک مشعل لادو تاکہ میں اندھیارے کی وادیوں میں قدم رکھ سکوں (برساتی کی
سیڑھیوں پر سے کرن نے دیکھا کہ اوپر کی منزل میں کنور صاحب نے اپنے کمرے
کا دریچہ بند کیا اور اندر چلے گئے) گلاب اس وقت سرخ ہیں۔ کل بھی سُرخ رہیں گے
پرسوں بھی۔ اگلے سال بھی۔ کوئلیں آم کے بُور پر چلاتی رہیں گی۔ لیکن یہ وقت گذر جائیگا
کیا میں گنتی کو   پر فریب بالکل جان دے رہا ہوں؟ (اس نے سوچا)
یہ ٹھنڈی، بھیگی ٹہنیاں، یہ نارنگی کے شگوفے، فوارے کا سرد پتھر، گلابی اطلس میں
نے ان سب چیزوں کو چھو کر دیکھا ہے۔ زندگی خوبصورت ہے لیکن امرت شیرگل
مرجاتی ہے مینیکا مرجاتی ہے۔ خدا مرجاتا ہے۔ ارے اگر تم مجھے کہیں سے ایک
مشعل لادو تو میں آگے جاکر دیکھوں کہ یہ موسیقی کہاں سے پیدا ہو رہی ہے۔ اگر یہ
موسیقی جاری رہی تو خدا زندہ رہیگا۔ آفاق مجھ میں کھو سکیں گے عیسٰی کی موت کی
تکلیف آسان ہو جائے گی میں اِس سمے یہاں کیوں بیٹھا ہوں۔ اس لئے کہ میری
سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس وقت اور کیا کیا جائے میں نیشنل ہیرلڈ میں کیوں کام کرتا
ہوں۔ اس لئے کہ ایک روز چپلا پنی راؤ کی جگہ پا جاؤں اور گنتی کول یا شکنتلا
پنڈت یا ومّلا نہرو سے شادی کر کے اسے مسوری لے جا سکوں۔ (وہ آہستہ آہستہ
باغ کی روش پر چلتا رہا) کرن کا بچو۔؟ کرن کا بچو تو بے حد خوش قسمت لڑکا ہے
اسمبلی کا وہ سب سے کم عمر ممبر ہوگا۔ سلطان شہر یار کا وہ سکریٹری رہ چکا ہے۔
ہندوستان سے باہر بھی دنیائے صحافت میں اس نے دھوم مچا رکھی ہے۔ نہرو جی
بہت ممکن ہے اسے کسی سفارت خانے کے ساتھ باہر بھیج دیں۔ لوگ ایک

دوسرے سے کہتے تھے) وہ باغ کی روش پر ٹہلتا رہا۔

سب ختم ہو گیا۔ سب ختم ہو گیا۔ سب الوژن ٹوٹ پھوٹ کر نیچے گر پڑے ۔ یوکلپٹس کے تاریک جھنڈ میں گیلی مٹی اور گرتے پتوں کی خوشبو ایک دوسرے میں مل جل کر ہوا میں پھیل رہی تھی ۔ سُرخ پھولوں کے ڈھیر میں چھپا ہوا فوارہ آہستہ آہستہ اپنا پانی اوپر کی طرف پھینک رہا تھا ۔ دوپہر کے سناٹے کی لہروں میں وہ اکیلا پائن کا درخت چپ چاپ کھڑا تھا (اس پائن کے نیچے گرمیوں کی بھری دوپہروں میں انھوں نے اتنی مرتبہ گھاس پر لیٹ کر کتابیں پڑھیں تھیں) اس ازلی سناٹے میں وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر آہستہ سے ہنسے اور ان کی ہنسی کی آواز ایک دوسرے میں مل کر فضائے بیکراں میں کھو گئی (وہ اپنے رلیسٹ ہاؤس میں بیٹھا آئی۔ جی کے معائنے کی رپورٹ دیکھ رہا تھا) ہوا میں گاتی ، گنگناتی غنودگی پھیل گئی ۔ سب ختم ہو گیا ۔ یہاں پر پوستے کے پھول اگا دو ۔ صرف پوستے کے پھول مجھے مولسری کی کلیاں نہیں چاہئیں ۔ مجھے نارنگی کے شگوفے نہیں چاہئیں ۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے (رخشندہ نے دیکھا کہ کرن باغ کی روش پر چلتا اس کی طرف آرہا ہے وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی) کرن بھی مجھ سے ہمدردی چاہتا ہے (اس نے سوچا) ساری دنیا مجھ سے ہمدردی چاہتی ہے ۔ مجھ سے ہمدردی کوئی نہیں کرتا ۔ الفاظ ، الفاظ اپنی زبانوں کو ، اپنے دماغوں کو ہمیشہ کے لئے چھٹی دید و بھائی ۔ کوئی نہ کسی سے بات کرے ۔ نہ بحث کرے ۔ نہ ہنسے نہ گائے ۔ نہ دماغ کچھ سوچے ۔ سب ملکر مر جاؤ ۔ (پولو نے اپنے غسلخانے میں زور زور سے " او مائی ڈارلنگ کلمنٹائن " الاپنا شروع

کر دیا) تم نے دیکھا۔ یہ کیا ہوا؟ یہ ایک بہت لمبی سڑک تھی۔ کہرے میں چھپی ہوئی،
جس کے کنارے کنارے ہرے خود رو پودے چھوٹی چھوٹی جھیلوں پر جھکے ہوئے
تھے اور ان میں اندھیرے میں جگنو جھلملاتے تھے۔ اس سڑک پر وہ چلتے رہے۔ وہ
تھک چکے تھے لیکن خدا اور اس کے خوبصورت فرشتوں کی مرضی یہی تھی کہ وہ اسی طرح
چلتے رہیں، وہ تھک چکے تھے ——————————

—————— لیکن وہ اس راستے کو طے کرتے رہے (انہوں نے کبھی اس کی
خواہش نہیں کی کہ وقت انہیں مشعلیں دکھائے) بہت دور جانے کے بعد انہوں نے
اپنا زادِ راہ سڑک کے کنارے رکھ دیا اور آگے چلے گئے (چونکہ کوئی اور اس راستے
پر سے نہ گزریگا۔ اس لئے وہ بوجھ کنار راہ پر ایک غیر اہم سنگ میل بن کر رہ جائیگا۔
اور یہ بہت ہی ٹھیک ہوگا۔ اس کے علاوہ تم اور کیا چاہ سکتے تھے بھائی) ہاں اور اب
مجھے اپنے باغ میں پوستے کے پھول اگانے پڑیں گے۔ زندگی کا حسن زندگی کی پاکیزگی
کہیں سے آکر اس کے چاروں طرف پھیل گئی (غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے
مرنے کی —————————— خلا میں الوہی روشنی
کا دھواں سا تیر رہا ہے۔ ہم سب کو چل کر کرکٹ کھیلنا چاہیے۔ کرکٹ زندگی کی سب سے
بڑی حقیقت ہے) ہاں۔ اس دنیا کو خوبصورتی بخشتے ہوئے نیلے پہاڑ، گہری، نیلی
گھاٹیاں، جن کی گہرائی میں کہرہ دھوئیں کی طرح منڈلاتا ہے اور ہر لحظہ اوپر کو اٹھتا
جاتا ہے۔ یہ وحشتناک، لرزہ خیز خوبصورتی، پُرتکلیف دہ سکوت۔ یہ کوس موس۔ یہ
بجنے کیا۔ (جب وہ سب ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے اونچی چوٹیوں
پر پہنچ جاتے اور اپنے سامنے برفیلے ہمالیہ کے پیچھے سے آفتاب طلوع ہوتا دیکھتے

اور انکے قدموں میں یہ دنیا، خدائے قدوس کی یہ عظیم الشان پیاری خوبصورت دنیا پھیلی ہوتی، نیچے وادیوں میں نیلا کہرہ سمٹ آتا۔ پائن کے درخت جھومتے رہتے جھرنے اپنی مترنم، متوازن، پرسکون آواز میں شور کرتے ہوئے گایا کرتے) ہاں خلا میں الوہی روشنی کا دھواں تیر رہا ہے۔ خدا مرچکا ہے میں اب تک زندہ ہوں (کرکٹ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے، تم نے دیکھا یہ کیا ہوا۔ دھندلکے میں بہت سے مرمریں خوبصورت مجسمے نیچے گر پڑے اور ٹوٹ گئے۔ زندگی کا حسن ختم ہوگیا۔ اس خوبصورت زمین پر ان نیلے پہاڑوں اور نارنگی کے شگوفوں والی دنیا میں خدائے قدوس کی بہت ساری بادشاہتیں بنتی اور بگڑتی آئی ہیں۔ وقت ارجن کے خدا کی طرح اپنے شاہکاروں کو خود تباہ کر دیتا ہے مگر وقت ابدیت سے علیحدہ صرف مستقبل پر بھروسہ رکھتا ہے اور مستقبل میں اگر ہر چیز ایسی بن جائے جس کی ہمیں اتنی تمنا ہے۔ تو پھر کوئی بات ایسی ہوگی، کوئی وجہ ایسی نکل آئے گی جس سے انسانیت کی ساری کوششیں بیکار جائیں گی۔ تم فسادوں کی وجہ پر یہ کتاب کیوں لکھ رہے ہو۔ کرن بھائی، تم بمبئی کیوں جا رہے ہو) دنیا کبھی بھی اس حالت پر پہنچ سکتی جہاں جاکر ہمیں نروان اور مکتی کی خواہش نہ رہے۔ یہ قنوطیت نہیں ہے کرن بھائی حقیقت پسندی ہے (کرکٹ بھی قنوطیت نہیں ہے حقیقت پسندی ہے) تم مجھے جانتے ہو کرن بھائی؟ یہ میں ہوں، یعنی محض میں، جو کچھ نہیں ہوں۔ تم جو کچھ نہیں ہوں۔ تم جو کچھ نہیں ہو۔ ہم نے اکٹھے مل کر نیلے پہاڑوں پر صبح کاذب کی خوبصورتی دیکھی ہے ہم نے ایک ساتھ تاریک جنگلوں اور ہری پگڈنڈیوں کو طے کیا ہے۔ ہم اور تم ان کنجوں میں گھومے ہیں۔ جہاں کوئلیں سندھیا کے نغمے گاتی ہیں۔ تم اب کہاں

پہنچے ہو۔ تم اب کیا سوچ رہے ہو۔ تم وقت کو اپنے میں کھونا چاہتے ہو۔ ہم وقت سے الگ ہیں۔ ہم وقت سے آگے نکل آئے ہیں۔ کیا تمہاری آتما کا پرہما اب تک شانت نہیں ہوا ہم تو اس بڑی خوبصورت کائنات میں جاگرت پھیلانے آئے تھے۔ یہ بڑی خوبصورت دنیا ہے۔ یہ نسل انسانی بڑی معصوم، بڑی نیک سرشت، بڑی اعلیٰ و ارفع ہے۔ یہ سب بہت اچھے انسان ہیں۔ تم انہیں جانتے ہو۔ میں انہیں جانتی ہوں۔ میں جنم جنم سے تم سب کو پہچانتی آئی ہوں۔ میں جو زندگی کی ازلی ترشنا ہوں (ہاں) یہ سب بہت اچھے انسان ہیں۔ تم نے انور اعظم کو دیکھا ہے۔ وہ جو بے حد سعادت مند، نیک سرشت انسان ہے۔ اپنی ریاست کے غریبوں کی ہمدردی میں مرا جاتا ہے۔ شراب بالکل نہیں پیتا۔ ریس کورس کبھی نہیں جاتا۔ یہ بڑے قابلِ تحسین اوصاف ہیں۔ اچھے پالتو کتے اور بلیوں کے بھی یہی اوصاف ہوتے ہیں یہ نسل انسانی اتنی پاکیزہ ایسی بلند اتنی ذمہ دار ہے کہ قوم کے بہادر اپنے ملک پر جان دے رہے ہیں۔ اور فسادوں کے دنوں میں مسلمان ہندوؤں کو پناہ دے رہے ہیں اور غریب ہمدردی اور انسانیت کے معاملے میں سرمایہ داروں سے بہتر اور بلند ہیں۔ یہ سب انسانیت کے اعلیٰ اوصاف کتوں بلیوں اور بھیڑوں میں بھی موجود ہوتے ہیں۔ کیا تم اب بھی اس دنیا اور ان انسانوں کے لئے آنسو بہاؤ گے، تم وقت کے چکر میں ماضی اور مستقبل کے لئے فلسفے کا سہارا لے سکتے ہو بھائی۔ حال سے الجھنے کے لئے تمہارا فلسفہ بالکل بیکار ہے۔ تمہاری پرم آتما جو شانتی چاہتی ہے۔ اس کے لئے یہاں سے آگے چلو کرن بھائی۔ وقت صرف ایک دقعہ ہے۔ وقت کا پہریدار اپنے تباہ شدہ شاہکاروں کے ویرانے میں سے گذرنے والے کارو انوں کو آگے بڑھا دیگا۔ پیچھے صرف ٹوٹے

ہوئے سنگِ میل اور تنہائی کی دیواریں رہ جائیں گی۔ صرف تنہائی کی دیواریں۔ تمہاری آتما کا بر ہما کیا محض گہنے کول یا شکنتلا سپرو یا دِ ملا نہرو کے کانوں میں جھومتے اٹھرو دیکھ کر شانت ہو پائے گا ـــــ ارے یہ سب غلط ہے۔ سب ختم ہو چکا ہے۔ سب ختم ہو چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یوکلپٹس کے تاریک جھنڈ میں سُرخ پھُول گر رہے ہیں اور فوّارے کا ٹھنڈا پانی آسمان کی طرف ابلتا جا رہا ہے۔ مجھے محض پوستے کے پھُول اپنے چاروں طرف اگانے دو محض پوستے کے پھُول۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ کچھ نہیں چاہئے۔ مجسمے گر کر ٹوٹ جائیں گے۔ سینٹ میری کا خدا مر رہا ہے۔ اس کی موت کی تکلیف آسان نہ ہو گی۔ ہوا میں نارنگی کی کلیوں کی مہک تیز ہو رہی تھی۔ یوکلپٹس کا جھنڈ زیادہ تاریک ہو گیا دکرن بھیّا۔ روشی ڈارلنگ تم سب کہاں ہو۔ جلدی آؤ دیکھو گلیمبر لوائے آیا ہے۔ باغ کے سنسان روشوں پر سے آتی ہوئی ڈائمنڈ کی آواز قریب تر ہوتی گئی)

"شکر کہ آپ سوپرمین نہیں۔ ڈائمنڈ کے سوپر مین"۔ کرسٹابل نے گھاس میں سے ایک پھُول توڑ کر بے خیالی سے اپنے بالوں میں کسی طرف کو ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ڈائمنڈ کا سُپرمین؟" انور اعظم نے پوچھا۔

"ہُم ـــــ آپ ڈائمنڈ کو جانتے ہیں۔ وہ ہے تو نسلاً خالص ہندوستانی لیکن وہ سوچتی امریکن طریقے سے ہے۔ بات ہالی وڈ کے لہجے میں کرتی ہے خالص نسکا گو ـــ اسٹائل میں 'نو سِسٹر' کہہ کر جواب دیتی ہے۔ کلاس کو کلیس اور

گبرل کو گیل کہتی ہے۔ اس کے والدین سیدن پور ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں لیکن اس کا روحانی وطن مَین ہٹین ہے۔ اس نے دفع الوقتی کے خیال سے ایک سُوپرمَین کا پیکر تراش رکھا ہے۔ ہالی وڈ کے سارے مشہور اداکاروں کے حسن کے مرکب میں اپنی طرف سے پچاس فیصدی کرن اور پی چو کی ذہانت شامل کر کے اس نے یہ پیکر تیار کیا ہے۔ اور اسے روز اس کی طرف سے مایوسیاں اٹھانی پڑتی ہیں میں نے کہا ناشکر کہ آپ سوپرمین نہیں" کرسٹابل نے کہا۔ وہ دونوں باغ کی سنسان روشوں پر سے گذرتے یوکلپٹس کے درختوں کی طرف آ گئے۔ جہاں سے نرشندہ کے کمرے کا دریچہ نظر آ رہا تھا۔

"پچھلے دنوں یہاں ایک سُوپرمین آیا تھا۔ اس نے بڑی گڑبڑ مچائی"۔ روش پر چلتے چلتے کرسٹابل نے جھک کر ایک پتّہ توڑتے ہوئے کہا

وہ گھاس پر آ بیٹھے "پی چو، کرن، روشی، سب لوگ باغ میں آ ؤ، گلیمر بوائے آ گیا جالینوس بھی آ گیا"۔ ڈائمنڈ پھر چلائی "جلدی آؤ۔ ہم پی چو کی رخصتی دعوت کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

وہ سب سن شیڈز کے نیچے جمع ہو گئے۔ سلیم نے دیکھا کہ امیر پور راج کا انور اعظم وہاں موجود تھا۔ اور بچوں کی سی خوشی اور اطمینان کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر رہی تھی اور وہ سب ہمیشہ کی طرح قہقہہ لگا رہے تھے۔ اور انور اعظم نے سلیم کو دیکھا اور گھاس پر بیٹھا اسی اپنے دلکش گلیمر بوائے والے انداز میں سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے بناتا رہا گویا اس میں کیا بات ہے سُلیمان۔ تم آیدئی کورٹ جاتے ہو میں یہاں آ جاتا ہوں حساب بالکل برابر ہے)

"سوچو۔ ہمارے سوئیٹ، گڈوپی چو کا نیا دلہ ایک دم سے اتنی دور کا ہوگیا اور کرن بھی بمبئی جا رہا ہے۔ ہاؤ اُوفل۔" ڈائمنڈ انور اعظم سے کہہ رہی تھی اس اتوار کو ہم سب گاؤں جائیں گے۔ حفیظ نے ہم سب کو پکنک پر مدعو کیا ہے۔ تم بھی چلنا گلیمر لویائے" وہ سب دیر تک وہاں بیٹھے ہمیشہ کی طرح اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ یوکلپٹس کے سائے طویل ہونے شروع ہوگئے۔

"روشی کہاں گئی؟" دفعتاً دمل نے پوچھا سب نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ باغ کی روشیں اور مولسری کے جھرمٹ خاموش پڑے تھے (اور سلیم نے لائٹر سے کرسٹابل کا سگریٹ جلاتے ہوئے دیکھا کہ اسے باغ میں داخل ہوتا دیکھتے ہی رخشندہ دریچے میں سے اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ وہ یک لخت وہاں سے اُٹھا۔ اور سب کو جلدی سے خدا حافظ کہہ کر پھاٹک پر کھڑی ہوئی اپنی کمانڈو تک گیا اور اُسے اسٹارٹ کر کے سایہ دار راستے پر آگے روانہ ہوگیا۔ یوکلپٹس کے جھنڈ پر تاریکی پھیل گئی" روشی کہاں ہے، اسے بلاؤ۔ اس کے بغیر ہم کوئی پروگرام نہیں بنا سکتے۔ اس کے بنا ہم گھاس پر بیٹھ کر پچھلی کے تشکار کی باتیں نہیں کر سکتے۔ روشی رخشندہ ڈارلنگ" وہ سب چلائے۔

(مائی۔ مائی۔ وہاں جالینوس بیٹھا تھا اور اس لئے روشی اٹھ کر اندر چلی گئی۔ روشی کیا تم اس سے اتنی رنجیدہ ہو۔ تم ہی تو کہا کرتی تھیں روشی ڈارلنگ کہ اچھے انسان محض پالتو کتے بلیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ڈائمنڈ نے آہستہ سے کہا۔ باغ پر شام کا اندھیرا جھک گیا۔)

"بٹیا کہاں ہیں۔ ان سے کہو دونوں وقت ملتے ہیں۔ اندھیرے کمرے میں کیوں

بیٹھی ہیں" (کنور رانی نے مغرب کی نماز کے بعد تخت پر سے اترتے ہوئے شعلہ پری کو آواز دی) جانے لالہ باغ والے بنگلے کی صفائی سے نپٹ چکے یا نہیں (انہوں نے سوچا، لیکن یہ لڑکی تو باؤلی ہے۔ ہر وقت بی چو۔ ہر وقت کرن (ارے کنور صاحب ابھی چھتر منزل سے واپس نہیں آئے انہوں نے پھر عباسی خانم کو پکارا) یہ کیا گڑبڑ ہے جہانگیر قدر اپنے باوا سے بھی زیادہ خوش شکل نکلا ہے۔ اسی سے کر دے لیکن نہیں۔ وہ تو باؤلی ہے۔ چودھری شمیم کہتے تھے۔ بٹیا سنا ہے بمبئی جارہی ہیں۔ واہ بھئی (چودھری شمیم بھی اچھی شکل کا ہے۔ اگر اتنا لفنگا نہ ہوتا۔ یہ کمبخت سندیلے والے سب خوبصورت ہوتے ہیں بس تیس کے آگے نکل کر موٹاپے پر سوار ہو جاتے ہیں۔ چودھری شمیم بہت خوبصورت ہے۔ کہتا تھا روشی بٹیا بمبئی جارہی ہیں۔ وہ تخت پر سے اتر کر اپنے فرشی پائجامے کے پائنچے سنبھال کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ عفران منزل کا پچھلا طویل دالان سنسان پڑا رہا)

"بٹیا کو ابھی رانی صاحب پوچھت رہیں"۔ گل شبو نے شعلہ پری سے کہا۔ وہ دونوں دالان کی پرانی سیڑھیاں اتر کر نہر کی منڈیر پر آبیٹھیں۔ "باجے والے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے"۔ الماس نے اوپر کی منزل کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بٹیا جب گسائے جات ہیں تب کھوب چر رچر ریڑا والا ہرمونیا بجاوت ہیں"۔

"کاہے خاطر بٹیا اتنا روت ہیں؟" گل شبو نے منڈیر پر کہنیاں ٹیک کر پانی میں کنکر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہم کا جانی ہو۔ بٹیا کا ننگ موڑ ہو یہ رات ہے۔ سب جنے ہڑ بڑائے کے آگے پیچھے دوڑے لاگت ہیں۔ ہم ہپنچ من ہی من مارا کھ ہو جائی تب ہو کو ڈونہ جھہین تہینے"

گیندانے آہستہ سے کہا۔

وہ سب نہر کی منڈیر پر اسی طرح بیٹھی رہیں۔ مولسری کی تاریک قطاروں میں ہوا سرسرا رہی تھی۔

"ارے دکھیا گری پہاڑ سے کود دکھ نالیں سکھیا کے گوڑ ما کانٹا چھبن سب ہائے ہائے رکین دنیا جھام جھوم بھوئی"۔ رینیا آہستہ آہستہ الاپنے لگی۔ اوپر کی منزل میں موسیقی کے کمرے کا دریچہ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے زور سے بند ہو گیا۔

"رات کو جو رکا مینہا آئیہے"۔ رینیا نے آسمان کی طرف دیکھ کر جمائی لیتے ہوئے کہا۔ سیاہ گھٹائیں درختوں پر بہت نیچے جھک آئیں اور ہوا تیزی سے سنسنانے لگی۔ (دنیا جھام جھوم بھوئی ——— ہواؤں نے ایک دوسرے سے سرگوشی میں کہا)

چنانچہ یہ یوں ہوا۔ کہ تم وہاں بیٹھے تھے۔ اور وہ تمہارے سامنے سے اٹھ کر چلی گئی اور اس نے دریچہ بند کر دیا۔ سمجھے بھائی جالینوس (اس نے سوچا) وہ وہاں سے چلی گئی۔ جبکہ یوکلپٹس کے بھیگے جھرمٹ میں سرخ پھول آہستہ آہستہ نم زمین پر گر رہے تھے اور فوارہ اپنی ٹھنڈی پھواریں چاند کی طرف پھینک رہا تھا۔ لیکن یہ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ اور سارا واقعہ صرف یہ ہے۔ یہ کہ وہ وہاں سے چلی گئی۔ تمہارے سامنے اس نے دریچہ بند کر لیا۔ جبکہ تم نے کہنا چاہا تھا کہ آؤ۔ آؤ ہم یہاں سے آگے چلیں۔ کہرے میں چھپے ہوئے ستاروں ان ساری خوبصورت احمق، بیکار چیزوں، ان خالی، بے معنی لفظوں کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے چلے چلیں۔ راستوں کے کنارے کنارے للی کے سفید پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ہم ان راستوں، ان پگڈنڈیوں پر سے

اکٹھے گذریں گے۔ ہم گاڑی کا انجن ایک ساتھ اتر کر ٹھیک کریں گے۔ ہم راستے کے چار خانوں کا بے مزہ قہوہ اکٹھے پئیں گے۔ تمہیں زندگی میں کل ہے کا انتظار ہے دن ابھی باقی ہے۔ محبت کے لئے زندگی کو بکھیرنے اور جمع کرنے کے لئے ان گنت نامکمل ارادوں کو بنانے اور ختم کرنے کے لئے، اس سے پہلے کہ ہم ان راستوں، ان ہواؤں ان انسانوں سے تھک جائیں۔ آؤ ہم نیلی خوبصورت پہاڑیوں میں چھپے ہوئے اس ہوٹل میں جا کر بارش سے پناہ لیں۔ جہاں ہم نے وہ کہر آلود، اکیلی شام اکٹھی گذاری تھی۔ تم کائنات کے اس سکون کو، اس باقاعدگی کو، اس جمود کو تتر بتر کر سکتی ہو۔ لیکن اس ٹھنڈی گھاس پر گلابی اطلس کے ان انباروں پر پھیلی ہوئی خوشبودار گرم، صندلی باہیں رات کے پچھلے پہر تک یونہی آرام کرتی رہیں گی۔ گیتی کول کی باہیں، ڈائمنڈ کی باہیں۔ تم ان آرام دہ گلابی روشنیوں کے آگے پھیلے ہوئے اندھیرے سایوں تک کبھی نہ جاؤ گی۔ کیا تم ان اکیلے انسانوں کو جانتی ہو جو غروب آفتاب کے وقت اپنی بالکنیوں پر جھکے نیچے نیلی اور خاموش سڑکوں کو چپ چاپ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ زندگی بار بار حاصل نہ ہو گی۔ یہ لمحات جن میں سرخ پھول باغ کی ٹھنڈی زمین پر گر رہے ہیں پھر واپس نہ آئیں گے۔ کیا تم وقت سے خوفزدہ نہیں۔ کیا تم ان پرانی یادوں سے خوفزدہ نہیں۔ ان سیاہ پوش راہبوں کی طرح کی یادوں سے جو یوکلپٹس کے سائیں سائیں کرتے درختوں کے درمیان اپنی خاموش اجاڑ خانقاہ کے باغ میں شام پڑے اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہیں۔ وہ اچھی کتابیں جو ہم نے گھاس پر لیٹ کر اکٹھی پڑھیں، وہ موسیقی جو ہم نے کشمیری چائے کی پیالیاں ختم کرتے ہوئے ایک ساتھ سنی، نیلی گھاٹیوں میں سے بلند ہوتا اوپر کو اٹھتا ہوا کہرہ جو ہم نے ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہو کر دیکھا، یہ زندگی

یہ ساری چیزیں، یہ انسان، یہ خدا کیا یہ سب کافی نہیں۔ نہیں بھائی جالینوس۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے دریچہ بند کیا اور وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ اکتا کر برآمدے میں آبیٹھا۔ بارش کا پانی فوسیٹ ہاؤس کی پھونس کی چھت پر برستا رہا۔ اور اسکے چاروں طرف گھرے ہوئے آم کے جھنڈ میں اندھیری رات کی ہوائیں سیٹیاں بجاتی رہیں۔ سرجو کی لہریں چھاؤنی کے انگریزی کلب کے کنارے کنارے باغ کے ٹیرس کی سیڑھیوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس نے برآمدے کا لیمپ روشن کر کے اپنی مسہری کی طرف جاتے ہوئے ایک کتاب اٹھالی اور نیند کا انتظار کرنے لگا۔ تاریک فضا میں بادلوں کی گرج تیز ہو گئی۔

"سنا تم نے۔ اوشیر لہری مر گیا۔" اس کا ایک دوست برآمدے کے سرے پر لیمپ کے قریب بیٹھا اس سے کہہ رہا تھا۔ "اوشیر لہری مر گیا۔ پرسوں رات میں فیرز کے ورائٹی شو کے بعد میں نے اسے کپورز کے ایک کونے میں خاموش بیٹھے دیکھا تھا۔ وہاں سے اٹھ کر وہ گھر گیا۔ اور آج شام دفعتاً وہ ختم ہو گیا۔ سنا تم نے۔ وہ جو زندگی کے حسن کی تخلیق کرتا تھا۔ اس کے برش، اس کے رنگ، اس کے کینوس، سب بے کسی سے اسکے چاروں طرف بکھرے رہ گئے اور وہ ختم ہو گیا۔" ہوائیں آم کے جھنڈ میں زور زور سے چیختی رہیں۔ لیمپ کی روشنی میں سیڑھیوں کے نیچے بارش کا پانی جھلملا رہا تھا۔ "اس نے "رقص حیات" کی تخلیق کی تھی۔ ہمالیہ کے خوبصورت جنگل میں اس نے اپنے آدرش کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ اور اس نے وہ لافانی شاہکار تیار کیا تھا جو اگر میرے پاس اتنا روپیہ ہوتا تو ہزاروں میں خرید لیتا۔ تم نے "رقص حیات" نہیں دیکھا؟" اس کا دوست پوچھ رہا تھا۔ نینی تال کی نمائش میں چند سال ہوئے وہ تصویر

رکھی گئی تھی۔ لیکن جب غفران منزل کے چھوٹے کنور کو معلوم ہوا کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی بہن کی تصویر نمائش میں رکھ دی گئی ہے۔ تو اُس نے غصّے سے نمائش گاہ کی گیلری کی دیوار پر سے اسے نوچ کر واٹلڈ نلاور ہال کے گودام میں پھینک دیا۔ وہ تصویر شاید اب بھی وہاں کسی الماری میں پڑی ہوگی۔ فضا میں ہوائیں گھوں گھوں کر کے چلّاتی رہیں۔ اس کا دوست کہہ رہا تھا۔ میں نے وہ تصویر دیکھی تھی۔ اس کا پینٹ جگہ جگہ سے جھڑ گیا تھا۔ اور لگتا تھا کہ اس کی آخری ری ٹچنگ جلدی میں کی گئی ہے۔ المورڑے کے کلچر سنٹر کے آس پاس بکھرے ہوئے جنگلوں کے پس منظر کے ساتھ اس میں کلاسیکل رقص کے ایک خوبصورت انداز میں جھکی ہوئی "حیات" کے پیچھے الوہی روشنی کا دھواں لہرا رہا تھا اور ہمالیہ کی برفیلی، اونچی، اکیلی چوٹیاں تھیں؛ اور سربلند درختوں کی پھیلی ہوئی شاخیں تھیں۔ یہ پاروتی تھی۔ پاروتی جو شاید اس طرح جھکی ہوئی اپنے وجود کی کشما چاہتی تھی۔ اور خدائے رقص سے زندگی کی دکشنا لے رہی تھی۔ پاروتی جو جنم جنم کی زندگیوں کا آدرش تھی۔ جو شیو سے جس نے سنسار بھر کے زہر کو اپنی پیشانی پر جگہ دی تھی۔ زندگی کی ترشنا کے لئے امرت چاہتی تھی۔ مہادیو کے اسی زہر کو اس نے اپنے رقص میں رچا لیا تھا۔ یہ زندگی کا زہر تھا۔ زندگی امرت کبھی نہیں ہوتی۔ تم سن رہے ہو یہاں امرتا شیر گل مر جاتی ہے مینکا مر جاتی ہے اوشیر لہری مر جاتا ہے

بارش تیز ہو گئی۔ سرجو کا پانی بہہ کر ریسٹ ہاؤس کے باغ تک آ گیا۔ مینہ اور ہوا کے ملے جلے شور میں اس کے دوست کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "سمجھے تم بھائی مسلیم — آج شام وہ ختم ہو گیا۔ اور مرنے سے پہلے بخار کی تپش میں وہ کہہ رہا تھا۔ ارے وہ تو میرا آدرش تھی۔ اور وہ کہہ رہے تھے۔ کپور تھلہ میں بیٹھے وہ سب کہہ رہے تھے

کہ وہ ایک جانے کس کے ساتھ تفریح کر رہی ہے۔ اسے اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر
زن سے نکل جاتی ہے۔ وہ بھی اور سب کی طرح ہے۔ وہ بھی اور سب کی طرح ہے
سنا تم نے۔ وہ اس بچارے اوشیرلہری کا آدرش تھی۔ وہ عام، خاکی، فانی، کمزور
عورت نہیں تھی جو دلکشا کلب یا مے فیئر میں نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ مرگیا۔ اس
گھور اندھیارے میں اس کی آتما اپنے بہت دور دراز کے سفر پر چلی گئی ـــ جانے
کیا کیا کہے جا رہا ہوں ـــ تم سو گئے ـــ؟"

فضا کی تاریکی بڑھ گئی۔ وہ کتاب کی ورق گردانی کرتے کرتے، اس پر سر رکھ
کر سو چکا تھا "جب تم جاؤ تو لیمپ بجھاتے جانا۔" دوست کی آواز سن کر اس نے
کہا۔ بارش کا شور زیادہ ہو گیا۔

ارے یہ رات تو بہت کالی ہے۔ بہت کالی۔ بھادوں کے مہینے کی کالی رات۔
اور ہوا بہت تیز ہے اور اس میں دور دراز کے باغوں اور سرجو اور گومتی کے کنارے
کنارے بکھرے ہوئے کنجوں کی مہک تیر رہی ہے۔ دریچوں کے پردے اڑے جاتے
ہیں۔ خالی، اندھیرے کمرے گہرے گہرے سانس لے رہے ہیں۔ باغ آہیں بھر
رہا ہے۔ ساری کائنات اکٹھی مل کر اندھیارے کے اس بھنور میں ڈولتی جا رہی ہے،
دھیرے دھیرے اس طوفان میں آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ اور آگے۔ اور آگے
دروازے بند ہو گئے۔ روشنیاں بجھ گئیں وہ جو کتاب پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔ ہوا
کے زور سے پلنگ کے کنارے پر سے برآمدے کے فرش پر گر گئی۔ اور اس کے
ورق ہوا میں پھٹپھٹاتے رہے لیکن ان کی آواز بہت مدھم تھی اور وہ بہت گہری

نیند سو رہا تھا ہوا کے آوارہ جھونکے تاریک، خاموش عمارتوں کے گرد چلاتے اور سرگوشیاں کرتے رہے۔ (ایک سکھ لڑکا ایل ایل بی کی کتابوں پر جھکا یونیورسٹی کے محمود آباد ہوسٹل کے ایک کمرے میں نیند کے غلبے سے چھٹکارا پانے کے لئے زور زور سے گانے لگا۔ بالماں دھیرے دھیرے، چوری چھپکے آنا کوئی دیکھے نہ۔ بالماں آں آں۔ ابے سونے دے یار کیا برساتی مینڈک کی طرح چلا رہا ہے۔ دوسرے کمرے میں سے اس کے ساتھی کی آواز بلند ہوئی۔ رفتہ رفتہ مکمل خاموشی طاری ہو گئی ساری یونیورسٹی، سارا شہر، فیض آباد چھاؤنی کا ریسٹ ہاؤس اور ٹرم روڈ کی غفران منزل، ساری کائنات اندھیارے میں سہم اور سمٹ کر دھیرے دھیرے ڈولتی جا رہی تھی اور آگے اور آگے۔ گومتی کی دھارائیں بڑے بڑے بھنوروں کے حلقہ میں گھل مل کر شور کر رہی تھیں اور سرجو کے کنارے پانی میں ڈوب گئے تھے "بہت کالی رات ہے۔ بارش لدی کھڑی ہے۔ پھوار آئی تو سارے پلنگ بھیگ جائیں گے۔ بٹیا بھیا سب جنے اندر چل کر لیٹو۔" عباسی خانم نے باہر آ کر کہا۔ پی چو نے کروٹ بدل لی۔ اس نے اس وقت، عباسی خانم کے پکارنے سے ذرا پہلے چار روسی ٹینک خریدے تھے اور ان پر سوار ہو کر گرین لینڈ جا رہا تھا۔ یو۔پی ملٹری پولیس میں ٹینک کب سے استعمال ہونے لگے یہ اسے پتہ نہیں تھا) اس نے ایک آنکھ کاہلی سے آدھی کھولی اور آہستہ سے پوچھا۔ کرسٹی۔ کرسٹابل — "اٹھو پی چو —" ارے یہ تو محض رخشندہ کی آواز تھی۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"کتنا گھور اندھیارا چھایا ہے۔ باپ رے باپ۔" ریبا نے آنکھیں مل کر صحنچی میں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور دالان میں آ کر پلنگ اندر سرکانے میں دوسری مہریوں کی

مدد میں مصروف ہو گئیں۔ آندھی آ ئیگی شعلہ پری نے پیشین گوئی کی۔ وہ سب کمروں میں جا لیٹے۔ کمروں میں بچھی ہوئی مسہریوں کے بستر گرم معلوم ہوئے کیونکہ پہلے سے سارے دروازے بند تھے اور حبس طاری ہو گیا تھا۔ رخشندہ نے اپنے کمرے میں آکر دریچہ کھول دیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آ گیا۔ اس نے روشنی جلائی (ایک دم سے رات کو جب کسی وجہ سے گھر بھر جاگ اُٹھتا تھا۔ روشنیاں جلائی جاتی تھیں۔ لوگ باتیں کرنے اور چلنے پھرنے لگتے تھے تو اُسے یہ بڑا اچھا لگتا تھا، رمضان کی سحری کے وقت کا سا مزا آتا تھا) لیمپ کی گلابی روشنی میں کمرے کی ہر چیز بڑی باقاعدگی اور سکون سے رکھی نظر آ رہی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے جا بیٹھی۔ اور اپنی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ ارے بڑی اندھیری رات ہے۔ اس نے دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ ہوائیں اپنے ساتھ درختوں کی خوشبوئیں لا رہی تھیں۔ یہی اندھیارا اس وقت سارے میں چھایا ہو گا۔ یہی بادل، یہ ہوائیں۔ یہی برکھا کی رات (برکھا کی رات آئی منوا ہر لے من کا بھاگ پہاڑی سانیال کا گیت اسے یاد آیا اور اسے گنگنانے کو جی چاہا۔ لیکن پھر اس نے مسہری پر واپس جا کر سو جانے کا ارادہ کر لیا) ہوا کے جھونکوں سے کمروں کا حبس ختم ہو چکا تھا لیکن آس پاس کے کمرے خالی تھے اور اکیلے۔ اور باغ میں ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ وہاں پر کوئی نہ تھا۔ کوئی نہیں۔ اس وقت سب اپنے اپنے گھروں میں اسی طرح بارش اور جھکڑ سے محفوظ سوتے ہونگے گینی۔ کرن۔ ڈائمنڈ۔ فیروز، چندر لیکھا پنڈت۔ سب لوگ۔

ہوا ایک لخت بہت تیزی سے چلنے لگی۔ اور بہت سارے بادلوں کو بہا کر لے گئی۔ بارش کا ایک ہلکا سا چھینٹا پڑا جس میں صبح ہوتے ہوتے باغ کے سارے

درخت پھول اور پودے جگ اُٹھے۔ آندھی اوپر ہی سے گذر گئی۔

"او۔ ڈیئر — ڈیئر — لائف از فنی"۔ پام کے درختوں کے نیچے سبز بید کی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے مسز چندرا ہری ہر پال لیموں کا ایک پتہ توڑ کر کاہلی سے اپنی چھوٹی سی خوبصورت ناک کے قریب لے گئیں۔ برکھا کے موسم کی وجہ سے دلکشا کلب کے باغ کے سارے درخت بہت دھلے دھلائے اور تر و تازہ معلوم ہو رہے تھے۔ "لائف از فنی"۔ انہوں نے دوبارہ کہا۔ "تم کیا سوچ رہی ہو سکینہ ڈارلنگ"۔ انہوں نے بیگم اصغر امام سے پوچھا جو خاموشی سے اُدن لک کے تازہ پرچے کی ورق گردانی میں مصروف تھیں پام کے پتے آہستہ آہستہ سرسرا رہے تھے اور دور کلب کی عمارت میں رات کے رقص کے لئے ڈی سلوا اور اس کے ساتھی اپنے اپنے سازوں کو دھیمے سُر میں بجا کر ٹیون کر رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد باغ کی سڑک پر سے اکا دکا موٹریں گذر جاتی تھیں۔ "آج اب تک سلیم نہیں آیا"۔ بیگم اصغر امام نے راستے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں - اب تک نہیں آیا۔ یہ آدمی لوگ سارے کے سارے ایسے سہانے موسم میں کمروں میں گھسے کیا کرتے ہیں؟" چندرا ہری ہر پال نے کلب کی سمت نظر اٹھا کر پوچھا۔

"برج - چندرا ڈیئر۔ ازلی اور ابدی برج"۔ بیگم اصغر امام نے جواب دیا۔ "او — گوش"۔ چندرا ہری ہر پال نے اور بھی زیادہ کاہلی سے جمائی لی۔ گہرے سبز سلیکس میں ملبوس ہیڈی لیمار جیسے بالوں والی رانی جے پال سنگھ تیز تیز قدم رکھتی روش پر سے پام کے جھنڈ کی طرف آتی نظر آئیں۔

"ہلّو — سکینہ چندرا ڈارلنگز —" انہوں نے قریب آتے ہوئے ذرا جلدی سے کہا

"ہلو ـــــ" بیگم اصغر امام اپنی نازک، باریک آواز میں چلائیں۔

"سنا تم نے ـــــ سلیم یہاں سے چلا گیا۔ رانی جے پال سنگھ نے ایک کرسی پر گرتے ہوئے بیحد اکسائٹڈ لہجے میں کہا۔

"گیا ـــــ ؟ کہاں ـــــ ؟" چندرا مہری ہرپال نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

"کہا جاتا ہے کہ وہ اِس آخری شام غفران منزل گیا۔ وہاں پر سب لوگ حسب عادت اپنی کسی پکنک کا پروگرام بنانے میں مصروف تھے۔ اتنے میں وہ یکایک اُٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ پھاٹک پر کھڑی ہوئی اپنی کمانڈو گاڑی میں بیٹھا اور زناٹے سے آتوں رات اپنے ضلع کی طرف واپس چلا گیا۔ اور اب کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی واپس نہ آئیگا" رانی جے پال سنگھ جلدی جلدی اپنی بات ختم کر کے آرام کرسی پر لیٹ گئیں۔

"اوہو ـــــ ہاؤ انٹرسٹنگ ـــــ اور پھر کیا ہوا سفینہ ڈارلنگ"؟ مسز چندرا مہری ہرپال نے پوچھا۔

"مجھے کہتا تھا ـــــ مجھے کہتا تھا ـــــ کہ حکومت اسے کسی خاص ٹریننگ کیلئے سمندر پار بھیج رہی ہے۔ اور اس شام غفران منزل کے باغ میں حفیظ احمد نے اس کا راستہ روک کر پوچھا تم کہاں جا رہے ہو؟ اور اس نے اپنے ہمیشہ کے سے اخلاق کے لہجے میں، جیسے کسی سے رقص کی درخواست کرتا ہو، اس نے کہا میرا راستہ چھوڑ دو بھائی۔ اب مجھے یہاں سے آگے جانا ہے۔ سنا تم نے سکینہ ڈیئر" رانی جے پال سنگھ نے کہا۔" اور وہ آگے چلا گیا۔ آج کل وہ اپنے کسی معائنے کے لئے کہیں گیا ہوا ہے جلد ہی وہ کہیں اور آگے چلا جائیگا" رانی جے پال سنگھ نے لیموں کی چار پانچ پتیاں توڑ لیں اور انہیں سونگھنے لگیں۔ پام کے پتے ہوا میں سرسراتے رہے (یہ لوگ گیا

باتیں کر رہی ہیں۔؟" روش پر سے گذرتے ہوئے ڈائمنڈ نے چپکے سے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا۔"اسی تم لوگوں کے خوبصورت دوست کے متعلق جو پرسوں رات لکھنؤ سے چلا گیا۔ اس نے جواب دیا۔ اوہ گوش۔ جالینوس نے سب کی سٹی گم کر رکھی ہے ڈائمنڈ نے اپنی خاص اصطلاح استعمال کی۔ وہ دونوں روش پر سے آگے گذر گئے)

بیگم اصغر امام کی آنکھیں پھیلی کی پھیلی رہ گئیں "او گوش۔ پھر کیا ہوا اینبہ ڈیر؟" انہوں نے بالکل سحر زدہ آواز میں آہستہ سے پوچھا۔

"مجھے کہنا تھا۔۔۔ مجھے کہنا تھا۔ کہ وہ عفران منزل سے سیدھا اپنے آئی۔جی کے پاس کارلٹن ہوٹل پہنچا اور اُن سے اُس نے کہا۔ اُس نے کہا۔ سنئے کرنل او بیرائے ہیں ابھی واپس جا رہا ہوں۔ اور اگر آپ نے مجھے ایک منٹ بھی روکنا چاہا تو میں استعفےٰ دیدوں گا۔ فوراً استعفےٰ دیدوں گا۔۔۔"

اُوووو۔۔۔ دو ونٹ دیٹ کیوٹ۔۔۔" بیگم اصغر امام اپنی نازک آواز میں پھر چلائیں۔

"بلکہ مجھے تو یہ تک بتا رہا تھا سکینہ ڈارلنگ کہ وہ اپنی کالی آنکھوں کو چھپانے کے لئے نقاب پہن کر اور سپنول لیکر بالکل نشکا گو اسٹائیل میں کارلٹن ہوٹل پہنچا اور اُس نے کہا۔ اُس نے کہا۔ سنئے کرنل او برائے ایک تازہ ترین خبر سناؤں ڈیئر ونز۔۔؟" راجکماری کمل گڈھ نے روش پر سے تیزی سے آتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ کر جلدی جلدی کہا۔

"کیا۔۔۔ کیا ہوا پدما ڈارلنگ۔ کیا تمہیں اپنے شوہر سے عشق ہو گیا؟۔۔۔" چندرا ہری ہر پال نے کرسی پر لیٹے لیٹے کاہلی سے پوچھا۔

"ارے نہیں" ــــ راجکماری کمل گڈھ ایک لمبا سانس بھر کر سر نہوڑاتے ہوئے کہا "وہ۔ وہ سلیم چوہتا ــ مائی ۔ مائی ــــ سوچو تو اس نے کیا کیا ــــ؟"

"شادی کر لی ۔ ؟"

"ارے نہیں بھئی ــــ ابھی ابھی لیڈی مصرا کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کی کار فیض آباد کی طرف تیزی سے جا رہی تھی اور اس میں وہ نے فیروالی لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے بھورے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں سنتوش کی جھلک تیر رہی تھی" (راجکماری کمل گڈھ اپنے تیسرے شوہر سے شادی نہ کرنے سے پہلے کو بتیا لکھا کرتی تھیں جس کا انگریزی ترجمہ ایک دفعہ اون لکر میں بھی چھپا تھا) "سنا تم نے ــــ؟" راجکماری کمل گڈھ نے سانس روک کر پوچھا۔

اُن سب نے اپنے اپنے شیری کے گلاس ایک ساتھ زور سے میز پر رکھ دیئے اور انتہائی تعجب اور حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ ڈی سلوا کے بینڈ کی آواز رفتہ رفتہ اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

"لائف از فنی" چندرا دھری ہرپال نے 'از' پر زور دیکر تھوڑی دیر بعد پھر اپنے آپ سے کہا "سوچو تو۔ یہ موسیقی اتنی سونی سونی لگ رہی ہے وہ ابھی ہمارے درمیان سے علیحدہ ہوا ہے لیکن لگتا ہے جیسے اُسے یہاں سے گئے مدتیں گذر گئیں۔ جیسے وہ کبھی یہاں آیا ہی نہ تھا۔ اوہ گوش"

"سنا ہے غفران منزل کا چھوٹا کنور بھی تو کہیں جانے والا ہے" کچھ وقفے کے بعد بیگم اصغر امام نے پھر باتیں شروع کیں۔

"ہاں۔ اور لیڈی مصرا کہہ رہی تھیں کہ کرسٹابل حفیظ احمد اپنے اتنے سوئیٹ

اور شریف میاں کو طلاق دے رہی ہے جو ہمیشہ ویکس سونگھتا رہتا ہے۔" راجکماری کمل گڈھ نے کہا۔

"رخشندہ عرفان نے کچھ دنوں سے پولیٹکس میں ناک ڈبونا بھی چھوڑ رکھا ہے۔ حالانکہ پرسوں میں نے اس سے خود کہا تھا کہ ڈارلنگ تم کلکتے کے بچارے زخمیوں کے لئے ضرور کچھ کرو۔ میری ساری ہمدردی تمہارے ساتھ ہے۔ مگر اب وہ پولیٹکس میں ناک بالکل نہیں ڈبوتی۔ صرف بیٹھی پیانو بجایا کرتی ہے۔ جو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں ڈارلنگ کہ اسے زیادہ اچھی طرح بجانا نہیں آتا۔ تم نے کبھی میری چھوٹی بہن کو شوپاں بجاتے سنا ہے؟ بالکل آسمانی ـــ بالکل آسمانی ـــ" رانی جے پال سنگھ نے کہا۔

"اوہ ـــ ؟ میں یقیناً کبھی اس کا شوپاں سنوں گی۔" راجکماری کمل گڈھ نے کہا "اور کرشن نرائن کی لڑکی بمبئی کے ٹیکسٹائل کمشنر سے شادی کرنے کے بجائے سنا ہے امرناتھ کی یاترا کے لئے جانیوالی ہے۔ او ڈیر ـــ ڈیئر ـــ ذرا سوچو تو" انہوں نے اتنی ساری باتوں سے بظاہر بالکل تھک کر کرسی کے کشن پر سر رکھ دیا۔

گھاس کے قطعے کے پرے، کلب کی کوٹھی روشنیوں سے جگمگا اٹھی۔ پام کے جھنڈ میں ہوائیں آہستہ آہستہ سرگوشیاں کرتی رہیں۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لیکن چاند کی مدھم روشنی سارے میں اجالا بکھیر رہی تھی۔

"اور سنا تم نے چندرا ڈیئر۔" بیگم اصغر امام نے فضا کے مکمل سکوت سے اکتا کر تھوڑے سے وقفے کے بعد کہا۔ "آج کے پائنیر میں تھا کہ تنانتی نکیتن والے مسٹر لہری کا اچانک انتقال ہو گیا۔"

اوہ ــــ چچ چچ چچ ــــ مجھے یاد پڑتا ہے میں نے نینی تال کی نمائش میں قطعی ان کی تصویریں دیکھی تھیں۔ چچ چچ ــــ" چندرا ہری ہرپال نے کہا۔

"مسٹر لہری کا انتقال ہوگیا؟ کسی رومنٹیک طریقے سے خودکشی کرلی؟" راجکماری کمل گڈھ نے کشن پر سے سر اٹھا کر پوچھا۔

"ارے نہیں پدما ڈیر محض ہارٹ فیل"۔ بیگم اصغر امام نے اطمینان سے جواب دیا۔

راجکماری کمل گڈھ نے مایوسی کے ساتھ کشن پر سر رکھ کر پھر آنکھیں بند کرلیں۔ "پوئر۔ پوئر مسٹر لہری۔ مجھے بھی یقیناً ان کی تصویریں دیکھنی چاہئیں۔ کیا وہ خوبصورت بھی تھے سکینہ ڈارلنگ؟" رانی جے پال سنگھ نے پوچھا۔

"مجھے ضرور ری مائنڈ کرا دینا سکینہ ڈارلنگ میں ہری سے کہوں گی کہ کلچر سوسائٹی کے اگلے ڈنر پر مسٹر لہری کی اس بے وقت موت پر ایک ریزولیشن بھی پاس کروا دے" چندرا ہری ہرپال نے کہا۔

"یقیناً چندرا ڈیر"۔ بیگم اصغر امام نے جواب دیا۔

"آہ۔ ہمارا آرٹ ــــ انتہائی بیکسی کے عالم میں پڑا ہے۔ کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ ہم سب کو یقیناً آرٹ کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ ڈارلنگ تمہارا کیا خیال ہے؟" چندرا ہری ہرپال نے بے حد ہمدردی کے لہجے میں راجکماری کمل گڈھ سے پوچھا۔

"قطعی"۔ راجکماری کمل گڈھ نے جواب دیا۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ مسٹر لہری کی ساری تصویریں خرید لوں۔ انہوں نے یقیناً ایک جوان خوبصورت بیوہ اور چند چھوٹے چھوٹے بچے بنگال کے کسی ہرے بھرے دور افتادہ گاؤں میں اپنے لئے سوگوار چھوڑے ہونگے؟"

"نہیں پدما ڈیر۔ میرا خیال ہے انہوں نے شادی نہیں کی تھی"۔ چندرا ہری ہرپال نے کہا۔

"آرٹ ــــ واقعی اتنی ــــ عمدہ چیز ہے"۔ بیگم صغرا امام نے کچھ دیر بہت غور و خوض کے بعد کہا۔

"بے حد عمدہ"۔ رانی جے پال سنگھ نے ان کے خیال سے اتفاق کیا۔

"اور آرٹسٹ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں"۔ راجکماری کمل گڈھ نے کہا۔

"بے حد دلچسپ"۔ رانی جے پال سنگھ نے کہا۔ "اب انہیں مسٹر نہری کو دیکھا تم نے بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ کو مر گئے۔ ہاؤ ایبسرڈ!"

"ہاؤ ایبسرڈ ــ!! ہا ہا ہا ــ ستیہہ ڈارلنگ یو ڈو میک می لاف"۔ بیگم صغرا امام اپنی نازک، باریک آواز میں ہنس پڑیں۔

"چندرا ــ ستیہہ ــ پدما ــ سکینہ ــ کہاں ہو بھئی تم سب ہم لوگ اتنی دیر سے اندر بیٹھے اکتا رہے ہیں"۔ روش پر سے آواز آئی اور پھر ہری ہرپال آئی سی ایس پام کے جھنڈ کے قریب آ گئے۔

"ہم لوگ ابھی آرٹ کے متعلق باتیں کر رہے تھے ہری ڈیر"۔ مسز ہری ہرپال نے چہک کر ان سے کہا۔

"اوہ ریلی ــــ ہاؤ انٹرسٹنگ"۔ انہوں نے جواب دیا۔ وہ سب کلب کی سمت جانے کے لئے باغ کی روش پر آ گئے۔ اندر ڈی سلوا کا ڈانس بینڈ پوری تیزی سے بجنا شروع ہو گیا تھا۔

ارے دل تو بہت تیزی سے ڈوبا جاتا ہے۔ بہت سارے اکیلے چھوٹے چھوٹے پتّے درخت کی ٹہنی پر سے گر کے پانی کی سطح پر تیرتے لرزتے لہروں کے ریلے کے ساتھ آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور تاریکی چھا رہی ہے۔ گونجتی ہوئی لرزہ خیز تاریکی اور ابدی تنہائی کا احساس اور یہ خیال کہ اندھیارے کی اس وادی کے پرے وہ جگمگاتی ہوئی، روشن دنیا ہے جہاں خوبصورت سُرخ چھتوں اور ہرے باغیچوں والے گھر ہیں اور سنہرے بالوں اور سُرخ ربنوں والے چھوٹے چھوٹے بچّے، اور سہ پہر کی چائے کی گھڑیاں، پُرمسرت گہما گہمی اور اس طرف، یہاں پر آس پاس صرف دوپہر کا گہرا سنّاٹا پھیلا ہوا ہے جس میں فضا میں تیرتی ہوئی ہر آواز بہت صاف سنائی دیتی ہے اور مکھیوں کی اونگھتی ہوئی بھنبھناہٹ اور بہت دور کسی بڑھئی کی کھٹ کھٹ کی مسلسل متوازن آواز پیپل کی سیٹیوں کی تلخ صدائیں مل جل کر اس سکوت میں گونجتی ہوئی بہت قریب آجاتی ہے اور چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ دل ڈوبتا جا رہا ہے۔ وقت تیزی سے گذرتا جا رہا ہے۔ اس کی پرواز کو کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ لمحے کبھی واپس نہیں آسکتے جن میں وہ اس کے اتنے قریب رہ چکی تھی۔ دن ڈھل رہا ہے۔ اسوک کے درختوں کے سائے طویل ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ نور منزل کا باغ اتنا خاموش پڑا ہے۔ ابھی شام ہو جائے گی۔ ابھی رات آئے گی۔ ایک اور رات۔ یہی اندھیرا۔ یہی سکوت۔ جبکہ وہ جا چکا ہے۔ وہ جا چکا ہے۔ پچھلی شام وہ عفران منزل گئی تھی اور وہاں اسے معلوم ہوا تھا کہ ابھی ابھی اس کے وہاں پہنچنے سے صرف چند لمحے قبل وہ وہاں سے گیا تھا۔ وہ وہاں دیر تک گھاس پر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھا مزے مزے کی باتیں کرتا رہا تھا۔ پھر وہ دفعتہً وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا اور اپنی کمانڈو گاڑی چلاتے ہوئے

حسبِ معمول وہ بے حد دلکش لگ رہا تھا اور اب وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔
وہ بہت دور جانے والا ہے۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ وہ جہاں پہنچتی تھی۔ وہ اس سے
پہلے ہی وہاں سے جا چکا ہوتا تھا۔ اس روز وہ اتنی کوشش اور اہتمام سے دلکشا
کلب گئی تھی۔ وہاں عفران منزل کے چھوٹے کنور نے اس قدر اخلاق سے آکر
اس سے باتیں کی تھیں اور یقیناً یہی سوچ کر اس سے ناچ کے لئے کہا تھا کہ
وہ وہاں پر بہت اجنبی محسوس کر رہی ہوگی اور وہاں پر اس سے باتیں کرنے والا
کوئی نہ تھا۔ جبکہ وہ، جو وہاں اس کے اتنے قریب دیر سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے
بات کئے بغیر بے پرواہی سے وہاں سے اٹھ کر دوسری طرف چلا گیا تھا۔ شاید
اُس نے یہ دیکھنے کی بھی پرواہ نہ کی ہوگی کہ وہ وہاں پر موجود ہے۔ وہ کچہری روڈ
کے مکان سے نکل کر وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے جیسی موڈرن اور فیشن ایبل جگہ میں رہنے
لگی تھی۔ وہ سیٹرڈے کلب کے ممبروں سے اتنی انٹلکچوئیل باتیں کرتی تھی۔ وہ
صالحہ خاتون سے شہلا رحمٰن بن چکی تھی۔ اسے وہ تو اس کی پرستش کرتی۔ کبھی
اس نے اس کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا کہ وہ ثابت کر سکے کہ وہ کتنی اچھی ہے۔ اس
کے پاس حسن تھا۔ اس کے پاس ذہانت تھی۔ اس کے پاس اس کی شاعری تھی
جو اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ یہ سب چیزیں اتنی بیکار تھیں۔ اتنی
بیکار تھیں۔ واقعہ محض یہ تھا کہ وہ جا چکا تھا۔ اُس نے کبھی آج تک اس سے
سنجیدگی سے بات نہ کی تھی۔ وہ اپنی خاموش کالی آنکھوں سے سب کا مذاق
اڑاتا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اتنا مغرور تھا۔ اتنا خود پسند تھا۔ اتنا بے تعلق تھا۔
ارے وہ تو فرنٹ نہیں تھی۔ بالکل فرنٹ نہیں تھی۔ وائی، ڈبلیو، سی، اے میں

رہنے اور زینت ریاض سے دوستی کرنے سے کیا کوئی فروٹ ہو جاتا ہے۔ ارے
وہ یقیناً یہی سمجھتا ہوگا۔ تب ہی اس نے کبھی اس سے زیادہ باتیں نہیں کی تھیں
کبھی اسے اپنے آپ کو سمجھانے کا موقع نہیں دیا۔ جہنم میں جائیں برجیندر کمار
روہت اور ڈاکٹر سکسینہ اور یہ سب لوگ۔ وہ تو اتنی مدتوں سے اس کی
پرستش کر رہی تھی جنم جنم سے اس کا انتظار کرتی آئی تھی۔ اور اس نے اس کو
محض فروٹ سمجھا۔ تب ہی وہ ان لوگوں میں، ان غفران منزل کے سٹ کی لڑکیوں
میں گھسا رہتا تھا جو دلکشا کلب کی ممبر ہونے کے علاوہ اس کے لئے مرغ مسلم اور
آم کی آئس کریم بھی بنا سکتی تھیں۔ یہ کمبخت سب محض مرغ مسلم اور آم کی
آئس کریم چاہتے ہیں۔ شاعری کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ کوئی پرواہ نہیں کرتا۔
پچھلے مہینے وہ غفران منزل والوں کے ساتھ ساون منانے بارہ بنکی کے ایک
گاؤں میں گئی تھی۔ کرسٹابل نے ان سب کو جھیل کے کنارے آم کھانے کے لئے
مدعو کیا تھا۔ وہ سب ایک ڈاک بنگلے میں پہنچے۔ دفعتہً چاروں طرف سے گھٹائیں
جھوم کر اٹھیں اور سخت بارش ہونے لگی۔ جس عمارت کو وہ دور سے ڈاک بنگلہ سمجھتے
تھے۔ وہ دراصل صوبے کی حکومت کے ایک وزیر کی کوٹھی تھی۔ اس کے چوکیدار
نے دروازے کھولنے سے انکار کر دیا اور ان سب سے کہا کہ پہلے صاحب کو لکھنؤ فون
کر کے اجازت منگوا لیجئے۔ پھر کمرے کھول دیئے جائیں گے۔ راجہ حفیظ احمد اور ان
کے ساتھی بہت سٹپٹائے کہ اتنے ڈھیروں راجاؤں، راجکماروں اور کنور رانیوں
کی پلٹن کھڑی ہے اور چوکیدار نالہ کھولنے سے انکار کر رہا ہے۔ تب ان کی ایک
پارٹی کہیں آس پاس ٹیلیفون کھوجنے کے لئے نکلی۔ بہت دیر تک کھیتوں اور

باغوں کا چکر لگانے کے بعد وہ اتفاقاً ضلع کے ریسٹ ہاؤس پر جا پہنچے۔ وہ اسی وقت اس ضلع کے جیل کا معائنہ کر کے واپس آیا تھا اور برآمدے میں بیٹھا سہ پہر کی چاے پی رہا تھا۔ اپنے غفران منزل کے دوستوں اور ان کے ساتھ کی خواتین کو وہاں جنگل بیاباں اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ تعجب سے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اسے بتایا کہ ان کے باقی کے دوست رفیع احمد قدوائی کی کوٹھی کے برآمدے اور برساتی میں بارش کے پانی میں غوطے کھانے کی مشق کر رہے ہیں اور وہ ٹیلیفون کرنے وہاں آئے ہیں جب وہ فون پر رفیع احمد قدوائی کے سکریٹری کو اپنے اس کوٹھی میں پہنچنے کی اطلاع دے چکے تو اس نے ہمیشہ کی طرح بے حد اخلاق سے انہیں چاے کے لئے روکا۔ غفران منزل کے چھوٹے کنور نے بے حد اصرار کیا کہ وہ بھی آم کھانے کے لئے ان کے ساتھ جھیل تک چلے۔ لیکن اسے جب ہی تھوڑی دیر بعد شام کی گاڑی سے آئی۔ جی سے ملنے الہ آباد جانا تھا۔ اسے وہیں ریسٹ ہاؤس میں معائنے کی رپورٹ پر سر کھپاتا چھوڑ کر وہ سب رفیع احمد قدوائی کی کوٹھی واپس پہنچے اور ڈائمنڈ نے اسے بتایا کہ وہ سب کس طرح بارش میں بھیگتے اس ریسٹ ہاؤس تک جا نکلے تھے۔ جہاں اتفاق سے وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اور کس طرح انہوں نے اس کے ڈرائینگ روم میں پنکھے کے نیچے اپنی ساریاں خشک کی تھیں اور چاے بنانے میں اس کی مدد کی تھی۔ چنانچہ قسمت میں یوں تھا کہ وہ ساون منانے بارہ بنکی کے خاص اس مقام پر پہنچیں۔ جہاں وہ ریسٹ ہاؤس تھا جس میں اس روز وہ آیا ہوا تھا اور فون کرنے کی ضرورت پیش آئے اور ایک ٹولی اس ریسٹ ہاؤس تک جا پہنچے۔ لیکن وہ اس ٹولی میں شامل نہ ہو اور

کرسٹابل اور رخشندہ کے ساتھ رفیع احمد قدوائی کی سنسان کوٹھی کے برآمدے میں
گراموفون سے سر کھپاتی رہے اور پھر یہ ہوا کہ جب وہ بارش تھمنے پر غفران منزل
کے چھوٹے کنورکی پولیس کی ٹرک میں پکنک والوں کی ایک پارٹی کے ساتھ واپس
لکھنؤ کی طرف روانہ ہو گئی۔ تب آدھ گھنٹے بعد الہ آباد کے لئے ریلوے اسٹیشن
جاتے ہوئے وہ رفیع قدوائی کی کوٹھی کی طرف سے گذرا اور وہاں پر ہاتی کے لوگوں
کو جمع دیکھ کر کچھ دیر کے لئے وہاں رک گیا اور رخشندہ اور کرسٹابل نے آم کی جو
آئس کریم اور جو پکوان وہاں تیار کیا تھا۔ وہ اس نے کھایا اور برآمدے کے
فرش پر اکڑوں بیٹھ کر اس نے گیتی اور دوسری لڑکیوں کو آموں کی بالٹی میں سے
اچھے اچھے آم چن کر دیتے اور ان سب کو سروآرجی کے تازہ ترین لطیفے
سنائے۔ جن کا وہ بہت ماہر تھا اور ہمیشہ کی طرح ان سب کے ساتھ خوب ہنستا
رہا اور پھر وہ سب اسے وہاں سے اسٹیشن تک پہنچانے گئے اور پھر
رات پڑے لکھنؤ واپس آئے۔ قسمت میں یوں تھا اور جب وہ کل شام
غفران منزل گئی تو وہ وہاں سے بہت دور جا چکا تھا۔ دن ڈھل گیا۔
سورج اسوک کی قطاروں کے پرے چرچ کے پیچھے غروب ہوتا جا رہا تھا
چرچ کے مینار کا سایہ گھاس کے قطعے پر بہت دور تک پھیل گیا تھا۔ کبھی
کبھی کوئی لڑکی سفید ساری پہنے برامدے میں سے گذر جاتی تھی۔ چرچ کا گھنٹہ
شام کی دعا کے لئے آہستہ آہستہ بجنا شروع ہو گیا تھا۔ نور منزل کی ساری
عمارت غیر معمولی طور پر خاموش پڑی تھی۔ تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس
نے کمرے کے باہر آ کر دیکھا۔ پھر وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ برآمدے کے

دوسرے حصے میں اور اسکرین کے اُس طرف زینت ریاض کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ شاید کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ ارے یہ تنہائی یہ سناٹا۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اتنا وسیع، اتنا بے رنگ وحشتناک خلا چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ دل ڈوب جائے گا۔ بالکل ڈوب جائے گا۔ وجود کی حقیقت اتنی بے معنی ہے، اتنی بے معنی ہے۔ ارے وہ تو سہلا رحمن تھی۔ اُس نے گورکھپور کے گرلز ہائی اسکول سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا تھا۔ الٰہ آباد کے کراسویٹ کالج سے بی، اے کی ڈگری لی تھی وہ اتنی قابل تھی۔ گورکھپور میں اس کا گھر رنگین کانچ کے موتیوں والے پردوں اور شیر اور چیتے کی تصویروں والے فریموں سے سجا ہوا تھا۔ وہ بیڈمنٹن کھیل سکتی تھی۔ وہ سپیٹر ڈے کلب میں اتنی ہر دلعزیز تھی۔ اس کی چھوٹی بہن کی شادی ایک اُجڑے سے لفٹنٹ سے ہو گئی تھی لیکن وُہ خود اتنی انٹلکچوئیل تھی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا تھا۔ وہ اپنا کریر بنائے گی۔ وہ لکھنؤ جائے گی۔ لکھنؤ میں لڑکیاں ریڈیو میں کام کرتی ہیں۔ سائیکلوں پر گھومتی ہیں۔ پولٹیکس میں حصّہ لیتی ہیں۔ وہ بھی یہی سب کرے گی۔ اسے کوئی کھا نہ جائے گا۔ ہم اس شخصی آزادی اور حریت کے زمانے میں بھی مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ سماجی اور معاشی قوانین بنانے پر مصر ہیں۔ ایسی اعلیٰ تعلیم اور شخصی آزادی کس کام کی جہاں لڑکیوں کا مقصد صرف شادی کرنا سمجھا جائے۔ آپ لوگ سب بور ژوا ہیں (وہ نہایت جوش میں آکر کہتی) ذرا آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھئے۔ مسز وجے لکشمی پنڈت مسز نائیڈو، ارونا آصف علی یہ سب ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں (ہیئر۔ ہیئر

اس کا چھوٹا بھائی چلاتا) خود لکھنؤ میں ڈاکٹر رشید جہاں اور کامریڈ ہاجرہ بیگم سیاسی کام میں مردوں کے دوش بدوش ہیں۔ بیگم سعیدہ رضا ریڈیو میں پروگرام ڈائریکٹر ہیں۔ مسز مایا جمیل اور مس پشپا نارائن یونیورسٹی میں لڑکوں کو پڑھا رہی ہیں یہاں تک کہ سر جے۔ پی سریواستوا کی لڑکی شیلا جس کا میاں راجیشور دیال آئی۔ سی۔ ایس ہے۔ خود یونیورسٹی میں لڑکوں کو یورپین ہسٹری پڑھا چکی ہے (اس کی ماں یہ آخری بات سن کر بے حد مرعوب ہو جاتی) اس کو اپنی ان تقریروں پر جو وہ صبح سے شام تک اپنے گھر والوں سے کرتی رہتی تھی۔ خود تعجب ہوتا تھا وہ بے حد عمدہ مقرر بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر اسے موقع دیا جائے۔ بس موقع ــــ اسکوپ ــــ ہندوستان میں لڑکیوں کے لئے بس اسکوپ نہیں ــــ وہ سوچتی تب اسے ویمنیز اکیڈمی میں ہسٹری پڑھانے کے لئے جگہ مل گئی تھی اور وہ بیحد خوش ہوئی تھی۔ وہ اب بڑے بڑے کام کرے گی۔ تقریریں کرے گی۔ ملک کے نوجوانوں کو جیل بھجوائے گی۔ خود جیل جائے گی۔ ریڈیو پر رخشندہ عرفان علی کی طرح انگریزی میں پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی تک سے (جن کے لئے بیورلی نکلس نے لکھا تھا کہ ہندوستان میں اسے صرف ایک انٹلکچوئیل نظر آیا اور وہ لکھنؤ یونیورسٹی کا پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی) انگریزی میں بحثیں کرے گی۔ کلاسیکل موسیقی سیکھے گی۔ وہ یہ سب سوچتی رہتی اور اس کی ماں اور خالہ سے ملنے والی بیویاں ایک دوسرے سے سرگوشی کرتیں۔ لو بھئی اور سنو کہ چھوٹی بہن تو اٹھ گئی اور بڑی بہن بیٹھی ہے ویسی کی ویسی (ویسی کی ویسی ــــ لاحول ولا) اے چھوٹی تو دکھیا ایف اے میں ہی تھی کہ اچھا لڑکا مل گیا۔ بڑی صاحبہ کے لئے بچاروں کو کوئی

ڈھنگ کا رشتہ نہ ہی نہیں جڑتا۔ اس لئے اب نوکری کرنے جا رہی ہیں۔ ان
باتوں سے بہی تو ہوگا۔ اے میری اصغری ہی کو دیکھو۔ نگوڑی آٹھویں جماعت
تک بھی نہ پہنچ چکی تھی۔ کہ لڑکے والوں نے دہلیز کی مٹی لے ڈالی۔ دھاڑیں مار
روتی ہوئی سدھاری تھی کہ اماں بیگم نے مجھے انٹرنس تک نہ کرنے دیا۔ اب ان
بی صالحہ بیگم کے لئے گیا کوئی لاٹ صاحب اترے گا آسمان سے۔ پڑھی کرنٹی
عورتوں کی طرح اسکول پڑھایا کریں گی ـــ لیکن وہ ان سب انتہائی رجعت پسند
تنقیدوں سے بے پرواہ فن کی شدید عقیدت کے ساتھ اپنے کمرے
میں بیٹھی ہارمونیم پر فلمی گانوں اور اقبال کی غزلوں کی دھنیں نکالتی رہتی تھی۔ اس
نے یقیناً بڑی عمدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ اس نے بی، اے، ایل، ٹی تک کر لیا تھا۔
وہ اتنی طبعِ موزوں لے کر دنیا میں آئی تھی۔ کاش کوئی فن کی قدر کرتا (لیکن یہاں
تو سب آم کی آئس کریم کی قدر کرتے ہیں) لڑکپن میں اسے ہارمونیم سکھانے
کے لئے ماسٹر دمڑی پرشاد پندرہ روپے ماہوار پر نوکر رکھے گئے تھے۔ وہ
روز تیسرے پہر کو کان پر بیڑی رکھے اسے فنونِ لطیفہ کا ماہر بنانے کے لئے
تشریف لاتے اور بیٹھک میں ایک مونڈھے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ جاتے
اور سر ہلا ہلا کر گنگناتے جاتے۔ اس نے اتنے سارے گانے سیکھے تھے۔ دل ہی
تو ہے نہ سنگ و خشت۔ اور تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا اور اڑی ہوا میں جاتی
ہے گاتی چڑیا یہ راگ ـــ وہ سر پہ باقاعدہ دوپٹہ ڈھکے بڑی سنجیدگی سے آنکھیں
نیچے کئے ان کے سامنے آ کر بیٹھ جاتی اور ہارمونیم کے پردوں پر نظریں جھکائے
سرگم کے کومل تیور اور رکھب دھیوت نکھاد کے سارے اسرار انتہائی تندہی

اور انہماک سے ذہن نشین کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ ماسٹر دمڑی پرشاد پ کو
کہتے تھے۔ مثلاً آہا ہاہا باغ میں کیا سندر فول فتے کھلے ہیں اور فریم نرائن بھارگوا
جو فولس کے کفتان ہیں۔ اُن کی لڑکیوں کو بھی میں میوزک سکھاتا ہوں۔ دو
مہینے میں میں نے انہیں آٹھ راگ پچیس راگنیاں سکھا دیں۔ تم بھی جلدی جلدی
سب سیکھ جاؤ بیٹا۔ جب کہیں کی ڈفلٹن بن جاؤ گی تو اپنے بوڑھے ماسٹر صاب
کو کیا یاد کیا کرو گی۔ وہ سر ہلا ہلا کر کہتے۔ وہ کھسیا کر زیادہ انہماک سے ہارمونیم
پر جھک جاتی۔ وہ کہتے۔ کہو۔ سا۔ پا۔ سا۔ وہ بھی کہتی۔ سا۔ پا
سا۔ گلے میں سُر بٹھاؤ۔ وہ شروع کرتے۔ نی رے گا رے گا پا ما۔
ماسٹر دمڑی پرشاد تان پلٹے الاپتے بیچ میں زور سے 'ہوں' کر کے
اُسے بتاتے جاتے۔ پھر وہ اُونچی آواز میں گانا شروع کرتے۔ سب گنی جن
امین گات ــــ سب گنی جن امین گات ــــ وہ بھی گاتی۔ کیونکہ سب گُنی جن گاتے تھے
ــــ ارے ہائے یہ اس کی زندگی تھی۔ اتنی بے رنگ۔ اتنی بے مزہ ــــ یہ
ٹریجک مڈل کلاس ــــ یہ گھسا ہوا 'بورژوا' طبقہ ــــ اس نے سیڑھیوں
پر بیٹھے بیٹھے سوچا ــــ لیکن پھر وہ ومینز اکیڈمی میں آگئی تھی اور نور منزل میں
رہتی تھی اور ایک بار دلکشا کلب جا چکی تھی۔ لیکن اب سب ختم ہو گیا۔ سب
ختم ہو گیا۔ اس دلکش جگمگاتی زندگی کے سارے الیوژن ختم ہو گئے۔ دل اس
تاریکی میں بالکل ڈوبتا جا رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ جا چکا ہے۔ اس سے
کبھی زیادہ باتیں کئے بغیر، اس سے اتنا بے پرواہ رہ کر، اسے تو اس کا خیال
بھی نہ آیا ہوگا۔ وہ اتنی دکھی تھی۔ اتنی دکھی تھی۔ ارے وہ تو بے حد بدقسمت تھی

باغ پر اندھیرا چھا گیا۔ سامنے چرچ کی کھڑکیوں میں مدھم روشنی جھلملا رہی تھی۔ اسے دفعتاً خیال آیا۔ سب اچھے دماغ، سارے فنکار عموماً بدنصیب ہوتے ہیں۔ شوپاں کیٹس، او شبیر تھری۔ سنا ہے ٹوٹے ہوئے دل ہی دنیا کے لازوال شاہکاروں کی تخلیق کرتے ہیں۔ یہ سب سوچ کر وہ بہت اکتا کے سیڑھیوں پر سے اٹھی اور کمرے میں واپس آ کر اپنی نظم پر جھک گئی ـــ اس نے لکھنا شروع کیا ـــ سنی وہ جھنکار نیم شب کو، کہ جیسے اک تار ٹوٹ جائے، کہ جیسے مضراب چھوٹ جائے ـــ کہ جیسے ـــ اُف ہنک ـــ یہ نہیں ـــ چوتھا مصرع موزوں کرنے سے پہلے اسے نیند آ گئی اور وہ کاغذوں پر سر رکھ کر سو گئی۔ انتہائی تکلیف وہ بیماری یا تیز بخار میں یا زخموں کی بے چینی میں جب تھوڑی دیر کے لئے نیند آ جاتی ہے تو اتنی ناقابلِ بیان راحت محسوس ہوتی ہے (شہلا ڈارلنگ ـــ زینت ریاض نے برآمدے کی اسکرین کے پرے سے آواز دی۔ لیکن وہ گہری نیند سو چکی تھی)

کچھ دیر تک ادھر اُدھر ٹہلنے کے بعد زینت ریاض نے برآمدے کی روشنی بجھا دی اور آرام کرسی پر آ بیٹھیں۔ اسوک کے درخت بالکل ساکت کھڑے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کومن روم میں سے کسی کے قہقہے کی آواز آ جاتی تھی۔ چرچ کے بُرج کے پیچھے سے چاند آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ ہوا بہت دیر سے بند تھی اور نور منزل کی ساری "اولڈ ہیڈز" اور وہ لڑکیاں جو شام کو کہیں باہر یا پکچر نہیں گئی تھیں۔ کومن روم کے سارے پنکھے چلا کر اور برآمدوں میں آ کر لوڈو کھیل رہی تھیں۔ زینت ریاض اندھیرے میں اسوک کے

پتوں کو دیکھتی رہیں۔ افوہ اللہ میاں ــــ انہوں نے اکتا کر جمائی لی۔ وہ اب بتیس سال چار مہینے کی تھیں (او جیزس! ــــ کیسی الف لیلےٰ کی ایسی رات ہے یہ ــــ باہر گھاس پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے چاند کو دیکھتے ہوتے کہا) اور وہ جا چکا تھا۔ آج برجیندر کمار روہت سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ وہاں سے چلا گیا۔ یہ سب کمبخت اسی طرح چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سکسینہ ایک اور ڈگری لینے کے لئے اوکسفرڈ چلے گئے تھے۔ منظور الحسن اب تک یورپ گھوم کر واپس نہ آیا تھا۔ حالانکہ اس نے چلتے وقت وعدہ کیا تھا کہ زینت آپا میں آپ کو یورپ سے ہر مہینے خط لکھا کروں گا جس میں تفصیل سے لکھوں گا۔ کہ میں وہاں کن کن ادیبوں اور ان مشہور لوگوں سے ملا جنہیں آپ پسند کرتی ہیں۔ کمبخت کے خطوط بھی انٹلکچوئیل ہونے لازمی تھے)۔ مسعود بی بی سی میں ملازم ہو کر کھسک گیا تھا۔ باقی بچے تھے صرف برجیندر کمار روہت۔ اور وہ بھی مسز پنڈت کے ہاں مکھن لگا کر کسی سفارت خانے کے ساتھ رفو چکر ہونے کی فکر میں تھے۔ سیٹرڈے کلب قریب قریب ٹوٹنے والا تھا اور وہ پینتیس سال چار مہینے کی ہو گئی تھیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ وہاں سے اس طرح دفعتاً چلا گیا تھا۔ وہ ٹیلیفون پر تو انہیں خدا حافظ کہہ سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ زینت آپا کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ حالانکہ وہ ان سے کوئی دو تین سال ہی چھوٹا رہا ہو گا لیکن اس نے تو فون پر زینت آپا خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ وہ سیدھا اپنے دوستوں کے ہاں سے اٹھ کر اپنے ضلع کو واپس چلا گیا اور اب برجیندر کمار روہت کہہ رہے تھے کہ وہ جلد کہیں باہر سمندر پار جانے والا ہے ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ انہوں نے اس کے متعلق عجیب و غریب افسانے سن رکھے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں

کسی بات سے انتہائی مایوس اور دل شکستہ ہو کر دور دراز کی سرزمینوں کو نکل گیا تھا۔ اس نے یورپ کے فیشن ایبل حلقوں میں اپنی شامیں گذاری تھیں۔ وہ خلیج فارس کے ایک خاموش جزیرے میں سب سے الگ تھلگ اپنے کام میں مصروف رہا تھا جنگ کے زمانے میں وہ ملایا کے جنگلوں اور مصر کے صحراؤں میں گھومتا رہا تھا۔ اور اتنی دشت نوردیاں کر کے واپس آنے کے بعد کچھ عرصہ ان لوگوں میں رہ کر وہ پھر یکلخت سب سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ اس وقت جانے کہاں وہ اپنا سفید اپریشن کا کوٹ پہنے اپنے شاندار اور دلکش طریقے سے کسی شیشوں والے کوریڈور میں سے گذر رہا ہوگا۔ جانے کون کون لوگ اس کے آس پاس ہوں گے۔ اس وقت وہ جانے کیا سوچ رہا ہوگا۔ یقیناً وہ اس وقت اپنی مسہری پر لیٹا لیمپ کی روشنی میں اس لڑکی اس رخشندہ عرفان علی کو ایک لمبا چوڑا خط لکھ رہا ہوگا (کاش وہ ویمنز اکیڈمی میں وسری اولڈ میڈز کی آپس کی سازشوں اور حسدوں کے جھگڑے نپٹانے اور انٹر اور بی اے کی غیر دلچسپ اور کند ذہن لڑکیوں کے ساتھ ڈیمانڈ اور سپلائی کے CURVES پر سر کھپانے کے بجائے ایک خوبصورت، پچیس سالہ لیڈی ڈاکٹر ہوتیں۔ سفید وائل کی ساری پر سفید لمبا کوٹ پہنے بلوریں میزوں پر اس کے ساتھ جھک کر آپریشن میں اس کی مدد کرتیں۔ اپنا کام ختم کرنے کے بعد وہ کسی شیشے کے دریچوں والے روشن کمرے میں بیٹھ کر اکٹھے چاء پیا کرتے۔ وہاں چاروں طرف گلدانوں میں پھول رکھے ہوتے اور وہ ان میں سے ایک پھول اپنے بالوں میں سجا لیا کرتیں۔ لیکن وہ اس وقت یہاں نور منزل کے اندھیرے برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹی ہیں اور صبح کو انہیں چالیس بیوقوف لڑکیوں کو ریکارڈو اور مارشل کے نظریئے سمجھانے کی تیاری کرنی

ہے) وقت تیزی سے گذرتا جا رہا ہے۔ وقت اتنا ظالم، اتنا ستم ظریف ہے، کاش وُہ یہاں صرف آٹھ سال پہلے آیا ہوتا۔ صرف آٹھ سال پہلے (اگر خواہشیں گھوڑے ہوتیں تو بھکاری ان پر سواری کیا کرتے۔ انہوں نے سوچا) لیکن وہ تو انہیں فون تک کئے بغیر جا چکا تھا۔ باغ میں خاموشی طاری تھی۔ لڑکیاں لوڈو سے اکتا کر اندر ٹیبل ٹینس پنگ پونگ کھیلنے کے لئے کومن روم میں جا چکی تھیں۔ مدھم چاندنی میں چرچ کا بُرج بہت اکیلا اور وحشتناک معلوم ہو رہا تھا۔ انہوں نے اس منظر کو دیکھتے دیکھتے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ سہ پہر کو "لالہ رُخ" سے کرسٹابل اور حفیظ احمد کا پرچہ آیا تھا۔ "پیاری زینت آپا، ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ اگر آپ ہمارے ساتھ کل پکنک پر چلیں۔ ہم آپ کے جواب کا انتظار کریں گے"۔ انہوں نے وہ پرچہ جُھک کر فرش پر سے اٹھا لیا اور چاند کی مدھم روشنی میں اس پر نظر ڈالنے کے بعد اسے پھر نیچے پھینک دیا۔ 'یہ ہم' ——— 'ہم' آپ کا انتظار کریں گے۔ 'ہمیں' بہت خوشی ہوگی۔ 'ہم' کل پکنک پر جا رہے ہیں۔—— یہ اکٹھے پن کا، یہ رفاقت کا احساس —— یہ اکٹھے پن کا شدید احساس ——— (ابراہام نے بھی شادی کر لی۔ پچھلی کرسمس کی چھٹیوں میں باہر جانے وقت اس نے پائنیر کے اپنے مزاحیہ کالم میں لکھا کہ اسے 'سل ٹو' کے نیچے آج تک کوئی بھی لک حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن دسمبر میں اپنے وطن ٹراونکور گیا اور وہاں سے واپس آکر اس نے اپنے دفتر سے فون کیا مس ریاض —— 'ہم' شام کو آپ سے ملنے آئیں گے۔ یہ سب کمبخت یہی کرتے ہیں۔ سب کہیں نہ کہیں جا کر شادیاں کر لیتے ہیں اور پھر بڑے تجاہل عارفانہ سے اتراتے ہوتے اپنی بیویوں کو لے کر واپس آن پہنچتے ہیں۔ سینتیس سال —— سینتیس سال چار ماہ —— وُہ

۲۹ رجون ۱۹۱۱ئہ کو اس دارالمحن میں داخل ہوئی تھیں) مدھم چاندنی میں یہ باغ اتنا اجاڑ نظر آ رہا تھا - اب تک ڈنر کی گھنٹی نہیں بجی - کل صبح ہی صبح نھر ڈایر کا انگلش ٹسٹ لینے کی تیاری کرنی ہے (ارے نہم تو کر یر وومن ہو بھائی - کریر کا میدان شکر کہ ہمارے ملک میں بھی اب وسیع ہوتا جاتا ہے - مثلاً تعلیم کا نوبل اور اعلیٰ پیشہ جس سے بنی نوع انسان اور خصوصاً مظلوم صنف نازک کی خدمت منظور ہے ہشت اماں جاؤ بھی کیا باتیں کرتی ہو یار) سینتیس سال چار مہینے ــــ لیکن اگر خواہشیں گھوڑے ہوتیں ــــ اگر خواہشیں گھوڑے ہوتیں ــــ (ٹائیگر ٹائیگر برننگ برائٹ ــــ گھاس پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے اپنا کالج کا کام کرتے ہوئے انگڑائی لے کر بلیک کی نظم زور زور سے پڑھنی شروع کر دی - چاند نبرتا ہوا چرچ کے بُرج کے عین اُوپر آ گیا - اسوک کی قطاریں ساکت کھڑی رہیں)

فضا میں گرمی زیادہ ہو گئی تھی اور گلاب کی پنکھڑیاں ٹوٹ کر پانی میں گر رہی تھیں اس نے پی چو کے سٹنگ روم میں آ کر دریچے کھول دیئے - وہ چلا گیا - وہ چلا گیا - اُس نے چپکے سے اپنے آپ سے دوبارہ کہا - برآمدے کے جنگلے پر زرد پھولوں والی بیل جھول رہی تھی اور گلاب کی پتیاں فرش پر بکھر گئی تھیں - اس دریچے میں سے ٹینس کورٹ نظر آ رہا تھا اور آم کے سلتے میں پڑا ہوا وہ پتھر کا رولر دکھائی دے رہا تھا جس پر بیٹھ کر اکثر اُس نے صبح کا اخبار پڑھا تھا اور ان سب کے ساتھ صبح اور سہ پہر کی چاء پی تھی - باہر ہوا میں خوبانی کی شاخیں سرسرا رہی تھیں اور شام کی چاء کے لئے وہ سب ٹینس کورٹ سے برآمدے کی طرف آ رہے تھے - ان کے ریتیں پر

سے گذرنے سے یوکلپٹس کے جھنڈ میں گری ہوئی پتیاں اور خشک ٹہنیاں کھڑکھڑا رہی تھیں۔ وہاں وہ نہیں تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ اس نے جھک کر شیلف میں سے ایک کتاب اٹھائی اور وقت گذارنے کے لئے اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اس کے کونے پر اس کی رائیٹنگ میں وہ تمام الفاظ لکھے نظر آئے جو اس نے غفران منزل والوں کے ساتھ رہ کر جمع کئے تھے۔ کیوٹ — ٹیریفک — سوئیٹ — یور بٹ گڈنو — یہ سارے الفاظ، اور سرشار جی کے نت نئے لطیفے جو وہ آکر سنایا کرتا تھا۔ یہ سب چیزیں اُسے یاد آئیں۔ جیسے یہ ایک بہت دُور کی، ایک دوسری دنیا کی بات تھی۔ وہ سارے گھر میں اِدھر اُدھر چلتی پھرتی رہی۔ ان برآمدوں میں، گھاس کے ان قطعوں پر، اس گیلری کے اندر، ان قالینوں پر وہ اَن گنت مرتبہ چلا پھرا تھا۔ ان کرسیوں پر بیٹھا تھا۔ اس زرد رنگ کے اسٹینڈرڈ لیمپ کے نیچے کھڑے ہو کر اُس نے لِسنر کے ورق پلٹے تھے۔

وہ سب زور زور سے باتیں کرتے اندر آ گئے۔ روشی ہم کل صبح صبح مچھلی کے شکار کے لئے یہاں سے چل رہے ہیں۔ ڈائمنڈ نے پیانو کے اسٹول پر چڑھ کر خبر سنائی۔ پھر وہ سب اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کسی صاحب بہادر کے ذکر میں دوبارہ بڑے انہماک سے مشغول ہو گئے جو چند روز بعد پی جو سے چارج لینے والے تھے۔ وہ صاحب بہادر ان صاحب بہادر کے چھوٹے بھائی تھے جن کی نارنجی مونچھوں پر پچھلے سال لالہ رخ میں انہوں نے قصیدہ کہا تھا۔ "پی جو کیا وہ بھی مونچھیں لگاتے ہیں؟" ڈائمنڈ نے شگفتگی سے پوچھا

"لگاتے ہیں کیا معنی بھر دیئے ہیں؟" پی جو نے بُرا مان کر کہا۔

"تم سب ہوتے ہی ہو بہروپیئے۔" ڈائمنڈ ہنسنے لگی۔ "ہر آدمی بہروپیا قسم خدا کی۔ کیوں کرن بھائی تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے پوچھا۔ کرن اور وہ سب ہل کر اور زور زور سے ہنسنے لگے۔ کیونکہ وہ سب بے حد رنجیدہ تھے اور چاہتے تھے کہ خواہ مخواہ کے لئے تھوڑی دیر خوش ہولیں۔ پی چو کا سامان ایک ہفتے سے پیک کیا جا رہا تھا اور اب کل صبح ریل سے روانہ کئے جانے کے لئے برآمدے کے ایک کونے میں چن دیا گیا تھا۔ اس کا گھوڑا پہلے سے فیض آباد پہنچا دیا گیا تھا اور وہاں سے اس کے ساتھ آگے روانہ ہونے والا تھا۔

"ارے بھئی اُستاد حفیظ۔" پی چو نے ایک ہولڈال پر بیٹھتے ہوئے پوچھا

"فرمائیے۔" حفیظ موٹر کے انجن پر جھکا ہوا تھا۔

"جہاں ہم لوگ پکنک کے لئے جا رہے ہیں۔ وہاں آس پاس کہیں ڈریسنگ روم مل سکے گا؟" پی چو نے بے حد سنجیدگی سے دریافت کیا

"ڈریسنگ روم؟" حفیظ نے انجن پر سے سر اُٹھا کر دُہرایا

"ہاں بھئی۔ اس لئے کہ ہر آدھ گھنٹے بعد ہماری یہ عزیز و محترم خواتین ڈریسنگ روم میں جا کر لپ اسٹک ٹھیک کرتی ہیں۔ یاد ہے پچھلی بار ملھوتر میں ان سب نے قدوائی صاحب کی کوٹھی کے ایک کمرے کو گرین روم بنا ڈالا تھا۔" پی چو نے کہا۔

"چپ رہو پی چو۔ تم سے کیا۔ تم لوگ بھی لگا لیا کرو لپ اسٹک۔ اگر اتنا جلتے ہو۔" رخشندہ نے ڈانٹا۔ بہت دنوں بعد وہ دونوں اس طرح باتیں کر رہے تھے۔

"ارے بھائی تمہارے ہی فائدے کی بات کہتا ہوں۔" اس نے کہا۔ پھر

وہ سب چائے کے لئے اندر چلے گئے اور دیر تک خوب ہنستے رہے۔

پی چو بھی آج خوش ہے۔ رخشندہ نے سوچا۔ وہ اتنی دور جا رہا ہے۔ لیکن کرسٹابل بھی جا رہی ہے۔ اسے کوئی اور نہیں چھین سکتا۔ وہ ہمیشہ اسی کا رہے گا۔ اس کا پیارا چہیتا بالکل جان کا ٹکڑا پی چو۔ کرسٹابل جا رہی ہے۔ کرسٹابل جا رہی ہے لیکن میں تو اس کی دوست ہوں۔ اُسے سمجھتی ہوں۔ مجھے اس کے جانے سے خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ ارے میں کہاں خوش ہوں بھائی۔ میں تو اتنی رنجیدہ ہوں۔ پی چو جا رہا ہے۔ سلیم چلا گیا۔ کرسٹابل جا رہی ہے۔ یہ سب اتنی ہنسی کی بات ہے۔

پھر رات گئے اُنہوں نے سفر کی تیاری کی۔ صبح منہ اندھیرے غفران منزل کے باغ میں ان کے سارے دوست آ کر جمع ہو گئے۔ انہوں نے انور اعظم اور اُس کے دوست جمیل کو مدعو کیا تھا۔ سارے ٹرک اور اسٹیشن ویگن اور موٹر ڈرائیو پر ایک قطار میں کھڑی کرنے کے بعد وہ سب جلدی جلدی چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ رخشندہ سفر کے لئے سبز سلیکس پہنے خوش خوش سب کی میزبانی کرتی پھر رہی تھی۔

چائے کی میز پر انہیں دفعتاً ڈائمنڈ کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔

"ارے ڈائمنڈ کہاں ہے؟" گنّی نے پوچھا

ڈائمنڈ نے گلیمر بوائے سے کہا تھا کہ آؤ گلیمر بوائے چل کر اکٹھے ڈون دیکھیں گے چنانچہ وہ دونوں باہر سیڑھیوں پر بیٹھے ڈون دیکھ رہے ہیں۔" وتّی نے بیحد مری ہوئی آواز میں مطلع کیا۔

"ڈون اتنی جلدی آجاتا ہے؟" فیروز نے توس کا سالم ٹکڑا منہ میں رکھتے

ہوئے پوچھا

" اور کیا اس وقت تو ہوتی ہے۔" ول نے جواب دیا

" اس وقت ہوتی ہے؟ کیا ہوتی ہے بھائی؟" پی چو نے اور بھی زیادہ تعجب سے پوچھا

" ڈون ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ عمر یونہی "۔۔۔ حفیظ نے شعر پڑھنا شروع کیا

" مگر یار اتنے سویرے "۔۔۔ فیروز نے پھر کہا۔

" ارے میاں ڈون اخبار نہیں طلوعِ سحر، اوشا، صبح کاذب اور کیسے بتاؤں اس کی فرینچ اور روسی مجھے نہیں آتی۔ اتنی دیر سے کہے جا رہا ہوں کہ ڈائمنڈ ڈون دیکھنے کے لئے باہر بیٹھی ہوئی ہے۔ کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔" ول نے بگڑ کر کہا

چاء کے بعد وہ سب گاڑیوں میں سوار ہونے لگے نورِ رخشندہ نے ڈائمنڈ کو پکڑا

" اب بتاؤ۔ یہ صریحاً فلرٹ کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ یعنی یہ کیا ادا تھی آپ کی کہ اکٹھے طلوعِ سحر دیکھیں گے؟ کیسا کیسا بیوقوف بنایا ہے لوگوں کو۔ غریب اس خنکی میں چاء کے بغیر باہر مر گیا ہوگا۔ اخلاقاً بیٹھا تمہاری ڈون دیکھتا رہا۔ ورنہ وہ اتنا لٹریری آدمی۔ اسے ڈون سون ان خرافات سے کیا؟" رخشندہ نے ڈانٹا۔

" ارے نہیں روشی ڈارلنگ"۔ ڈائمنڈ نے جواب دیا۔ "خنکی کی وجہ سے وہ اپنا گرم ڈریسنگ گاؤن پہنے تھا۔ اس قدر ہینڈسم رومینٹک لگ رہا تھا کہ کیا عرض کروں۔ دیکھو تو روشی۔ عموماً میں صبح آٹھ بجے سو کر اٹھتی ہوں۔ کبھی آج تک ڈون نہیں دیکھی تھی تو میں نے سوچا کہ آج تو اچھا خاصہ رت جگا ہو رہا ہے۔ لگے ہاتھوں اسے بھی دیکھتی چلوں۔ اس میں کیا ہرج تھا؟" اس نے کہا

وہ سب روانہ ہونے کے لئے برساتی میں آ گئے۔ پی چو کو رخصت کرنے کے لئے

عفران منزل کے سارے ملازمین اور مغلانیاں اور مہریاں موٹر کے پاس آکر جمع ہو گئیں
پی چو بھیا اتنی دُور چلے جا رہے ہیں۔ پی چو بھیا جانے کب لگ واپس آئیں۔ وہ
سب ایک دوسرے سے چپکے چپکے کہہ رہے تھے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ
سب پی چو بھیا کو اتنا چاہتے تھے۔

پی چو اندر سے کنور رانی کے امام ضامنوں میں لدا پھندا برآمد ہوا۔ وہ سب
موٹروں کی طرف گئے۔

"گڈ بائی ڈیئر ڈیئر پی چو" پوتو کے کتوں نے اس کی ٹانگوں میں لپٹتے ہوئے
انگریزی میں بھونک کر کہا۔

"جاؤ سدھارو بھیا۔ وہی مچھلی، امام ضامن کی ضامنی ایک ہزار پیدل
اور دو ہزار فرشتوں کی امانت میں دیا" برساتی میں آکر غرارے کا پائینچہ اڑستے ہوئے
عباسی خانم نے کہا۔

"وہی مچھلی بھیا" شعلہ پری اور گل شبو آگے آکر بولیں۔

"وہی مچھلی۔ وہی مچھلی" پی چو نے جلدی سے کہہ کر اطمینان دلایا اور کار میں
سوار ہو گیا۔

ساری موٹریں ایک کے بعد ایک پھاٹک کے باہر نکل آئیں۔

"یہ ٹھاٹھ ہیں سلیمان۔ لونڈیوں کے ساتھ بیٹھ کر طلوع سحر کا نظارہ کیا جاتا
ہے" جب وہ سب کاٹھ کے پل پر پہنچ گئے تو جمیل نے چپکے سے انور اعظم
سے کہا۔

"کیا باتیں کرتے ہو بھائی۔ ڈائمنڈ مجھے زبردستی پکڑ کر ڈون دکھانے لے گئی

تھی۔ ورنہ میرا ضمیر تو بالکل صاف ہے۔" اُس نے بے حد معصومیت اور خلوص دل کے ساتھ جواب دیا۔

" اماں جاؤ یار۔ نہ واللہ کیا بات کہی ہے۔ اماں ضمیر بھی کوئی میونسپلٹی کی ماہانہ رپورٹ ہے کہ شہر بھر کی سڑکیں بالکل صاف ہیں ۔۔ ہُنہہ۔ کیا معنی کہ آپ بالکل گونگے ہی رہے۔ کہتے ہیں استاد کہ ضمیر بالکل صاف ہے۔" جمیل نے اس سے کہا۔

وہ سب سیدھی خاموش فیض آباد روڈ پر سے گذرتے کر واہ راج کے ہرے بھرے علاقوں میں داخل ہو گئے۔ جہاں سے گھاگرا بل کھاتی گذرتی تھی اور فیض آباد چھاؤنی سے ذرا اوپرے اس سُرخ بجری والے راستے پر انہوں نے گاڑیاں روک دیں جس کے سرے پر لکھا تھا "یہ عام راستہ نہیں" اور زرد رنگ کی پُرانی کوٹھیاں جو عموماً بند پڑی رہتی تھیں اور جن میں کنور صاحب کبھی کبھی ادھر سے گذرتے ہوئے ایک آدھ دن کے لئے ٹھہر جاتے تھے، انہوں نے اپنا سارا سامان اُتارا۔ اور پھر سڑک کے پار ٹھاکر راجندر پرتاپ سنگھ سے ملنے کے بعد وہ بنسیاں اور ٹوکریاں سنبھال کر ندی کی طرف روانہ ہو گئے۔

" ارے یہ کتنی خوبصورت جگہ ہے"۔ کرسٹابل نے ساحل کی ڈھلوان پر بیٹھ کر کہا

" بالکل آسمانی"۔ ڈائمنڈ نے تائید کی۔

" ہاں واقعی یہ اتنی خوبصورت جگہ ہے نا"۔ گنتی نے چاروں طرف دیکھ کر گوگلز اتارتے ہوئے کہا۔ ان سب کے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ "ارے ہائے۔ یہ اتنا پُرسکون مقام ہے۔ چلو سیتاجی کی رسوئی دیکھنے چلیں"۔ وہ سب کشتی میں بیٹھتے ہوئے طے کر رہے تھے۔ روشنی کہتی تھی۔ "گنتی ڈارلنگ۔ کیوں اتنی رنجیدہ ہوتی ہو

تم تصویریں بنایا کرو۔ وہ ضرور تصویریں بنائے گی۔ وہ اس جگہ پر اس خوبصورت پس منظر کے ساتھ گلیبر بوائے کا پورٹریٹ بنائے گی۔ اسی ندی کے کنارے، اسی ریت پر اس گلیبر بوائے کی طرح خوبصورت، کبھی رام چندر جی بھی اسی طرح کھڑے ہوا کرتے ہوں گے۔ ارے وقت کتنی تیزی سے نکلتا ہے۔ ہم سب یہاں کھڑے ہیں اور پھر ایک آن میں صدیاں نکل جائیں گی جنہیں ہم صدیاں کہتے ہیں۔ ہم کبھی اتنے جوان نہ ہوں گے۔ دنیا کبھی اتنی خوبصورت نہ ہوگی۔ یہ وقت کی حماقت —" کیا تم اچھے سیٹر ہو گلیبر بوائے؟" اس نے بالوں کو پیشانی پر سے ہٹاتے ہوئے مڑکر انور اعظم سے پوچھا

"سیٹر —؟" اس نے ذرا پریشان ہو کر پوچھا۔ "جی ہاں یہ میری کار ٹو سیٹر ہے۔"

"ارے نہیں بھئی۔" گنّی نے کہا "میرا مطلب ہے تم ایک پورٹریٹ کے واسطے روز ایک گھنٹہ میرے لئے بیٹھو۔"

"تمہارے لئے بیٹھوں؟" اس نے اور بھی زیادہ پریشان ہو کر پوچھا

"ہاں ہاں بھئی۔ بس تم تخت پر بیٹھے رہنا۔ میں تمہارے لئے ریڈیو بھی لگا دونگی"

گنّی نے اسے اطمینان دلایا (یہ ہندوستان ہے بھائی جالینوس۔ اسے یاد آیا کہ رخشندہ بڑی سنجیدگی سے سر ہلا کر سلیم سے کہا کرتی تھی۔ "یہ ہندوستان ہے۔ یہاں ہم کو ماڈل کے لئے کوئی نہیں ملتا۔ محض تصوّر پر اکتفا کرنا پڑتا ہے اور اگر کہیں سے کوئی سچ مچ کا انسان مل جائے تو بس سمجھ لو ہمارے فنکاروں کی عید ہو گئی۔ بچارے جالینوس کو ان سب کے ساتھ رہ کر ہر وقت آرٹ اور لٹریچر اور سیاسیات پر کتنے لیکچر سُننے پڑتے تھے۔ جانے اس وقت وہ کہاں ہوگا۔ کیا کر رہا ہوگا۔ ہائے بھگوان

یہ سب کتنی حماقت کی بات ہے)

دن بھر انہوں نے ادھر اُدھر کنجوں میں پھرنے میں گذارا اور دن بھر بھاکر راجندر پرتاپ سنگھ کے پرانے مندر کا گلابی جھنڈا پھوا ہوا میں لہراتا رہا اور کوئلیں چلاتی رہیں۔ پھر وہ سب تھک کر دریا کے پرانی کشتیوں کے پل پر جا بیٹھے۔ پی چہ پانی میں پاؤں لٹکاکر بیٹھ گیا۔ فیروزا ایک طرف کو پل کے تختوں پر لیٹا اطمینان سے قیلولہ کرتا رہا۔ کرسٹابل "ٹروپیکل میجک" کئی بار گا کر اکتا گئی۔ کرن بجن کی "مدھوشالہ" سناتے سناتے تھک گیا۔ سب خاموش ہو گئے

"چلو" اولڈ فوکس ایٹ ہوم" گائیں گے"۔ پل کے سرے پر سے ڈائمنڈ نے پکارا۔ پھر سب لڑکیاں مل کر یہ غمگین گیت گانے لگیں۔ وہ گیت جو انہوں نے کالج کی یونِن فائر کے گرد ناچتے ہوئے، چاندنی راتوں میں یوکلپٹس کے جنگل میں گھومتے ہوئے کالج کی کرسمس اور اسپورٹس ڈے کی سالانہ ضیافتوں کے بعد ڈائیننگ ہال میں شور مچاتے ہوئے پیانو مینڈولین اور گٹار کے ساتھ اَن گنت مرتبہ گایا تھا اور ہر مرتبہ اس گیت کو گاتے یا سنتے ہوئے زندگی کے حسن اور غم کا ایک نیا، بے حد شدید، بڑا تکلیف دہ احساس پیدا ہوتا تھا۔ یہ گیت ان کے کالج کا مقبول ترین "کمیونٹی کا گانا" رہ چکا تھا۔ اس سے اتنی ساری یادیں وابستہ تھیں

دُور بہت دُور، سوانی دریا پہ، میرا دل ہمیشہ وہیں جانا چاہتا ہے۔ ساری دُنیا اتنی افسردہ اور تھکی ہاری ہے۔ میں ہر جگہ گھومتا ہوں۔ ارے میرے پیارے حبشی بھائیو۔ میرا دل بے حد، بے حد رنجیدہ ہے اور میں اپنے گھر کے پیارے لوگوں سے بہت دور ہوں"۔۔۔ چند لمحات تک وہ سب خاموش بیٹھے لہروں کو تکتے

رہے۔ پھر فیروز کے ایک لطیفے نے سب کو ہنسا دیا۔ شام ہو رہی تھی۔ وہ سب اکٹھے کے جھنڈ میں سے گذرتے کوٹھی کی طرف واپس آ گئے۔

رات کے کھانے کے بعد وہ سب نشست کے کمرے میں آ بیٹھے اور اوٹ پٹانگ اور شور مچانے والے کھیلوں میں مصروف ہو گئے۔ پھر رخشندہ نے تجویز کیا کہ "ہز میجسٹی اور ہر میجسٹی" کھیلا جائے۔ اس تجویز کا بہت زوردار تالیوں سے اتفاق کیا گیا۔ یہ ان سب کا بہت پسندیدہ کھیل تھا۔ ایک خاتون کو ہر میجسٹی اور ایک بزرگوار کو ہز میجسٹی فرض کر کے کمرے یا برآمدے کے سرے پر بٹھا دیا جاتا۔ ان کے قریب ایک نیچی سی کرسی یا اسٹول پر چانسلر آف ایکسچیکر رونق افروز ہوتے۔ پھر دو مخالف کیمپ بنتے اور ہر کیمپ کا ایک ایک کپتان چنا جاتا۔ پھر چانسلر آف ایکسچیکر ملکہ معظمہ سے کچھ پوچھتے یا بادشاہ سلامت ان کے کان میں کچھ کہہ دیتے اور پھر چانسلر صاحب دونوں کیمپوں کو مخاطب کر کے مطالبہ فرماتے۔ ہز میجسٹی کو زکام ہو رہا ہے۔ انہیں ایک ریشمیں لیڈیز کرچیف چاہیئے یا ہر میجسٹی براؤن سوئیڈ کے جوتے یا سرخ رنگ کی ٹائی پہننے کی شدید تمنا اس وقت اپنے دل میں رکھتے ہیں اور پھر قیامت بپا ہو جاتی جو کیپٹن اپنے کیمپ میں سے سب سے پہلے مطلوبہ چیز حاصل کر کے اور دوڑ بھاگ مچا کے چانسلر صاحب تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کا کیمپ ایک پوائنٹ حاصل کرتا۔ بعض دفعہ بڑی زوردار فرمائشیں کی جاتیں مثلاً ہز میجسٹی فی الحال سائیکل چلانا چاہتے ہیں اور یہ سنتے ہی مخالف کیمپوں کے سورما سیڑھیوں پر سے کودتے، گملے پھلانگتے کہیں نہ کہیں سے سائیکلیں لا کر پیش کر دیتے۔ اس وقت ہز میجسٹی نے چپکے سے چانسلر سے ارشاد کیا کہ ان کی

شدید خواہش ہے کہ اپنے شوہر محترم کو ایک نئی المونیم کی دیگچی دیں۔ تلاش شروع ہوئی پی چو فوراً باغ کی جھاڑیاں پھلانگتا اپنے کیمپ کے دو بہادروں کو لے کر سڑک کے پار بھاگ کر راجندر پرتاپ سنگھ کے ہاں پہنچ گیا اور وہاں سے ایک دیگچی اٹھا لایا۔

تالیوں کے شور سے کمرہ گونج اٹھا۔ یہ دیکھ کر بادشاہ و ملکہ نے زیادہ مشکل قسم کی فرمائشیں شروع کیں۔ ہز میجسٹی نے چانسلر صاحب سے کہا۔ انہیں تلسی کے پودے کا گملہ چاہئے۔ خیال رہے۔ تلسی کے پودے کا گملہ۔ ایسے تو باغ میں بیسیوں طرح کے جھاڑ جھنکاڑ پودوں کے گملے پڑے ہیں۔ دیکھیں کون سا کیمپ تلسی کا گملہ پہلے ڈھونڈ کر لاتا ہے۔

چانسلر صاحب کا اعلان سن کر دونوں فوجیں انتہائی سرعت سے باہر پہنچ گئیں اور تلسی کے گملے کی تلاش میں وہ سب باغ کے اندھیرے میں ادھر ادھر بکھر گئے۔

پی چو اپنے ایک سپاہی کو آواز دیتا ہوا سڑک پر بھاگا جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر احاطے کی شکستہ دیوار کے پرے کی نشیب میں سے کرسٹابل چلائی "ارے کیپٹن جلدی آؤ۔۔۔ جلدی سے یہ گملہ اٹھا لو۔۔۔ یہ رہا" اندھیرے میں اپنی فوج کے سپاہیوں کو کھوجتا وہ دوسری طرف نکل گیا تھا۔ کرسٹابل کی آواز سن کر تیزی سے دیوار کے نزدیک پہنچا۔ کرسٹابل کھیل اور دوڑ بھاگ کے اکسائیٹمنٹ اور گملہ اٹھا کر واپس برآمدے تک پہنچنے کے لئے اس سے سبقت کرنے کے جوش میں جلدی سے گملے کی طرف دوڑی۔ وہ بھی دیوار پر سے احاطے کی نشیب میں کود گیا۔ ہوائیں بےکلجنت سیٹیاں بجاتے لگیں

اور پھر یہ ہوا کہ وہاں پر، اس آسمان کے تلملاتے ستاروں کے نیچے، جبکہ گھاگرا کے کنارے تیز ہوائیں سنسنا رہی تھیں اور چاروں طرف اندھیرے جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ اُس نے کرسٹابل حفیظ احمد کو دفعتاً اس طرح اٹھا لیا جیسے وہ چوبیس سالہ لڑکی نہیں بلکہ پورٹیبل ریمنگٹن ٹائپ رائٹر یا کوئی اٹیچی کیس تھی۔

ہوائیں بند ہو گئیں۔ آسمانوں میں ستاروں کی آگ شدت سے سُلگ اُٹھی۔ کرۂ زمین تیزی سے گھومنے لگا۔

"پی چُو"۔۔۔ وہ چلائی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں انتہائی شدید غم و غصّے کی وجہ سے آنسو آ گئے اور آواز اُس کے گلے سے نہ نکل سکی۔ اُس نے کملہ زور سے دیوار کے نیچے کھائی میں پھینک دیا اور اُس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

"پی چُو"۔۔۔ دیوار پر سے رخشندہ کی آواز تیر کی طرح سنسناتی ہوئی اس کے قریب پہنچی۔ وہ مڑا اور اس نے دیکھا کہ رخشندہ، اس کی اپنی بہن، ازلی مثلث کا وہ تیسرا کونہ، دیوار پہ مدھم چاند کے مقابل میں اس کے سامنے بالکل ساکت و ساکت کھڑی تھی۔۔۔

"پی چُو"۔۔۔ رخشندہ نے دوبارہ چلّانا چاہا۔ لیکن اس کا دل بالکل بیٹھ گیا۔ بالکل بیٹھ گیا۔ وہ وہیں دیوار پر سے گر کر مر جاتی تو اتنا اچھا ہوتا۔ کرسٹابل بھی مر جاتی۔ سب مر جاتے۔ لیکن وہ سب زندہ تھے اور ہوائیں تیزی سے سنسنا رہی تھیں اور وہ سب اندر کمرے میں "ہز میجسٹی اینڈ ہز میجسٹی" کھیل رہے تھے اور اس کے پوائنٹس کا حساب لگانے میں مصروف تھے۔

کرسٹابل گملہ پھینک کر بے پرواہی سے قدم رکھتی کمرے میں آکر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اُس کے ہاتھوں میں جو مٹی لگ گئی تھی۔ اسے رومال سے صاف کرنے میں مشغول ہوگئی۔

پھر پی چو کمرے میں داخل ہوا اور کمرے کے وسط میں بغلوں میں ہاتھ دے کر فوجی انداز سے ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہوگیا اور غور سے سب کو دیکھنے لگا۔ اس کے خوبصورت بال پریشان تھے اور اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ کھیل بند ہوگیا۔ سب مبہوت ہوکر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ دفعتہً کمرے میں مکمل خاموشی طاری ہوگئی اور سب کی نظریں حفیظ احمد پر پڑیں جس نے اسی وقت جیب میں سے وسکیں کی شیشی نکالی تھی۔ اُس نے بڑے دکھ سے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا جس پر پسینے کے قطرے بکھر گئے تھے۔ "تم سب مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔ کیا تمہیں میری پیشانی پر سینگ نظر آرہے ہیں؟" اس کی گہری اور صاف آواز کمرے میں گونجی۔ سب خاموش رہے۔

"چپ رہو حفیظ احمد" پی چو اسی طرح دروازے کے سامنے کھڑے غرّایا

"میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں بھائی۔ تم میرے دوست ہو۔ اور میرے مہمان ہو" اسی صاف، گہری رنجیدہ آواز میں حفیظ احمد نے کہا۔

"میں تمہارا دوست نہیں ہوں۔ میں کسی کا دوست نہیں ہوں اور میں تمہارا مہمان بھی نہیں ہوں۔ میں ابھی ابھی ہمیشہ کے لئے یہاں سے جا رہا ہوں۔ تم سب پر خدا کی لعنت ہو" وہ چلایا اور تیز تیز قدم رکھتا کمرے سے باہر چلا گیا۔

رگنتی یہ باتیں سُن کر قریب قریب بیہوش ہوگئی۔ رخشندہ چپ چاپ بیٹھی آنکھیں پھیلائے یہ سب دیکھتی رہی۔ ڈائمنڈ نے چپکے سے کہا "اوگوش اتنا فنٹاسٹک بالکل جیسے کسی وائیلڈ ویسٹ فلم کا سین"۔ کرسٹابل نے کشن پر سر رکھ دیا۔ یہ سب اتنی شدید حماقت تھی۔ وہ سب آہستہ آہستہ اپنے اپنے کمروں کی طرف جانے لگے۔ سب سے آخر میں حفیظ احمد اُٹھا۔ اس کا جی چاہا حسب عادت وہ اس سے کہے کرسٹی چلو اب ہم بھی اُٹھیں۔ جیسے وہ ہمیشہ اپنی پارٹیوں کے بعد کہا کرتے تھے۔ لیکن یہ پیارا لفظ 'ہم' کہیں دُور کھو گیا۔ وہ بھاری بھاری قدم رکھتا باہر باغ کی طرف چلا گیا۔

پی چو کمرے میں سے نکل کر زور زور سے پیر پٹختا تیزی سے اصطبلوں کی طرف پہنچا۔ ستارہ سحری اپنے آقا کو یوں بیوقت اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر خوشی سے ہنہنانے لگا۔ اس نے ستارہ سحری کی مغرور گردن پر تھپکی دی۔ تم تو میرا ساتھ دوگے؟ کیوں کامریڈ؟ ستارہ سحری نے بڑے لاڈ سے اپنا منہ ہلایا۔ اُس نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ وہ لوگ تو اسے واپس بلانے کے لئے نہیں آرہے ہیں۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر اصطبل کے پچھواڑے سے منڈیر پھلانگ کر پچھلی طویل سڑک پر سے گذرتا جنگل کی سمت نکل گیا۔

نشست کے کمرے میں واپس آکر انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ "ارے پی چو کہاں گیا؟" وہ سب پریشان ہو کر چلائے۔ انہوں نے موٹروں کی طرف جا کر دیکھا۔ ساری موٹریں اور ٹرک درختوں کے نیچے سکون سے کھڑے تھے۔ انہوں نے پرانی، اندھیری کوٹھی کے سارے کمرے چھان ڈالے۔ انہوں نے باغ کے ایک

ایک گوشے میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ رات گہری ہوتی گئی۔

وہ سیدھی سڑک پر بہت تیزی سے جا رہا تھا۔ آم کے کنجوں میں چھپی ہوئی وہ زرد کوٹھی اور اس میں جمع وہ سارے لوگ اس کے بہت پیچھے، بہت دور رہ گئے تھے۔ کول تار کی سڑک کی چکنی سطح پر پڑتی ہوئی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز فضا میں گونجتی جا رہی تھی۔ مدھم چاندنی میں حدِ نظر تک پھیلے ہوئے جنگل سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ اسٹیشن ابھی بہت دُور تھا۔ فاصلہ کم کرنے کے لئے اُس نے گھوڑے کو برابر کی ایک پگڈنڈی پر ڈال دیا جس کے دونوں طرف کھائی تھی کھائی کو پھلانگتے ہوئے ستارہ سحری اپنی برق رفتاری کے زور میں ببلیا کی اونچی دیوار سے جا ٹکرایا۔ پی چو بے ہوش ہو کر نیچے پگڈنڈی پر گر گیا۔

ہوائیں اس کے چاروں طرف منڈلا کر رونی رہیں جنگل اور ویران کھیت گہرے گہرے دہشتناک سانس لینے لگے۔

"ستانم نے میری جان"۔ کوئین روز کہہ رہی تھی سلیم کمرے میں ٹہلتا رہا۔ ہوا کے ایک جھونکے سے کھڑکی کے پٹ زور سے کھل گئے۔ باہر رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور ایکھ کے کھیتوں کے پرے اس زرد رنگ کی پرانی کوٹھی میں تیز روشنی ہو رہی تھی اس کے آگے بہت سی موٹریں کھڑی تھیں۔ بہت سے سائے اندر اور باہر آ جا رہے تھے اور رات کے مکمل سناٹے میں دور سے ہنسی اور قہقہوں کا بہت مدھم شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ سب وہاں پکنک منانے آئے تھے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ان کے اتنے قریب موجود ہے۔ ورنہ یقیناً وہ سب ٹولیاں

بنا کر قہقہے لگاتے ریسٹ ہاؤس تک پہنچ جاتے اور اُسے وہاں سے کھینچ کر اپنے ساتھ لے جانے پر مُصر ہونے۔ وہاں وُہ بھی ہوگی۔ وہ بھی ہوگی۔ وُہ بھی ان سب کے ساتھ قہقہے لگاتی کسی اپنے پسندیدہ اوٹ پٹانگ سے کھیل کو اورگنائز کرنے میں مصروف ہوگی۔ ان کے ہاں ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ وہاں گلیمر بوائے بھی ہوگا وہ سب ہوں گے۔ جبکہ وُہ، وہ خود ان سب سے اتنے قریب موجود تھا۔ سامنے امرودوں کے جھرمٹ میں رکھوالے نے خشک پتّے جمع کر کے انہیں آگ دکھا دی۔ تیزی سے بلند ہوتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں باغ کی چڑیاں جاگ اُٹھیں اور شور مچا مچا کر چاروں طرف اڑنے لگیں۔ وہ کھڑکی میں سے ہٹ گیا۔

"سنا تم نے میری جان"۔ وہ بھورے بالوں والی لڑکی جو اس کے سامنے صوفے پر ٹانگیں اوپر رکھے بیٹھی تھی۔ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی" پپا بیمار ہے۔ مما کے پاؤں کی تکلیف زیادہ ہو گئی ہے۔ جمّی کو نیوی کے انٹرویو کے لئے جانا ہے۔ مجھے ایک چک اور دے دو گے ڈارلنگ؟ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں"۔ اُس نے آہستہ آہستہ کہا۔" کہ ۔ کہ ۔" اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر سُرخ ہو گیا جس کی وہ کبھی عادی نہ تھی۔ " کہ جب جمّی کو نیوی سے تنخواہ ملنے لگے گی تو میں تمہارا سارا روپیہ واپس کر دوں گی۔ تم" اس کی آواز میں آنسو تھے اور خلوص تھا اور صداقت تھی۔

لیکن یہ سب اس وقت اس نے محسوس نہیں کیا۔ وہ ایک لمحے کے لئے کمرے کے وسط میں بالکل ساکت و سامت کھڑا رہا۔" اچھا ۔ یہ بات ہے" ۔ اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا اور چک بک فرش پر پھینک کے وہ دفعتاً بہت شکستہ، بہت تھکا ہارا کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ اسے انسانوں کی ان حماقتوں پر ہنسی بھی نہیں آئی۔ وہ صوفے پر سے جھک کر اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں کھولے اس سبز رنگ کی چھوٹی سی کتاب کو دیکھتی رہی جو اس کے قریب فرش پر الٹی کھلی پڑی تھی اور کھڑکیوں میں سے اندر آنے والی ہوا کے جھونکوں میں اس کے ورق سرسرا رہے تھے۔ امپیریل بنک۔ الہ آباد بنک۔ بھارت بنک۔ وہ اور ادو آئی، سید افتخار اور حمت اللہ کرشن نرائن کول آئی۔ سی۔ ایس اور ممبئی کا ٹیکسٹائل کمشنر، ان سب کے درمیان یہ ہرے اوراق یونہی سرسراتے رہتے تھے۔ یونہی سرسراتے رہیں گے۔

پھر یکلخت وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رات کا سناٹا زیادہ شدید ہو گیا۔ باہر امرودوں کے باغ کا الاؤ بجھ چکا تھا اور اس وجہ سے تاریکی پہلے سے زیادہ گہری معلوم ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ صوفے پر سے اٹھی۔ آئینے کے سامنے جا کر اس نے اپنی بھیگی ہوئی پلکیں خشک کیں اور ناک پر ہلکا سا پوڈر لگایا۔ پھر وہ باہر آئی۔

ریسٹ ہاؤس بالکل سنسان پڑا تھا۔ چاروں طرف جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ایکھ کے کھیتوں کے اس پار، وہ زرد رنگ کی کوٹھی بالکل تاریک تھی۔ وہ امرودوں کے جھنڈ میں سے نکل کر سڑک پر آگئی اور اس نے دیکھا کہ موٹر خانہ خالی پڑا ہے۔

ڈھلوان کے نیچے گھاگرا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ وہ سڑک پر چلتی رہی۔ اسے اسٹیشن کی طرف کا راستہ یاد تھا۔ لیکن چلتے چلتے اُس کے پیر تھک گئے۔ جب پاپا ای۔ آئی۔ آر کا انجن چلاتا تھا اور وہ سب خوش باش، ریلوے کولونی کے چھوٹے سے گھر میں پُر مسرت زندگی گذارتے تھے اور وہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ تب وہ جھاڑی پانی سے مسوری اور راجپور تک اپنی اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ پیدل آجایا کرتی تھی لیکن

اب اس کے پیر صرف گھنگھروؤں اور کیبرے کی نازک سینڈلوں کے عادی تھے۔ اس لئے وُہ بہت جلد تھک گئی۔ لیکن رات بہت سنسان ہوتی جا رہی تھی۔ اور اسے ڈر لگ رہا تھا۔ اس لئے وہ تیز تیز قدم رکھتی اسٹیشن کی طرف بڑھتی گئی۔
یہ سب ہمیشہ اتنی قربانی، اتنی بے غرضی چاہتے ہیں۔ ان کے لئے بس مر جاؤ تب ہی خوش ہوں گے۔ ویسے وہ کسی حالت میں خوش اور مطمئن کبھی قانع نہیں ہوتے جیسے دریا کے اندر اگنے والے نرم، ٹھنڈے، ہرے پودوں کو پانی کے ریلے کے زور کی وجہ سے ہمیشہ جھکا رہنا پڑتا ہے۔ وہ پانی کی سطح کے اوپر کبھی نہیں نکل سکتے۔ ندی کا تیز دھارا انہیں ہمیشہ جھکائے رکھتا ہے۔ وُہ سڑک پر چلتی رہی۔ عورت دُنیا کو پُر مسرت، روشن، خوشگوار بنانے کی ذمہ داری سنبھالتی ہے۔ لیکن آخر میں وہ کسی کو خوش نہیں کر پاتی۔ کائنات کو پُرمسرّت بنانے کی ذمہ داری خدائے قدّوس نے اس کے شانوں پر ڈال دی ہے۔ لیکن اسے بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ سب غلط ہے اور بیکار ہے۔ وہ سب اس سے اتنی توقعات رکھتے ہیں۔ اتنے مطالبات چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے لئے وہ اپنے آپ کو بالکل ختم کر دے سمندری پودوں کی طرح طوفان کے ریلے میں بالکل جھک جائے۔
وہ چلتے چلتے تھک کر سڑک کے کنارے آخری سنگ میل پر بیٹھ کر پیچھے دیکھنے لگی۔ وہ راستہ بہت طویل تھا جس پر سے وہ آئی تھی۔ اسے ابھی بہت دُور اور آگے جانا تھا۔ اس دنیا کو واپس جانا تھا۔ جہاں آئیوی کورٹ تھا اور اداوانی کا گرین روم تھا اور جم تھا۔ اس سے آگے وُہ کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ کسی کو خوش نہیں کر سکتی اس وقت اس نے سنگ میل پر بیٹھے بیٹھے سوچا کہ پھر بھی وُہ یقیناً یہ دیکھنے کی کوشش

کرے گی کہ آگے کیا ہے۔ وہ ہمیشہ سے یہ دیکھنے کی کوشش کرتی آئی تھی کہ آگے کیا ہے۔ لیکن آگے اسے ہمیشہ وہی خلا نظر آیا۔ اس خلا میں رُوح القدس کا دھواں نہ تھا۔ اس نے ہمیشہ آگے دیکھا اور سب کو بتایا کہ آگے زندگی ہے۔ لیکن آگے اندھیرا تھا اور شکست تھی اور موت تھی۔ وہ پھر پتھر پر سے اُٹھی اور ٹارچ سنبھال کر اسٹیشن کے سنسان راستے کی سمت بڑھنا شروع کیا اور چلتے چلتے سڑک کے کنارے ایک کھائی کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے اپنی نیلی آنکھیں پوری طرح سے کھول کر تاریکی میں غور سے دیکھا

اُس نے دیکھا کہ ایک انسان پگڈنڈی کے کنارے آنکھیں بند کئے پڑا ہے اس کے سُرخ ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور خود رو پھولوں کے پودے چاروں طرف سے اس پر جھکے ہوئے تھے اور اس کا گھوڑا نالے کے کنارے پڑا دم توڑ رہا تھا۔

"ہولی میری"۔۔۔ آہستہ سے اس کے مُنہ سے نکلا۔ اپنا پرس گھاس پر ایک طرف کو ڈال کر وہ اس پر جھک گئی۔

"تم کون ہو"۔۔۔ پی چو نے بڑی تکلیف سے آنکھیں کھول کر پوچھا

"تم مجھے جانتے ہو" اس نے آہستہ سے کہا اور گھاس پر سے اُسے اٹھانے کی کوشش کی۔

"میں تمہیں نہیں جانتا۔ میں کسی کو نہیں جانتا۔ کسی کو نہیں جانتا" اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"نہیں۔ تم اسے جانتے ہو"۔۔۔ ہواؤں نے سرگوشیوں میں کہا "تم اسے جانتے ہو

یہ زندگی ہے۔ یہ موت ہے۔ تم اسے جانتے ہو۔ ہوائیں تاریک فضا میں ان کے چاروں طرف منڈلاتی رہیں۔

سندیلے کے چودھری شمیم اپنی پرانی فورڈ کھڑکھڑاتے غفران منزل پہنچے۔

"کیا نام کہ سنا چودھرائن کیا غضب ہوا۔" انہوں نے پچھلے برآمدے میں داخل ہو کر ہیٹ ایک طرف کو پھینکتے ہوئے کنور رانی سے کہا جو ظہر کی نماز کے بعد گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی دعا مے مشغول ہیں مصروف تھیں۔

"اے ہے خیریت تو ہے۔ میرے بچے سب اتنی تیزی سے موٹر چلاتے ہیں۔ اتنی دور گاؤں میں خاک اڑاتے پھر رہے ہیں۔ وہیں سے آ رہے ہو؟" انہوں نے جلدی سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے گھبرا کر کہا۔

"اجی وہاں تو سب خیریت ہی خیریت ہوگی۔ میں تو امبرلو پر ہاؤس کا قصہ سنانے آیا ہوں آپ کو۔" چودھری شمیم نے اطمینان سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا

"کیا ہوا انور میاں کے دشمنوں کو تو کچھ نہیں ہو گیا۔ ارے بھیا جلدی کہو کیا بات ہے؟"

"اجی انور میاں تو ضرورت سے زیادہ خیریت سے ہیں۔ چھوٹے راجہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔"

"ہے ہے۔ انور میاں کے والد کا انتقال ہو گیا؟"

"جی ہاں آج صبح یکلخت ہارٹ فیل سے جناب انتقال فرما گئے اور یہ بالکل نہیں سوچا کہ یہ جو میں بیٹھے بٹھائے خواہی نخواہی راہی ملکِ عدم ہو رہا ہوں۔ تو باوا جان کی زندگی ہی میں میرے لڑھک جانے سے انور محجوب الارث ہو جائے گا"

"ہنتی ہنی" ۔ کنور رانی کے ہاتھوں سے خاکِ شفا کی تسبیح جو وہ کربلائے معلّےٰ سے لائی نفیس چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ "بھیا یہ کیا غضب ہوا؟" انہوں نے کہا

"جی جناب۔ اور ابھی ریاست کے اتنے حقدار موجود ہیں۔ ماشا اللہ سے پی چو میاں کی دُلہن جمیلہ بیگم کے تینوں بھائی اور سب کی آپس میں اور انور میاں سے مقدمے بازیاں رہتی ہیں۔"

"ارے تمہارے منہ میں گھی شکر بھیا اللہ وہ دن تو لادے کہ جمیلہ بیگم پی چو میاں کی دُلہن کہلا دیں"۔ کنور رانی نے تسبیح اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو اب اس انور اعظم کے مسئلے کا کیا کیجئے گا؟" انہوں نے پوچھا

"اے بھیا ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک تو خدا خدا کر کے بٹیا نے ان کے لئے ہاں کی تھی تو لے کے ان کے بابا مر گئے"۔

"جی ہاں"۔ چودھری شمیم نے بھی نہایت غمناک شکل بنا کر کہا۔

"ویسے انور میاں خود کیا کرتے ہیں؟"

"لوفری کرتے ہیں"۔

"اے ہٹو بھیا۔ لوفری نگوڑی پر جھاڑو پھرے، کون نہیں کرتا۔ ویسے کوئی ان کا اور سلسلہ بھی ہے۔ یعنی دادا کی ریاست سے علیحدہ؟"

"چودھرائن کی باتیں۔ اجی کہاں کی ریاست، چودھرائن۔ ان کے والد کے نام کا علاقہ پچیس برس سے کورٹ آف وارڈز میں ہے۔ عمر ساری انہوں نے گھوڑ دوڑ اور ریس کا نام لیجئے رفلش میں گذاری، خدا ان کی روح کو نہ شرماوے اور اب صاحبزادے بلند اقبال کے اطوار بھی یہی نظر آتے ہیں ۔"

"تو پھر اب میں کیا کروں بھائی تمہیں بتاؤ۔ میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑے جاتے ہیں"۔ کنور رانی نے پریشان ہو کر کہا۔

"کیا عرض کروں۔ کوئی اور رشتہ نظر میں ہو تو اس کی فکر کیجئے۔ بٹیا کب تلک یونہی کیا نام کہ پکنکوں اور پارٹیوں میں گھومتی رہیں گی"۔

"ٹھیک ہے بھیّا۔ اب تو مولا مشکل کشا ہی میں مدد فرماویں گے۔ اے گل شبّو"۔ انہوں نے آواز دی۔ "کیا دونوں موٹریں بھیا گاؤں لے گئے ہیں؟ اچھا لالہ سے کہو جوڑی جتوا دیں۔ مجھے خیال ہی نہ رہا تھا۔ شبوں کا پہلا روز گذرا جاتا ہے۔ میں ذرا ایک دو گھڑی دن رہے سے درگاہ جناب عباسؓ ہو آؤں"۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

مہریاں درگاہ حضرت عباس علمدارؓ تک جانے کے لئے سرگرمی سے تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔ لالہ اقبال نرائن جوڑی جتوا کر پچھلے دالان تک لے آئے۔

چودھری شمیم ہیٹ لئے برآمدے میں ادھر سے اُدھر ٹہلا کئے۔ اس گو کھے چھوٹے راجہ کو بھی واللہ خوب ہی موقعے پہ لڑھکنے کی سوجھی۔ انہوں نے سوچا۔ یار خاں بھی اب ایسا لمکپا ماریں گے کہ سب کو عمر بھر یاد رہے گا۔ مولانا انور اب آپ تو خشکا کھائیے۔ ستّو نوش کیجیے۔

"اے ہے۔ یہ ساری موٹریں اتنی جلدی گاؤں سے کیسے واپس چلی آرہی ہیں"۔ گل شبّو کرکری خانے میں سے نکل کر دفعتہً چلائی۔ چودھری شمیم باہر کی طرف لپکے برساتی میں بھیّا اور بٹیا کے ساتھیوں کی موٹریں آن رکیں۔ ان کے دوستوں

چہروں کے رنگ سفید تھے۔ یکلخت گھر بھر میں موت کا سا سناٹا طاری ہو گیا

کنگ جارجز میڈیکل کالج کے شاندار اور خوبصورت اسٹیوڈنٹس وارڈ میں ہمیشہ کی طرح ٹھاٹھ ہو رہے تھے۔ خوش شکل، سفید فام نوجوان نرسیں کھٹ پٹ کرتی مسکراہٹیں بکھیرتی، سرعت سے کوریڈرز میں سے ادھر اُدھر آجا رہی تھیں۔ گراموفون پر فلموں کے نئے نئے ریکارڈ بجائے جا رہے تھے۔ برج اڑ رہا تھا تازہ پھلوں کی ٹوکریاں دریچوں میں رکھی تھیں۔ کوریڈور کی دوسری طرف لڑکیوں کے وارڈ میں ازابلا تھوبرن کالج اور یونیورسٹی کی بظاہر مریض لڑکیاں اپنے خوبصورت ڈریسنگ گاؤن اور ہاؤس کوٹ پہنے آرام کرسیوں پر بیٹھی میڈیکل کالج کی لڑکیوں سے گپ اڑا رہی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد میڈیکل کالج کے چند خاص خاص ڈون جوان، آخری سال کے طالب علم یا نئے نئے ڈاکٹر اپنے حسن اور شوخی اور ہر دلعزیزی کی شہرت اور روایات کو برقرار رکھنے کے لئے لیڈی اسٹیوڈنٹس وارڈ کا افیشیل چکر لگا جاتے تھے اور انہیں بخار کا حال بتا کر یا ان سے انجکشن لگوا کے گویا لڑکیوں کی ہوسٹل سے میڈیکل کالج تک آنے کی ساری محنت سوارت ہو جاتی تھی۔ بڑا بشاش، تر و تازہ، صحت مند ماحول تھا۔ مرتا ہوا انسان بھی وہاں آکر اچھا ہو جاتا۔ اسی نسخے کو مدِّنظر رکھ کے یونیورسٹی کے طالب علم خواہ مخواہ میں جب آرام کرنے اور دن بھر برج کھیلنے کو جی چاہتا تھا تو آکر سٹیوڈنٹس وارڈ کی چند روزہ جنت میں داخل ہو جاتے تھے۔

سامنے کے بڑے پورٹیکو میں غفران منزل کی کار نہایت تیزی سے آن کر رُکی اور اس میں سے انز کے رخشندہ جلدی سے گھاس کے وسیع قطعے اور برآمدے

طے کرتی ہوئی اسٹیوڈنٹس وارڈ کی طرف گئی۔ گیلری میں جا کر اس نے آئی۔ ٹی۔ کالج کی ایک لڑکی سے پوچھا کہ مس کومل یا کوئی اور نواسے ابھی پوچھتا ہوا ادھر نہیں آیا تھا لڑکی نے بتایا کہ ایک مس مک گریگر اسے پوچھ کر ابھی آگے گئی ہیں۔ "مس مک گریگر؟ اچھا۔ شکریہ"۔ وہ جلدی سے سیڑھیاں اتر کر پھر کار کی طرف گئی اور یوروپین وارڈ کی سمت لے جا کر کار کو ایک درخت کے سائے میں کھڑا کر دیا۔ اس نے باہر سے دیکھا۔ پی جو کے کمرے کے دریچے میں کوئی نہ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ گیلری میں گئی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔

"وہ اب تک ہوش میں نہیں آیا۔ وہ اب تک چلا رہا ہے کہ میرے سامنے کسی کو نہ آنے دو"۔ کسی نے پیچھے سے آ کر بہت نرم اور شیریں آواز میں آہستہ سے اس سے کہا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہی بھورے بالوں والی اینگلو انڈین لڑکی اس کے قریب کھڑی تھی جس نے میوزک کانفرنس میں رادھا کا ناچ دکھایا تھا جو اس کے بھائی کو اس اندھیرے جنگل سے اٹھا کر یہاں لائی تھی۔ جو مے فیئر کے گرین روم — گرین روم — زخشندہ خاموش رہی۔ وہ غفران منزل کے کنور عرفان علی خان کی بیٹی تھی۔ وہ بیچیر اینگلو انڈین کیبرے ناچنے والی لڑکیوں سے بات کرنا پسند نہ کرتی تھی۔ لہٰذا چپ چاپ وہ گیلری میں سے وزیٹرز روم میں آگئی اور صوفے پر بیٹھ کر ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگی۔ وہاں اتنا ناقابل برداشت سناٹا طاری تھا۔ وزیٹرز کا گھنٹہ ختم ہونے والا تھا اور اس کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی کرن اور دل اور ان کے دوسرے ساتھی آ کے دیکھ کر واپس گئے تھے۔ لیکن اس نے کسی کو کمرے میں داخل نہ ہونے دیا تھا۔ وہ اب تک ہوش میں نہیں آیا تھا۔

بےصبری سے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ وہ لڑکی اطمینان سے گیلری میں سے چلتی ہوئی آئی اور اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے اس اونچی مغرور لڑکی کی بداخلاقی کا قطعی بُرا نہ مانا تھا۔ رخشندہ نے جھنجھلا کر پھر گھڑی دیکھی۔

اسی وقت اندر کا دروازہ کھلا اور متفکر، رنجیدہ شکل بنائے ڈاکٹر لینا ڈینا کر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے نرس نے انجکشن کا سامان اٹھا رکھا تھا۔

رخشندہ بے صبری سے کھڑی ہو گئی۔ "مجھے اسے دیکھ لینے دو کرنل" — اُس نے تقریباً چلّا کر کہا۔

"شُشو — شُو" — ڈاکٹر لینا دینا کر نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "اتنا مت گھبراؤ، لینا دینا بیرو وہ — سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم اسے جا کر دیکھ سکتی ہو روشنی بی بی۔ اور آپ بھی مس مک گریگر۔" انہوں نے اخلاق سے ذرا جھک کر دوسری طرف مڑتے ہوئے کہا۔

رخشندہ دبے پاؤں اس کے برف جیسے سفید بستر کے قریب گئی۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ چاروں طرف گلدانوں میں سفید للی کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ رخشندہ دریچے میں کھڑی رہی۔ فضا کا سکوت آہستہ آہستہ آہیں بھر رہا تھا۔

پھر دفعتہً اُس کو ہوش آ گیا۔ سب اس کے پلنگ کی طرف دوڑے

"میرا گھوڑا — ستارہ سحری کیسا ہے؟" اُس نے آنکھ کھول کر آہستہ سے پوچھا ہوش میں آنے کے بعد پہلا خیال جو اسے یاد آیا۔ پہلا سوال جو اس نے کیا وہ اپنے گھوڑے کے متعلق تھا۔ کرسٹابل کے متعلق نہیں۔ جس کی وجہ سے یہ حادثہ ہوا تھا۔

ارے یہ مرد ـــ ایمیلی نک گر بگیر۔ دروازے میں کھڑی ڈاکٹر لینا دینا کر کو دیکھتی رہی جونز کی جلدی جلدی کچھ ہدایتیں دینے میں مشغول تھے۔

یکلخت بی چچو کی نظر اپنی بہن پر پڑ گئی جو پلنگ کے قریب، بالکل ساکت و سامت کھڑی تھی۔ وہ اسے چند لحظوں تک غور سے دیکھتا رہا۔ پھر چلّایا " میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ تم کون ہو۔ میں تمہیں نہیں دیکھنا چاہتا۔ رخشندہ بیگم "ـــ وہ عمر میں پہلی مرتبہ روشی کے بجائے رخشندہ بیگم کہہ رہا تھا۔" رخشندہ بیگم مجھے تمہاری شکل سے نفرت ہے۔ تم سب کی شکلوں سے نفرت ہے۔ تم سب لوگ بھاگ جاؤ۔ میں اب فیض آباد میں نہیں ہوں۔ بھاگ جاؤ یہاں سے ـــ بھاگ جاؤ "۔

رخشندہ خاموشی سے پھر دریچے کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اپنی آنکھوں میں تیزی سے اُمنڈتے ہوئے گرم آنسوؤں کے ریلے کو روکنے کے لئے دریچے سے باہر گھاس کے قطعوں اور لالہ کی کیاریوں کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں سے اکا دکا نرسیں سائے کی طرح خاموشی سے گذر رہی تھیں۔

پھر اُس نے تھک کر تکیوں میں مُنہ چھپا لیا۔ میں اکیلا ہوں۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ میں بہت کمزور ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے میرے سامنے کچھ نہیں ہے۔ میں مر چکا ہوں ـــ اس نے پھر بہت دُکھ اور تکلیف کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔ باہر میڈیکل کالج کے باغ میں ہوائیں دھیرے دھیرے آہیں بھرنے لگیں۔ طویل اور سنسان برآمدوں میں ستونوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے۔

وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتی کمرے میں سے باہر نکل کر برجی کے آگے شہ نشین پر

آ کھڑی ہوئی اور اُس نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی وہ دوسری بھورے بالوں والی لڑکی بھی ہمدردی سے اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔

شہ نشین کی جالی پر کہنیاں ٹیک کر خاموشی سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے وہ سامنے کا منظر دیکھتی رہی ـــ سامنے آصف الدولہ کے امام باڑے کی ڈھلوان اور مچھی بھون کے پھاٹک کے آگے، اس پرانی، شکستہ دُنیا پر آفتاب غروب ہو رہا تھا اور شہ نشین کے نیچے، ان کے قدموں میں بہتی ہوئی گومتی کا پانی جیسے تپش اور بخار کی شدت سے گلرنگ ہو گیا تھا۔ میڈیکل کالج کی حدِ نظر تک پھیلی ہوئی سُرخ شاہی عمارتوں کے فلک بوس گنبدوں، برجیوں اور غلام گردشوں میں تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور دواؤں اور باغ کے پھولوں کی مہک ہوا میں اڑ رہی تھی۔

وہ دونوں دیر تک شہ نشین میں اسی طرح خاموش کھڑی رہیں۔

آخر اس دوسری لڑکی کی نرم، شیریں آواز نے اس سکوت کو منتشر کر دیا۔ ”وہ بے حد کمزور ہو گیا ہے۔ کیا تم اس کو دیکھنے کے لئے رات تک یہاں نہ ٹھہرو گی؟“ اس نے بہت رسان سے پوچھا۔

”ہم سب باری باری رات کو اس کے پاس بیٹھنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ کسی کو اپنے سامنے نہیں آنے دیتا۔“ رخشندہ نے پہلی مرتبہ، بادل ناخواستہ اس سے بات کی اور پھر شہ نشین کی جالی پر جھک گئی۔

”اگر تم کہو تو میں رُک جاؤں۔“ وہ آہستہ آہستہ پُرخلوص لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”وہ مجھے نہیں پہچانتا۔ اس لئے مجھ پر نہ بگڑے گا۔ وہ مجھے بھی کوئی نرس سمجھ لے گا ـــ دیکھو میں نے سفید فراک پہن رکھا ہے۔“ اُس نے بچّوں کی طرح بے ساختگی اور پُرمسرت

خلوص سے اپنے خوبصورت جلینی ریشم کے سفید فراک کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے نارنجی بال ڈھلتی دھوپ کی کرنوں میں جگمگا رہے تھے اور وہ وہاں، شہ نشین کے ایک ستون کے سہارے کھڑی آنکھوں کو بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔

چنانچہ ایک اور کرسٹابل ——— ایک اور کرسٹابل ——— ایک اور کرسٹابل ——— باغ میں منڈلاتی ہوئی ہوائیں تیزی سے چیخیں۔ رخشندہ جھنجھلا کر شہ نشین پر سے ہٹ آئی۔ وہ بھورے بالوں والی لڑکی شہ نشین کی جالی پر جھک کر اپنی نیلی آنکھیں کھولے اس دوسری، مغرور، بد دماغ، بد اخلاق انوکھی لڑکی کو تیزی سے زینے پر سے اُتر کر درخت کے نیچے کھڑی ہوئی کار کی طرف جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

"سنا تم نے ——" راجکمار جے کوک ٹیل کا گلاس انگلیوں میں بڑے اسٹائل سے تھامے، محمد باغ کلب کے لاؤنج میں اپنے دوستوں کے حلقے سے جو انتہائی انہماک سے منہ کھولے ہمہ تن گوش تھا، کہہ رہے تھے ——" سنا تم نے" چنانچہ ہری کہتا تھا کہ بس وہ دفعتہً راتوں رات اپنے رلیسٹ ہاؤس سے نکلا۔ اور سیدھا موٹر خانے میں گیا۔ اور کار نکال کر اُس نے انتہائی تیز رفتار سے مانا ٹھیر جانے والی سڑک پر چھوڑ دی۔ اور راتوں رات وہ مانا ٹھیر کی چھوٹی حویلی پہنچا۔ سمجھے بھئی۔ چھوٹی حویلی پہنچا —— اور وہاں پہنچ کر چودھری اصغر علی سے اس نے کہا ——"

——"بلکہ میں نے تو یہاں تک سنا ہے نسیبم ڈارلنگ" —— کہ چودھری اصغر علی بے حد سٹپٹائے اور انہوں نے بیچوان کی نے ایک طرف کو رکھ کر کھنکارتے ہوئے کہنا شروع کیا۔" دراصل قصہ یہ ہے کرنل صاحب —— قصہ وصہ کچھ نہیں —— اس نے کہا

اس نے کہا "۔ کالج کے فلورنس نکلسن ہال کے پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں جلدی جلدی پوری اطلاع مکمّل کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

" ارے ہائے " ۔ گھاس کے میدان سے بھاگ کر اس طرف آتے ہوئے ڈائمنڈ زور سے چلاّئی۔ سارے کیمپس پر جھٹپٹے کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ دُور ڈائننگ ہال اور ہوسٹلوں کی عمارات میں روشنیاں جھلملا اُٹھی تھیں۔

" ارے بھئی اللہ میاں " ۔ ڈائمنڈ تھک کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت سیدھی ریڈیو اسٹیشن سے آ رہی تھی اور اسے ابھی اپنی ساری دوستوں کو اس سنسنی خیز اور روح فرسا خبر سے مطلع کرنا باقی تھا۔ چند اور لڑکیاں ٹینس کورٹ کی سمت سے واپس آتی ہوئی پورچ کی طرف آ گئیں " کیا ہوا ؟ " ۔ انہوں نے ریکٹ گھاس پر پھینک کر سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے پوچھا

" ارے بھائی ہونا کیا اس نے قمر آرا سے شادی کر لی " ۔ ڈائمنڈ نے اکتا کر جواب دیا

" ایں ؟ " ۔ واقعے کی پوری نوعیت چند لحظوں تک نووارد لڑکیوں کی سمجھ میں اچھی طرح نہ آ سکی ۔۔۔ پھر جب اُنہیں خیال آیا کہ یہ ڈائمنڈ ہے جو ان کے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھی ہے۔ جس کی 'ہٹوا ئڈ ہو' اور اسکنڈلز کی انسائیکلو پیڈیا کی اطّلاعات میں شبہ کرنا بالکل کفر اور ناممکن ہے تو وہ بھی اتنے ہی زور سے چلاّئیں ۔۔۔ " اووووو ۔ گوش ۔۔۔ !!! "

" ہاں ۔ ذرا سوچو تو ۔ اس نے یعنی اس نے قمر آرا سے شادی کر لی۔ اس سے زیادہ حماقت کی خبر تم نے کوئی سنی تھی آج تک ؟ " ایک لڑکی نے کہا۔

اوپر میوزک روم میں کوئی لڑکی بار بار موسیقی کا ایک ہی ٹکڑا پیانو پر دہرائے جارہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ سب چاپ بیٹھی رہیں۔

"اُسے کہتے ہیں اللہ میاں کا اپنے گدھے کو خشکا بلکہ مُرغ پلاؤ کھلانا"۔ دوسری لڑکی نے بے حد فلسفیانہ انداز سے کہا۔ پھر وہ سب کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

"ہاں یعنی دیکھو تو سہی ـــ کہ ایک سے ایک ہولٹ ہونق بولائی ہوئی لڑکی نے چُن چُن کر سب اچھے لونڈوں سے شادیاں کرلیں۔ تم نے رائے بریلی کے اُس ایس۔ پی کو دیکھا تھا عذرا ڈارلنگ ؟ کہ گرگیٹ تک بھی اس کے آگے پانی بھرتا اور بیوی ایسی کہ اندھیرے میں دیکھو تو شکل بھی نظر نہ آئے اور جناب بالکل عشق میں لوٹ پوٹ ہو کر اس سے شادی کی ہے۔ پہلے کسی مشن اسکول میں پڑھایا کرتی تھی اور لمبا سا بے ہنگم سفید فراک پہن کر اوپر سے دوپٹہ اوڑھتی تھی اور اب ٹھاٹھ دیکھو ـــ شہزادی درشہوار کے پاس بھی ایسی ساڑیاں نہ ہوں گی"۔ اس نے کہا

"آدمی جات، ڈائمنڈ ڈارلنگ ـــ بالکل کتا جات ـــ سب کے سب گورنمنٹ ہاؤس کے سالانہ کینل شو میں بھیجنے کے لائق۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا"۔ اوما پام کے پتے کی ایک نوک توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے بے حد غور و فکر کے بعد بولی۔

"یہ کمبخت تو بس جہاں ذرا شکل ڈھنگ کی ہوئی اور اچھے عہدے پر آگئے تو اتنا اترانے ہیں کہ حد ہے"۔ ایک نے ستون کے پیچھے سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ہاں بھئی"۔ ڈائمنڈ نے گھڑی پر نظر ڈال کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "غرضیکہ

عجب دگرگوں حالت ہے۔ بڑا نازک زمانہ آلگا ہے۔ سب کمبختوں کے دماغ لوٹ گئے ہیں"۔ وہ اپنی سائیکل کی زنجیر ٹھیک کرنے میں مصروف ہوگئی

"اتنی مصروفیت سے کیا باتیں ہو رہی ہیں یار"۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی چند لڑکیاں یونیورسٹی ہوسٹل واپس جاتے ہوئے اُدھر سے گذریں اور ان میں سے ایک نے رک کر بڑی شگفتگی سے ان سب سے پوچھا۔

"ارے یار کچھ نہیں سو شبلاؔ۔ دراصل وہ کچھ اسٹرلنگ بیلینس کا جھگڑا ہے۔ اس پر اوماؔ تھیسس لکھ رہی ہے"۔ ڈائمنڈ نے بے حد سنجیدگی سے سائیکل اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"بالکل۔ یہی میں نے پروفیسر سلطان سے کہا تھا، شکیلہ ڈیئر، کہ جب تک چین کی معاشی تطبیق کا میثاقِ سعد آباد نہیں ہو جاتا۔ بین الاقوامی اقتصادی کلیت کا مابعد الطبیعاتی توازن ٹھیک نہ ہوگا"۔ تسنیم نے اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے ستون کے پیچھے سے اطلاع دی۔

"یہی خیال تو جنرل یونیسکو کا بھی ہے اوما ڈارلنگ"۔ ڈائمنڈ سائیکل نیچے اتارتے ہوئے مڑ کر بولی۔

"یہ جنرل یونیسکو کون صاحب ہیں؟" زوولوجی کی ایک ریسرچ کی طالب علم نے ان سب کی اس زبردست سیاستدانی سے ذرا مرعوب ہو کر پوچھا

"یہ جنرل فرینکو کے چھوٹے بھائی ہیں"۔ ڈائمنڈ نے جلدی سے جواب دیا اور سائیکل اٹھا کر سڑک کی طرف بھاگ گئی۔

دلکشا کلب میں، حجم خانہ میں، چھتر منزل اور کافی ہاؤس میں، ہر ڈرائینگ روم

ہیں، ہر جگہ یہی تذکرہ تھا۔ وہ گئیں، دہ آئیں، کرن سب سے ملتی ہوئی خاموش اوٹرم روڈ پر پہنچی۔ (وہ آئی نے انتہائی رنجیدہ آواز میں اس سے کہا۔ ڈائمنڈ بی بی اب ہمیں اپنا چنڈو خانہ اور اسکینڈلز کلب توڑ دینا پڑے گا۔ یہ سوچ کر اس پر بھی رقت طاری ہوگئی)

غفران منزل میں غیر معمولی طور پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اگلے روز بی چو میڈیکل کالج سے اچھا ہو کر گھر واپس آنے والا تھا اور اس کے لئے اس کے کمروں کی صفائی کی جا رہی تھی۔ دروازے بار بار کھولے اور بند کئے جا رہے تھے۔ سب چپ چاپ سایوں کی طرح ادھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔

ڈائمنڈ برساتی کی سیڑھیوں پر سائیکل گرا کے حسب عادت پی چو کے سٹنگ روم کی طرف گئی، وہاں کوئی نہ تھا۔ صرف عباسی خانم اندر کے دروازے میں کھڑی لیمپ کا شیڈ صاف کرنے میں محو تھیں۔

"بٹیا کہاں ہیں؟" ڈائمنڈ نے اندر آکر پوچھا

"بٹیا؟" —— عباسی خانم نے چونک کر پیچھے مڑتے ہوئے پوچھا۔ اپنی خالی خالی نظروں سے اندھیرے میں اپنے سامنے کو دیکھتے ہوئے وہ بالکل کوئی پرانا آسیب معلوم ہو رہی تھیں "بٹیا" —— انھوں نے دہرایا۔ "بٹیا کو پوچھت ہو؟ اوپر ہوئی ہیں۔"

ڈائمنڈ جلدی سے اس اندھیرے کمرے سے باہر نکل آئی اور برآمدے کا چکر کاٹ کر سامنے کے بڑے ہال میں پہنچی۔ "روشی۔ روشی"۔ ہال میں زینے کے نیچے کھڑے ہو کر اُس نے آواز دی۔ ذرا خوفزدہ ہو کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ہال کی تاریکی میں ساری قدِ آدم تصویریں، پرانے مجسّمے اور شیروں اور بارہ سنگھوں کے سر اپنی خالی خالی نظروں سے اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ "روشی" —— وہ

زور سے پھر چلاّئی۔

دفعتہً ہال کی اندھیری چھت میں جھاڑ اور کنول جل اُٹھے اور اُن کی پیلی روشنی میں رخشندہ زینے پر سے نیچے اُتری۔

"اُرے ہلو ڈائمنڈ ڈارلنگ"۔ اُس نے گھسے ہوئے سُرخ قالین والی سیڑھی پر آکے بازو پھیلا دیئے۔

"ہلو مائی لَو"۔ ڈائمنڈ اس سے لپٹ گئی۔ اس خبر کی وجہ سے سارے دن کی اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ اور اکسائیٹ منٹ سے اب تک اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چونکہ وُہ کالج سے اب تک اپنے گھر نہ گئی تھی۔ اس لئے چائے پینے کو بھی اس کا جی چاہ رہا تھا۔

وہ دونوں خاموشی سے ہال میں سے نکل کر گیلری میں آگئیں۔

گو موقع اور صورت حال بالکل اس کے مناسب نہ تھی لیکن یہ واقعہ تھا کہ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ "روشی ڈارلنگ تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟" اُس نے پوچھا

"ہاں ہاں آؤ"۔ رخشندہ نے بہت آہستہ سے کہا۔

وہ دونوں تاریک کھانے کے کمرے میں آکے نعمت خانے کے پاس ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئیں۔

رخشندہ نے نعمت خانہ کھول کر خاموشی سے چیزیں نکالیں ڈائمنڈ روشنی جلانے کی پرواہ کئے بغیر فرش پر دیوار کے سہارے بیٹھی کھاتی رہی۔ باہر رات کی ہوائیں چلنی شروع ہو گئی تھیں۔ اس کی مانگ میں افشاں چُنی ہو گی۔ اس کے

پاؤں میں سُرخ مہندی رچی ہوگی۔ اس کا فرشی اطلس کا غرارہ چلتے میں اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتا ہوگا۔ پیروں میں اس نے لچھے اور رام جھول پہن رکھے ہوں گے۔ یہ سب کیا تھا۔ ڈائمنڈ نے سموسے ختم کرتے ہوئے سوچا۔ ارے ہائے یہ الوژن — الوژن — الوژن —

ہوائیں تیزی سے سرسرانے لگیں

یوربین وارڈ کی گیلری سنسان پڑی تھی۔ کبھی کبھی کوئی نرس ادھر سے گذر جاتی تھی۔ دریچوں میں رکھے ہوئے للی کے سفید پھول مرجھا چکے تھے۔ ڈاکٹر لینا ڈیناکر اپنے دفتر کی میز پر کاغذات پر جھکے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے کی ساری فطری بشاشت اور زندگی غائب تھی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر سائیکل روکنے کی آواز پر انہوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ رخشندہ، بالکل چمپئی رنگت والی ان کی روشنی بیٹی جیسے کسی خواب میں چلتی ہوئی ان کی طرف آرہی تھی

"کرنل موٹر کس وقت یہاں منگوائی جاتے ہے؟" اس نے دروازے میں آکر پوچھا

"روشنی بی بی"۔ انہوں نے بڑی مصیبت سے رومال جیب سے نکال کر پیشانی صاف کی اور کھنکارے۔ پھر رومال میز پر رکھ دیا اور پڑھنے کی عینک اٹھالی۔ پھر عینک کے اوپر کے شیشوں میں سے چاروں طرف دیکھا۔ گویا جائے فرار تلاش کرتے ہوں۔

"روشنی بی بی"۔ انہوں نے پھر گلا صاف کیا۔ "پی چو میاں تو چلے گئے"۔

"پی چو چلا گیا؟" وہ چیخی

ڈاکٹر لینا ڈیناکر بے حد مظلومیت سے اسے دیکھ کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے

"کرنل تم نے اسے کیسے چلا جانے دیا۔ تم تو اُسے آج ہمارے ساتھ گھر بھیج رہے تھے" وہ پھر چلائی۔

"ہاں جہاں تک ہو سکا۔ میں نے اسے روکا۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ وہ بالکل اچھا ہو چکا تھا۔ اس لئے مجھے اجازت دے دینی پڑی۔ لیکن فکر نہ کرو لینا دینا۔ وہ جتنی دور بھی گیا ہوگا۔ اتنی جلد ہی واپس آجائے گا" انہوں نے بڑی مشکل سے بات ختم کی اور جلدی سے قلم اٹھا لیا۔

"تو کرنل کیا تمہیں بھی اس نے نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟" اس نے میز کے قریب آکر ان سے پوچھا

"مجھے تو اس نے کچھ نہیں بتایا روشنی بیٹی" ڈاکٹر نے انتہائی بے کسی سے ہاتھ ہلا کر کہا "مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ جس روز حادثہ ہوا۔ اس کے اگلے روز تبدیل ہو کر وہ کہیں جانے والا تھا۔ اب وہ کہاں چلا گیا۔ یہ مجھے پتہ نہیں"۔

"لیکن کرنل اس نے تو دو مہینے کی چھٹی منگا لی تھی" رخشندہ نے چیخ کر کہا۔

"اچھا — ؟ ؟" ڈاکٹر لینا دینا کر ششدر رہ گئے۔ "کچھ نہیں" انہوں نے بے چارگی سے ہاتھ مل کر کہا "کچھ نہیں۔ یہ آج کل کے بچے — اتنے خود سر — اتنے ضدی — لینا دینا بیٹی۔ وہ تم روؤ مت بیٹی میں شام کو کنور صاحب سے ملنے آؤں گا" وہ جلدی سے اپنا سفید کوٹ پہن کر کسی تازہ کیس کے لئے آپریشن تھیٹر کی طرف چلے گئے۔ دروازے میں پہنچ کر انتہائی فکرمندی اور پریشانی کے ساتھ انہوں نے ایک لحظے کے لئے مڑ کر رخشندہ کو دیکھا جو دفتر سے باہر جا رہی تھی اور کوریڈور کی بھول بھلیاں میں غائب ہو گئے۔

وہ بہت شکستہ، بہت ہی زیادہ تھکی ہاری، برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر سائیکل
پر جھک کے اس کا تالہ کھولنے میں مصروف ہو گئی (پی چو تم تو خبطی ہو تھوڑے سے
— فوں — پی چو ممی کان کھینچیں گی تمہارے — اچھا ہے کان ذرا اور لمبے ہو جائینگے
تو زیادہ خوبصورت لگوں گا۔ میں یہاں سے تبادلہ کروا کے اور آگے چلا جاؤں گا۔
اور آگے — چنانچہ رخشندہ بیگم تم اسے بھی نہ روک سکیں اور وہ چلا گیا۔ جس طرح اس سے
پہلے سلیم جا چکا ہے۔ تم انہیں خود ان سے نہ بچا سکیں۔ تم نے تو دنیا کو پر مسرت
بنانے کی ذمے داری اپنے سر لی تھی۔ اس نے سوچا) اسے کسی کے پیروں کی چاپ
سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہی بکھرے بالوں والی لڑکی اس کی سمت آ رہی تھی
ان دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ یہ سب
باتیں اب اتنی حماقت زدہ، اتنی بیکار تھیں۔

"تم اب اپنے گھر جا رہی ہو؟ اچھا خدا حافظ۔" اس دوسری لڑکی نے
سائیکل اٹھا کر پھاٹک کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"ذرا ٹھہرو۔ ہم اکٹھے چلیں گے۔" رخشندہ نے دفعتہً اسے آواز دی۔ وہ ٹھٹھک
گئی۔ وہ ڈوبتے ہوئے سرخ سورج کے مقابلے میں کھڑی ہو گئی اور اس کے
نارنجی بال ہوا میں اڑنے لگے۔ اس نے سرخ آفتاب کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہ الوکھی
بد دماغ لڑکی اپنی سائیکل سنبھالے اس کی سمت آ رہی تھی۔ اس کی ساری کا آنچل ہوا
میں اڑ رہا تھا اور وہ آنکھوں کو بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔

اور اب یہ واقعہ تھا کہ اس کی اپنی یعنی رخشندہ عرفان علی کی اور اس کیپر بے والی
لڑکی کی سائیکلیں خوابیدہ گومتی کے کنارے کنارے ریور بنک روڈ کے سناٹے میں

ساتھ ساتھ بہتی آرہی تھیں۔ چینا بازار گیٹ کے قریب پہنچ کر اس لڑکی نے اسی شبنمی سے کہا۔ "اچھا شب بخیر۔"

"شب بخیر۔" اس نے جواب دیا۔ لیکن ان کی سائیکلیں پھر بھی اسی خاموشی سے برابر برابر چلتی رہیں۔

پھر گیٹ کے اندر اینگلو انڈین بستی کی طرف مڑتے ہوئے اس نے کہا۔ "کبھی میرے ہاں آؤ — تمہیں یورپین میوزک پسند ہے؟"

"ہاں۔ میں کبھی تمہارے ہاں ضرور آؤں گی۔ مجھے یورپین میوزک پسند ہے۔" رخشندہ نے اسی ٹھہری ہوئی کیفیت کے ساتھ جواب دیا۔

"سولونگ" کہہ کر وہ لڑکی چینا بازار گیٹ کے دھندلکے میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس لڑکی نے کرسٹابل کی طرح اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی کہ کیا تم مجھے سمجھتی ہو؟ — وہ تو اب ہر ایک کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

مال پر دور حدِ نظر تک دھندلے قمقمے جگمگا اٹھے تھے۔

کمپارٹمنٹ کا دروازہ بند کر کے برتھ پر بیٹھتے ہوئے اس نے بڑے دلکش تحکمانہ انداز میں پوچھا۔ "میری طرف دیکھو۔ کیا میں تمہیں اچھا لگتا ہوں؟"

وہ بالکل خاموش رہی اور جھک کر دوپٹے کے کونے کو انگلیوں کے گرد لپیٹنے لگی۔ ارے کیسی باتیں کرتے ہیں یہ۔ کیسا باؤلا سوال تھا۔ اب بھلا کیا وہ ان سے کہہ دے گی کہ آپ اچھے لگتے ہیں۔ واہ بھئی۔ اس نے اپنا جالدار ٹھپے کا دوپٹہ دوہرا کر کے اپنے چاروں طرف سے سمیٹ لیا۔ وہ تیز ہوا کی زد سے اسے بچانے

کے خیال سے کھڑکیاں بند کر کے پھر اپنی برتھ پر جا بیٹھا اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا
ٹرین گڑگڑاتی، شور مچاتی الہ آباد کی طرف بھاگتی رہی۔ تھوڑی دیر میں پرتاب گڈھ
کا اسٹیشن آیا۔ "تم ابھی چائے پیو گی؟" اس نے بیرے کو بلانے کے لئے اٹھتے ہوئے پوچھا
"جی۔ جی نہیں"۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا اور اپنے مہندی میں رچے
ہوئے پاؤں غرارے کے بڑے پائینچوں میں اچھی طرح چھپا کر برتھ پر اوپر کو کھسک کر
بیٹھ گئی۔ وہ پلیٹ فارم پر اتر کر کسی جاننے والے سے بڑی اونچی انگریزی میں باتیں
کرنے میں مشغول ہو گیا۔ بس وہ اس سے صرف اتنی ہی باتیں کرتا تھا۔ "تم چائے پیو گی؟
ابھی کھانا کھاؤ گی؟" "نہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟ پنکھا تو برا نہیں معلوم ہو رہا؟
تم نے سونے سے پہلے دودھ کیوں نہیں پیا؟" گویا وہ محض ایک پیاری سی پالتو
ایرانی بلی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اس سے اور کوئی باتیں نہ کرتا تھا۔

وہ پھر اندر آکر بیٹھ گیا اور اخبار میں مشغول ہو گیا۔ ٹرین چلنے لگی۔ ہرے کھیت
آم کے جھنڈ، کچی سڑکوں پر رینگتی ہوئی بیل گاڑیاں، سنگھاڑوں اور کنول کے پھولوں
سے بھرے ہوئے تالاب، یہ سب تیزی سے مخالف سمت میں دوڑتے ہوئے آنکھوں
سے اوجھل ہوتے رہے۔ مانا تھئیر لحظہ بہ لحظہ اس کے بہت پیچھے، بہت دور رہتا
جا رہا تھا۔ مانا تھئیر، چھوٹی حویلی، آنگن کا املی کا درخت، اس کی مرغیاں، اس کی
مسلم اسکول کی کتابیں جن کے ہر پہلے صفحے پر اس نے نہایت محنت اور صفائی سے
انگریزی میں "مس قمر آرا بیگم اسٹوڈنٹ کلاس IX - A کرامت حسین گرلز ڈگری
کالج لکھنؤ یو۔ پی" لکھا تھا۔ اس کے دالان میں چان پر رکھی ہوئی اس کی پرانی ڈھولک
اس کے ابا کا پیچوان ـــ یہ سب چیزیں ایک دوسرے، دنیا سے تعلق رکھتی تھیں

جیسے وہ کبھی اس ماحول میں پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ ان فضاؤں میں پلی بڑھی ہی نہ تھی۔ ہمیشہ سے اسی طرح ایر کنڈیشنڈ فرسٹ کلاس میں سفر کرتی اور ڈائیننگ کار میں لنچ کھانی آئی تھی۔" یا اللہ — اللہ میاں — یہ کتنی عجیب بات تھی۔ اس کی زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی اتنے پل بھر میں، بالکل پلک جھپکتے میں پیدا ہوگئی تھی۔ کسی کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ ایک دم، اگلے لمحے، کیا سے کیا ہو جائے گا۔ ہم کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔ اتنے دن ہوئے رخشندہ بجیا کا پیغام اس تک پہنچانے کے لئے مسلم اسکول آیا تھا اور نصیبن نے اندر جا کر چلّا کر کہا تھا کہ کمر بٹیا تمہرے بھیا آئے ہیں اس وقت بھلا اسے کیا معلوم تھا کہ ایک روز وہ اس کے ساتھ اس طرح ٹرین میں بیٹھی جانے کون کون سی نئی عجیب وغریب دنیاؤں کی طرف چلی جا رہی ہوگی سچ مچ میں، یہ سب کتنی عجیب باتیں ہیں۔ افوہ اللہ میاں۔ حیاتِ انسانی کے ان اسراروں پر اس نے غور کرنے کی کوشش کی لیکن برتھ کے نرم گدیلوں اور کشنوں سے سہارا لگائے لگائے بہت جلد اُسے نیند آگئی۔

اسے سوتا دیکھ کر وہ اٹھا اور بڑی احتیاط سے تاکہ کہیں کھٹ پٹ کی آواز سے اس کی آنکھ نہ کھل جائے، اپنے ہولڈال میں سے اپنا پلش کا رگ نکال کے اُس نے آہستہ سے اسے اڑھا دیا اور پھر اپنی برتھ پہ جا کے اپنا طبّی رسالہ دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

ٹرین بڑے سکون سے لہراتی، بل کھاتی الٰہ آباد کی طرف بڑھتی جا رہی تھی

کنور رانی سچ مچ میں تنکے چُننے لگیں۔ انہوں نے درگاہِ حضرت عباس علیہ السلام سے لیکر

معالی خاں کی سرائے اور حسین آباد تک کے سارے چھوٹے بڑے امام باڑوں میں ان گنت منتیں مان ڈالیں۔ انہوں نے مانا ٹھیر کے لوکل پیر سید گلگلے شاہ کے مزار کے لئے پھولوں کی دوہری چادریں بھجوائیں۔ وہ اپنی پرانی اسٹوڈی بیکر میں سوار ہو کر بھاگی بھاگی سیتا پور کے قصبے خیر آباد تک پہنچیں اور وہاں مقبول میاں سے پوچھا کہ اُن کا بچہ کہاں گیا ہے۔ لیکن مقبول میاں بھی (جو صرف عورتوں ہی کو اپنی درگاہ پر باریاب کرتے ہیں اور سارے گم شدہ انسانوں کا پتہ تبلا دینے میں اسپیشلسٹ ہیں) غفران منزل کے چھوٹے کنور کے لئے کچھ نہ بتلا پائے۔ وہ اجمیری پیا کے دربار تک جانے کو تیار ہو گئیں۔ انہوں نے تحفۃ العوام کے سارے وظیفے پڑھ ڈالے (اور قصبے میں اور برادری میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ یہ چھوٹی حویلی والی چودھرائن کی آہ رنگ لا رہی ہے۔ اسی طرح خورشید گھر سے غائب ہوا تھا۔ تب تو غفران منزل والے اور کنور رانی مزے سے بیٹھی ہنستی رہی تھیں۔ اب اپنا لڑکا بھی اسی چکر میں نظروں سے اوجھل ہوا ہے تو بسنت کی خبر لگی ہے اور رمینا نے گیندا سے لڑتے لڑتے پھر اسے اپنا پسندیدہ دوہا سنایا۔ دکھیا گری پہاڑ سے کو و ؤ کھبر نہ لیں۔ ارے سکھیل کے گوڑما کا نا چھبن سب ہائے ہائے کین) کچھ عرصے بعد محرم آگیا اور مجتہد العصر قبلہ چھمن صاحب سے لے کر لکھنؤ اور امروہے اور رامپور اور جونپور کے سارے ذاکرین اور سوزخواں جو ہر سال غفران منزل کی مجلسوں کے لئے بلائے جاتے تھے۔ اپنے نالہ و گریہ کی تاثیر سے کنور رانی کے پی جُو کو واپس نہ بلا سکے محرم آگیا اور رخشندہ اس میں مصروف ہو گئی۔ لکھنؤ کا محرم —— جب گلی گلی امام باڑے سجتے تھے اور شربت کی سبیلیں لگائی جاتی تھیں اور ہندو مسلمان، شیعہ، سنی

جیسے وہ کبھی اس ماحول میں پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ ان فضاؤں میں پلی بڑھی ہی نہ تھی۔ ہمیشہ سے اسی طرح ایر کنڈیشنڈ فرسٹ کلاس میں سفر کرتی اور ڈائیننگ کار میں لنچ کھاتی آئی تھی"۔ یا اللہ — اللہ میاں — یہ کتنی عجیب بات تھی۔ اس کی زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی اتنے پل بھر میں، بالکل پلک جھپکتے میں پیدا ہو گئی تھی۔ کسی کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ ایک دم، اگلے لمحے، کیا سے کیا ہو جائے گا۔ ہم کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔ اتنے دن ہوئے رخشندہ بجیا کا پیغام اس تک پہنچانے کے لئے وہ مسلم اسکول آیا تھا اور نصیبن نے اندر جا کر چلّا کر کہا تھا کہ کمر بٹیا تمھرے بھیا آئے ہیں اس وقت بھلا اسے کیا معلوم تھا کہ ایک روز وہ اس کے ساتھ اس طرح ٹرین میں بیٹھی جانے کون کون سی نئی عجیب و غریب دنیاؤں کی طرف چلی جا رہی ہو گی سچ مچ میں، یہ سب کتنی عجیب باتیں ہیں۔ افوہ اللہ میاں۔ حیاتِ انسانی کے ان اسراروں پر اس نے غور کرنے کی کوشش کی لیکن برتھ کے نرم گدیلوں اور کشنوں سے سہارا لگائے لگائے بہت جلد اُسے نیند آ گئی۔

اسے سوتا دیکھ کر وہ اٹھا اور بڑی احتیاط سے، تا کہ کہیں کھٹ پٹ کی آواز سے اس کی آنکھ نہ کھل جائے، اپنے ہولڈال میں سے اپنا پلش کا رگ نکال کے اُس نے آہستہ سے اسے اڑھا دیا اور پھر اپنی برتھ پہ جا کے اپنا طبّی رسالہ دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

ٹرین بڑے سکون سے لہراتی، بل کھاتی الٰہ آباد کی طرف بڑھتی جا رہی تھی

کنور رانی سچ مچ میں تنکے چُننے لگیں۔ انہوں نے درگاہِ حضرت عباس علی سے لیکر

معالی خاں کی سرائے اور حسین آباد تک کے سارے چھوٹے بڑے امام باڑوں میں ان گنت منتیں مان ڈالیں۔ انہوں نے مانا ٹھیر کے لوکل پیر سید گلگلے شاہ کے مزار کے لئے پھولوں کی دوہری چادریں بھجوائیں۔ وہ اپنی پرانی اسٹوڈی بیکر میں سوار ہو کر بھاگی بھاگی سیتا پور کے قصبے خیر آباد تک پہنچیں اور وہاں مقبول میاں سے پوچھا کہ اُن کا بچہ کہاں گیا ہے۔ لیکن مقبول میاں بھی (جو صرف عورتوں ہی کو اپنی درگاہ پر باریاب کرتے ہیں اور سارے گم شدہ انسانوں کا پتہ بتلا دینے میں اسپیشلسٹ ہیں) غفران منزل کے چھوٹے کنور کے لئے کچھ نہ بتلا پائے۔ وہ اجمیر ہی پیا کے دربار تک جانے کو تیار ہو گئیں۔ انہوں نے تحفۃ العوام کے سارے وظیفے پڑھ ڈالے (اور قصبے میں اور برادری میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ یہ چھوٹی حویلی والی چودھرائن کی آہ رنگ لا رہی ہے۔ اسی طرح خورشید گھر سے غائب ہوا تھا۔ تب تو غفران منزل والے اور کنور رانی مزے سے بیٹھی ہنستی رہی تھیں۔ اب اپنا لڑکا بھی اسی چکر میں نظروں سے اوجھل ہوا ہے تو بسنت کی خبر لگی ہے اور رمینا نے گیندا سے لڑتے لڑتے پھر اسے اپنا پسندیدہ دوہا سنایا۔ دکھیا گری پہاڑ سے کوؤ نہ کھبر نہ لیں۔ ارے سکھیلک کے گوڑ ما کا نٹا چھبن سب ہائے ہائے کین) کچھ عرصے بعد محرم آگیا اور مجتہد العصر قبلہ چھمن صاحب سے لے کر لکھنؤ اور امروہے اور رامپور اور جونپور کے سارے ذاکرین اور سوز خواں جو ہر سال غفران منزل کی مجلسوں کے لئے بلائے جاتے تھے۔ اپنے نالہ و گریہ کی تاثیر سے کنور رانی کے پی چُو کو واپس نہ بُلا سکے محرم آگیا اور رخشندہ اس میں مصروف ہو گئی۔ لکھنؤ کا محرم — جب گلی گلی امام باڑے سجتے تھے اور شربت کی سبیلیں لگائی جاتی تھیں اور ہندو مسلمان، شیعہ، سنی

اکٹھے ہو کر حسینؑ مظلوم، انسانیت کے سب سے بڑے ہیرو، کی بارگاہ میں اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔ چوبیس گھنٹے ماتمی نقارہ بجتا رہتا تھا۔ امام باڑوں میں چراغاں کیا جاتا تھا۔ ہندو عورتوں کی ٹولیاں پوربی زبان میں لکھے ہوئے نوحے اپنے طریقے سے گاتی ہوئی سڑکوں اور گلیوں میں سے گذرتی رہتی تھیں۔ چالیس دن تک سارے شہر میں بلا کی چہل پہل، زندگی اور جوش رہتا تھا۔ رخشندہ ہر سال محرّم کے دنوں میں بے حد مصروف رہتی تھی۔ غفران منزل میں محرّم بڑے زور شور سے منایا جاتا تھا اور وہ ساتویں تاریخ کی مہندی، آٹھویں کی حاضری، عشرے کے اعمال، ان تمام چیزوں کا انتظام بڑے انہماک اور تندہی سے کرتی تھی۔ غفران منزل کے ہال میں جس میں محرّم کے دنوں میں چاندنی کھینچ کر اور تصویریں اور دوسرا سامان نکال کر امام باڑہ بنا دیا جاتا تھا۔ صبح شام مردانی اور زنانی مجلسیں ہوتی تھیں اور وہ بڑے جوش و خروش سے مغلانیوں مہریوں اور ملازموں کو ان کے متعلق احکام دیتی پھرتی تھی۔ عاشورے کے روز دن بھر بیٹھ کر نہایت مستعدی سے اعمال کرتی تھی۔ سوئم تک کے لئے چوڑیاں ٹھنڈی کر دیتی تھی۔ یہ سب باتیں اتنی اچھی لگتی تھیں بالکل اسی طرح جیسے گنی کو ہنومان جی کے مندر میں جا کر تلک لگانا اچھا لگتا تھا۔ اس سے دل کو اتنا سکون ملتا تھا۔

اور اب محرّم آیا۔ چوک اور حسین آباد کی مجلسیں تال کٹورے اور ماہ نگر کی طرف جانے والے تعزیئے۔ امام باڑہ غفران مآب کی 'شامِ غریباں' اب یہ سب بالکل ایک دھندلے سے خواب کے تماشے کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ ان مجلسوں میں ہر سال پی چُپ جایا کرتا تھا۔ اپنے گھر کے تعزیوں کے ساتھ، وہ

سیاہ شیروانی پہنے، ننگے پیر اور ننگے سر نال کٹورے کی کربلا تک جاتا تھا۔ وہ اپنی پیاری درد بھری آواز میں کربلا میں شہ والا کے حرم لٹتے ہیں، اور چُور زخموں سے شاہِ ہدیٰ ہیں کھڑے، کی سوز خوانی کرتا تھا۔ اب وہ وہاں نہیں تھا۔ ہال کا امام باڑہ اس کے بغیر اتنا سونا لگ رہا تھا۔ کنور رانی نے تعزیوں کے آگے اس کے لئے جناب علی اکبرؓ اور جناب قاسمؑ کے نام کی منتیں مانیں۔ غرضیکہ وہ سب کچھ کیا۔ جو دعاؤں کی حد تک وہ کر سکتی تھیں لیکن سوئم، چہلم، چپ تعزیہ، نویں تاریخ سب نکلتے چلے گئے اور وہ واپس نہیں آیا۔

کرن اور پوپو کے ذریعے رخشندہ کو خبریں ملتی رہتیں۔ پی چو آج کل شیلانگ میں ہے۔ پی چو مدراس گیا ہوا ہے۔ پی چو ناگپور چلا گیا ہے۔ لیکن کہیں سے بھی اُس نے کسی کو اپنے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی۔

پھر حسبِ معمول کنور صاحب سرمائی گذارنے کے لئے ماتا ٹھیر جانے لگے تو رخشندہ نے بچوں کی طرح مچل کر ان سے کہا "میاں ہم ہو ماتا ٹھیر چل کے رہیا۔" وہ اپنے قصبے میں گئی۔ اس نے بڑی حویلی کے پرانے کمرے کھلوائے جو مدتوں سے بند پڑے تھے۔ وہ اس سہ دری میں جاکر بیٹھی۔ جہاں ان سب نے وہ دلچسپ چھٹیاں گذاری تھیں۔ آنگن کی دیوار کی کھڑکی پر اس کی نظر پڑی۔ وہ قمر آرا کی کھڑکی تھی۔ وہ جلدی سے وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف آگئی اور دن بھر ادھر اُدھر باغ میں گھومتی رہی۔ وہ اُوپر شہ نشین میں گئی اور گھاگرا کے چوڑے پاٹ پر نظر ڈالی وہاں پر سامنے، افق کے کنارے ریت کے ٹیلے تھے اور پرانے مندروں کی شکستہ سیڑھیاں تھیں اور ماہی گیروں کی ٹوٹی ہوئی کشتیاں ریت پر الٹی پڑی

تھیں۔ اس نے زمین کی خوشبو کو محسوس کیا۔ صبح کے بھیگے سناٹے میں قصبے کی کچی سڑک کو دیکھا جس کے دونوں طرف کی کچی منڈیروں پر بیری اور ببول کے پیڑ جھکے ہوئے تھے اور ارہر اور گیہوں کے کھیت اور دریا کی طرف جانے والی پگڈنڈیاں، اور ٹیلے پر اس کے 'سمرقند و بخارا' اسے آنے والے پرکھوں کی وہ پرانی، بھوری اور شکستہ خانقاہ جس کی دیواروں کی اینٹوں میں سے اگ کر پیپل کے پودے اور گھاس باہر کو جھک آئی تھی۔ وہ کھلی ہواؤں کی مہک، رہٹ کے چلنے کی آواز، بیل گاڑیوں اور اونٹوں اور بہلیوں کے پہیوں میں سے نکلنے والی طرح طرح کی صدائیں ۔ یہ سب چیزیں اس نے دوبارہ دیکھیں اور ان کی واقعیت اور مکمل پن کو محسوس کیا۔ وہ کسان عورتیں اور مرد جو دن بھر اسے کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر اپنے اپنے کام میں مصروف ادھر ادھر جاتے نظر آتے تھے۔ سب اسی دھرتی کے بیٹے تھے۔ ان کی زبان، ان کا لب و لہجہ، ان کے گیت، ان کے دکھ سکھ، وہ فضا جس میں وہ پیدا ہوئے تھے۔ یہ سب اس کا اپنا تھا۔ اس کا اپنا اور بہت پیارا، اپنی زمین، اپنی گیہوں کی بالیاں، ہوا کی نمی، مٹی کی خوشبو، یہ سب اس کی اپنی مٹی کے دیوتا تھے۔ حیات کی ارتقا کے دیوتا۔ برہما وشنو، مہیش۔ اور اس نے سوچا۔ یہ ٹھیک ہے۔ ساری غلطی یہی تھی۔ وہ زمین کی بیٹی تھی اور اب زمین کو واپس آگئی۔ اسکی اصل دنیا یہی تھی۔ دلکشا کلب، لالہ رخ اور چھتر منزل کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر گھومتی رہی۔

پھر جاڑے کا موسم آگیا۔ چھوٹی چھوٹی بے رنگ بستیوں اور قصبوں کے جاڑوں کا موسم، جو ہر جگہ یکساں ہوتا ہے۔ وہ دن بھر سہ دری میں بیٹھی کتابیں پڑھا کرتی۔ یا نٹنگ کرتی رہتی۔ وہ اپنے چاروں طرف کے منظر دیکھتی اور اسے وجود کی اس شدید

بے کیفی، انتہائی اکتاہٹ کا احساس ہوتا۔ دھندلکے میں چھپے ہوئے کچی سڑکوں کے لیمپ، راستوں کی گہری کیچڑ، لہنگوں اور برقعوں والی عورتوں کی قطاریں، سائیکلیں ایکے، چھوٹے چھوٹے غیر ضروری انسان، ان کے سگرٹوں کا اٹھتا ہوا دھواں، سینما کے اشتہار، یہ صدیوں کا بیمار سکوت، یہ غلاظت، یہ سارے بوجھ جو ایک دم اکٹھے مل کر سوتے ہوئے دماغ پر سوار ہو جاتے تھے۔ کوئلے کی دکانیں، آبادی کے اختتام پر وہ شکر کا کارخانہ، یہ ملگجی رنگتوں کے کپڑوں میں ملبوس ڈھیروں انسان جو صبح سے شام تک رینگتے ہیں (وہ سوچتی) اور زندگی بھر یونہی رینگتے رہیں گے اور ایک صبح ایک دوسرے کو مار کر ختم ہو جائیں گے اور گدھ آ جائیں گے، اور ان بستیوں، ان آبادیوں پر منڈلاتی ہوئی گدھوں کی قطاریں وجود کی اس بے رنگی میں اضافہ کر دیں گی۔ لیکن چونکہ اس نے وہاں آ کر دفعتہً یہ محسوس کیا تھا۔ کہ وہ اسی وجود کے تانے بانے کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اس لئے اس نے سوچا کہ اسے اتنا بے تعلق نہ رہنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ فوراً لالہ اقبال نرائن کو بلوا کر ان سے پوچھتی کہ قصبے کے اسپتال اور کرواہا راج کے گاؤں کی ڈسپنسریوں میں دواؤں کا نیا اسٹاک کب سے نہیں آیا اور رنجشی دوار کا پرشاد کو بڑی مستعدی سے حکم دیتی کہ انجمن امداد باہمی کے رجسٹروں کی نئی جانچ پڑتال کریں اور کسانوں کے ساتھ نہایت خوش معاملگی سے کام لیں تاکہ انہیں پھر مہاجن کا دروازہ نہ کھٹکھٹانا پڑے اور اسی وقت ڈاک سے کرن کے بھیجے ہوئے نیو ایرا کے پرچے اور اخباروں کے تراشے آن پہنچتے اور وہ اسے بتاتے کہ زندگی کی حقیقت انجمن امداد باہمی نہیں بلکہ خون کے دریا اور نفرت کے شعلے اور پناہ گزینوں کے قافلے ہیں۔ گدھوں کی قطاریں اور اغوا شدہ عورتوں کے گلّے زندگی کی اصل

حقیقت ہیں۔ وہ دیوالی کی رات تھی۔ قصبے بھر میں ہر سال کی طرح زور شور سے چراغاں
کیا گیا تھا۔ حویلی کی چھتیں اور شہ نشین مٹی کے دئیوں کی قطاروں سے جگمگا رہے تھے
ریڈیو میں سے ڈائمنڈ اور گوہر سلطان کی آواز آ رہی تھی۔ وہ دونوں ڈھولک کے ساتھ
گلے جا رہی تھیں۔ آج آنگن میں رنگین دیا جلے ـــــ سوئی ہوئی دھرتی میا جگائی، لکشمی
ہمارے گھر آج آئی، دیپوں کی چھایا تلے ـــــ دیپوں کی چھایا تلے ـــــ ڈھولک بجتی
رہی۔ چاروں طرف چراغ جھلملاتے رہے۔ ملک بھر کے کتنے گھروں کے آنگنوں
میں لکشمی کے بجائے یم دوت منڈلا رہے تھے۔ کتنے ان گنت گھر اندھیرے پڑے
تھے۔ کتنے گھروں میں یم دوت اپنی بڑی بڑی اندھیاری کی سینائیں لے کر پہنچنے
والے تھے۔ وہ یہ سب سوچ کر آنکھیں بند کر لیتی۔ لیکن دئیوں کی روشنیاں اس کے
سُرخ پپوٹوں کے اندر جلتی اور ناچتی رہتیں اور اُسے خیال آتا۔ ارے ہم تو آزادی
کے دیوانے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ ہماری جنتا کے رہن سہن کے ڈھنگ کا معیار
اونچا ہو جائے۔ ہماری بڑی آرزو تھی کہ کوئی جاہل اور بھوکا نہ رہے۔ اقتصادی اور
طبقاتی کش مکش اور جہالت کی مجبوریوں سے ہم چھٹکارا پا جائیں۔ عوام جن کے
پاس کچھ نہیں ہے جو خود کچھ نہیں ہیں۔ اپنے دکھوں سے نجات حاصل کر سکیں۔ اس
کے لئے ہم اپنے باغ اور اپنے صوفوں پر بیٹھے نت نئی ترکیبیں سوچا کرتے تھے۔
نیو ایرا میں شعلہ ریز مضمون لکھتے تھے۔ یونین میں تقریریں کرتے تھے۔ ہڑتالیں
کرواتے تھے۔ لیکن جنگ کی کمائی کی وجہ سے جنتا کے رہن سہن کا معیار اونچا ہوا
اور کتب خانے، رات کے اسکول، اور اسی قسم کی دوسری آئیڈیل چیزیں
(جو بڑے بہترین ملکوں مثلاً سویٹ روس یا امریکہ میں ہوتی ہیں اور جن کا تذکرہ

ہر وطن پرست بڑے ارمانوں سے کرتا ہے) قائم کرنے یا ان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے جنتا نے رائل ٹاکیز اور نشاط سینما پر پہلے سے زیادہ تندہی سے دھاوے شروع کر دیئے۔ ان خواب پرستوں نے غفران منزل اور دوسری جگہوں پر رات کی کلاسیں کھولیں لیکن ان کے لائق طالب علموں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد شکوہ اقبال اور نہرو کی سوانح عمری کے پڑھنے کے بجائے فلمی رسالے اور جاسوسی ناول خریدنے شروع کر دیئے ہم نے آزادی کے لئے برطانوی فوج اور پولیس کی گولیاں کھائیں اور جیلوں کی چکیاں پیسیں اور آزادی ملتے ہی ہم نے خون کے سمندر میں ایک دوسرے کو دھکیل دیا۔ ہم نے پڑھے لکھوں کے طبقے میں ٹیسٹ کا احساس و شوق پیدا کرنا چاہا ٹیسٹ جس کا ملک بھر میں اتنا فقدان ہے۔ ہم نے آرٹ کی نمائشیں منعقد کیں اور ہمیں ایک فی صدی بھی آرٹ کو سمجھنے یا پرکھنے والا کہیں نہیں ملا۔ ان ساری کوششوں کا انجام بالآخر یہی ہوتا ہے۔

وُہ اپنے "آئیڈیلز" اور "اصولوں" کی خاطر ایک مرتبہ پی چُو سے لڑی تھی۔ انہیں آئیڈیلز اور اصولوں کی وجہ سے پی چُو اب جانے کہاں کہاں کن جنگلوں اور میدانوں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔

ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ وہ سوچتی۔ ترقی اور رجعت۔ ہم آگے جاتے ہیں اور پھر واپس چلے آتے ہیں۔ ہم ایسی تصویریں بناتے ہیں جو انسان نے پہلی بار چٹانوں اور غاروں کے پتھروں پر بنائیں اور سمجھتے ہیں کہ بس زندگی کی اصل حقیقت اصل ترقی یہ ہے۔ باقی درمیانی اور اس سے قبل کے وقفے کی ترقی سب بکواس تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم آگے کبھی نہیں بڑھ پاتے۔ میں جو یہ امداد باہمی کے

رجسٹروں پر سر کھپا رہی ہوں۔ اس سے کرواہا راج کے چند ہزار نفوس کے علاوہ ساری دُنیا پر کیا اثر پڑے گا۔ ان رجسٹروں کے ہونے نہ ہونے سے وجود کی ٹریجڈی پر کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ یہ کسان، انگریزی سرکار کے ڈپٹی کلکٹروں کے راج میں بھی وہیں پر تھا۔ جہاں پر نواب آصف الدولہ کے زمانے میں یا اجودھیا نگری کے راجاؤں کے وقتوں میں تھا۔ یہ اب ان ساری امداد باہمی کی اسکیموں اور گرام سدھار کے محکموں اور گرہ۔ اڑاتی لاریوں اور ٹیوب کے کنوؤں کے باوجود بھی وہی ہے اور اب اُسے جس طرف بھی گھسیٹ کر لے جانے کی کوشش کی جائے یہ وہی رہے گا — دُنیا کا اوّلیں، ازلی حقیقی انسان — حقیقت تو ہمارے نائٹ اسکولوں اور ہماری نئی آزادی پر قہقہے لگا رہی ہے۔ صرف گدھ اور کچی سڑکوں کے بیمار لیمپ اور یہ رینگتے ہوئے انسان اصل حقیقت ہیں۔

اور پھر اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ اگر انسانیت لڑھکتی لڑھکاتی مارتی مرتی بالآخر ایک نئے اُفق پر پہنچ گئی اور عربوں اور یہودیوں نے ایک دوسرے پر بم پھینکنے کی عادت ترک کر دی اور سردار بنتا سنگھ نے فضل داد خاں کے پیٹ میں کرپان بھونکنے سے سچے دل سے توبہ کر لی تو ان سب باتوں کا اسے، یعنی رخشندہ بیگم کو کیا خاص فائدہ پہنچے گا۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں اور وہ اکتا کر ریاست کے دفتر کے رجسٹر ایک طرف کو پھینک دیتی اور سوچتی کہ ترلوچن کہار کے پچپن روپے چار آنے بقایا کی ادائیگی کے خیال کے مقابلے میں محض یہ ایک شعر ہے

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

زندگی کے لئے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ زندگی میں بس صرف اس ایک شعر کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہئے۔

دن گذرتے گئے۔ آسمان پر مرغابیوں کی ڈاریں شور مچاتی جنگلوں کی طرف نکل جاتیں پھول کھلتے رہے۔ حویلی کے باغ میں رہٹ اپنی ٹھنڈی، سکوں بخش منزنم آواز میں رواں رواں کرتا چلتا رہتا۔ شہ نشین میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے وہ محسوس کرتی۔ کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے۔ جب یہ خدا کی خوبصورت زمین یہ باغ، یہ کھیت، یہ چیزیں اس سے چھن جائیں گی۔ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ اسے معلوم نہیں تھا لیکن اس کے دل میں یکلخت یہ مبہم سا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ یہ زمین، یہ گیہوں کی بالیاں، یہ خوشبودار مٹی، یہ فضائیں جن کو وہ اتنا چاہنے لگی ہے۔ اب اس کا ان سے کوئی تعلق نہ رہ سکے گا۔

سہ دری میں بیٹھے بیٹھے اسے خیال آتا۔ رخشندہ بیگم ساری بات دراصل یہ ہے کہ تمہیں اپنی صلیب خود اٹھانی پڑے گی۔ کوئی دوسرا تمہارے لئے تمہاری صلیب نہیں اٹھا سکتا۔ تم اپنی صلیب کا بوجھ نہ سہار سکتی تھیں اور تم نے پناہ لینی چاہی تھی۔ ہاں سمجھیں تم۔ واقعہ صرف یہی ہے کہ تم نے پناہ لینی چاہی تھی۔

وقت تیزی سے آگے نکلتا گیا۔ کنور صاحب ہر سال گرمیاں آتے ہی مانا ٹھیر یا لکھنؤ سے نینی تال چلے جاتے تھے۔ اس مرتبہ بھی ان کا ارادہ تھا کہ برسات سے پہلے پہلے وہ مانا ٹھیر سے روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن ایک روز لالہ اقبال نارائن

ہانپتے کانپتے حویلی کے دیوان خانے میں داخل ہوئے اور عرض کی۔ کہ منشی دوارکا پرشاد لکھیم پور کھیری کے علاقے میں جب تحصیل وصول کے لئے پہنچے تو گاؤں کے سارے ٹھاکر لٹھ لے کر چوپال پہ پہنچ گئے اور ان سے بولے۔ کہ "کنور صاحب سے کہو پاکستان کاہے ناہیں چلے جات ہیں۔ ہم تو اب ایکو ڈبل لگان نہ دیبا۔ ہم اب آجاد ہیں۔ ایکو مسلمان جمیندار کی گلامی نہ کربا۔ چاہے چودھری ہوں چاہے کنور اپنے گھر کے ہوئی ہیں۔ ہمرے اوپر اب کاہے کا رُعب جماوت ہیں؟" اب اگر ہمارے پیادوں اور ان مفسدوں سے جھڑپ ہوگئی تو سرکار کو خواہی نخواہی کو دروسری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ فضا ویسے بھی بے حد خراب اور تشویشناک ہو رہی ہے۔ پل کی پل میں جانے کیا سے کیا ہوجاوے لہٰذا غلام کی رائے یہی ہے کہ بٹیا جلد از جلد لکھنؤ چلی جاویں"۔ کنور صاحب نے لالہ کی رائے سے مکمّل اتفاق ظاہر کیا۔

چنانچہ وہ انجمن امداد باہمی کے رجسٹر اور ڈسپنسریوں کی دواؤں کی فہرستیں ریاست کے دفتر کے گودام میں پھینک کر لکھنؤ واپس آگئی۔

لکھنؤ اس کی غیر موجودگی میں بالکل بدل گیا تھا۔ ہر طرف بالکل اجنبی چہرے نظر آرہے تھے۔ ان گنت پریشان، بیکار، دکھی انسانوں کا ٹڈی دل تھا جو ہر جگہ کٹی پتنگوں کی طرح ڈولتا دکھائی دیتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہمیشہ کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر وہاں آئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو آزادی کے سواگت میں اپنا گھر بار اپنی زمینیں اپنا سب کچھ لٹا کر ایک اجنبی دیس میں آپہنچے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے۔

جنہیں 'شرنارتھی' کہا جاتا تھا۔ ان کے بھی مختلف طبقے تھے۔ غریب شرنارتھی جو بالکل لٹ کر صرف اپنی جانیں، اپنی پرانی یادیں اور اپنی بے پناہ نفرتوں کا زادِ راہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ انہیں شہر سے باہر مضافات کے کیمپوں میں رکھا گیا تھا اور انہیں رات کے آٹھ بجے کے بعد شہر میں گھومنے پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ دولتمند شرنارتھی جو بڑے بڑے انگریزی ہوٹلوں یا کوٹھیوں میں یا اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ ہر وقت اسکیٹنگ کرتے، شرابیں اڑاتے، اپنی بیویوں اور لڑکیوں کو بال روم ناچ سکھانے کے اسکولوں پر چاندی کی بارش ہو رہی تھی۔ انہوں نے آتے ہی ٹھیکے لینے شروع کر دیئے تھے اور دوسری ڈومینین کو ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی جائدادیں کوڑیوں کے مول خرید رہے تھے۔ لکھنؤ میں 'مقامی' اور 'بیرونی'، 'ملکی' اور غیر ملکی کا فرق وفعتہً بڑی شدت سے محسوس کیا جانے لگا تھا۔ قہوہ خانوں میں بیٹھے ہوئے مقامی لوگ ان باہر سے آکر دھاوا بولنے والے پنجابیوں کو جو اپنے خاندانوں سمیت، موٹی موٹی بے ہنگم عورتوں، اور بے حد اسمارٹ لڑکیوں کے ساتھ قہوے خانے میں داخل ہو کر ہر میز پر اطمینان سے گھنٹوں کے لئے قبضہ جما لیتے اور زور زور سے باتیں کرتے رہتے۔ انہیں دیکھ کر ان کی نظریں خاموشی اور بے چارگی سے ایک دوسرے سے کہتیں ۔ دیکھو۔ یہ لاؤڈ، یہ شور مچانے والا پنجابی ہمارے شہر کی مہذب فضا کو برباد کئے دے رہا ہے۔ ہمارے کاروبار پر چھایا جا رہا ہے۔ عرب کے روایتی اونٹ کی طرح اپنی چالاکی اور عیاری کی وجہ سے الٹا ہمیں ہی، اپنے میزبانوں کو، بیوقوف بنا کر فائدہ اٹھانے

کی فکر میں ہے۔ کتنی عجیب و غریب صورتِ حال تھی۔ اپنی زمین، اپنے ماحول کی محبت، اپنے ہم وطنوں کی محبت، اپنے شہر اور صوبے کی محبت، یہ چیزیں انسان کو ان زیادہ وسیع اور بلند لیکن محض تھیوری کی ہمدردیوں یا وفاداریوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عزیز ہوتی ہیں جن کے لئے فرقے اور قومیں ایک دوسرے کا گلا کاٹتی ہیں۔ یہ شترنا رتھی، سب ظاہر تھا کہ مسلمانوں سے پٹ کے اپنے وطن سے بھاگ کر وہاں آئے تھے۔ لیکن ایک یو۔ پی کا ہندو اپنے ہم وطن مسلمان دوست کے ساتھ بیٹھ کر سردار صاحبان کے لطیفے ایک، دوسرے کو سنا کے یا "اک خطۂ پنجاب ہے معلوم نہیں کیوں" والا شعر پڑھ کر قہقہہ لگا کے فطری طور پر زیادہ خوش ہوتا تھا۔ اپنے آپ کو اپنے ہم وطن سے زیادہ قریب سمجھتا تھا۔

کرسٹابل ولایت روانہ ہونے کے لئے بمبئی جا چکی تھی۔ کرن بھی اپنے اخبار کی طرف سے بمبئی بھیجدیا گیا تھا۔ ومل کو اب ریڈیو پر مشاعروں کے بجائے کوی سمیلن کروانے پڑ رہے تھے اور وہ کوئی تاؤں کی زبردستی داد دینے کے لئے مائیک پر بیٹھا اتی سندر۔ اتی سندر کہتا رہتا تھا۔

گنی گورنمنٹ ہاؤس کی ورک پارٹیوں میں پناہ گزینوں کے لئے کام کرتے کرتے دفعتاً رک کر سوچتی۔ "میں یہ سب کیا کر رہی ہوں۔ اس کا کیا فائدہ ہے۔ درخشندہ کہتی تھی گنی ڈارلنگ تم تصویریں بنایا کرو۔ میں کیوں بناؤں تصویریں؟ میں ہرگز نہیں بناؤں گی۔ گلیمر بوائے کا پورٹریٹ بھی نہیں بناؤں گی۔ شترنارتھیوں کے لئے موزے بھی نہیں بنوں گی۔ میں کیوں یہ سب کچھ کروں؟ مسز لیشو دھرا کول اس کی شادی کی تیاریوں میں بے طرح مصروف تھیں۔ انہوں نے درخشندہ

سے کہا۔" بی بی یہ تمہاری گوئیاں تو کچھ کرتی نہیں کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتی
اب تمہیں بتاؤ کہ میں اس کی پسند معلوم کیئے بنا سارا سامان کیسے بنالوں۔ تم
لوگ گنج جاؤ۔ جیسے تم سب ہمیشہ اکٹھی جایا کرتی تھیں اور اس کی مرضی کے مطابق
چیزیں خرید لاؤ۔" بہت اچھا لیشو دھرا موسی"۔ رخشندہ نے بے حد سعادت مندی اور
فرمانبرداری سے جواب دیا اور ڈائمنڈ اور دوسری سہیلیوں کے ساتھ سارا سارا
دن دوکانوں میں صرف کرنے لگی۔ جب خریداری کرتے کرتے وہ سب تھک جاتیں
تو میگنولیا یا کافی ہاؤس جا کر تازہ دم ہوتیں اور پھر مصروف ہو جاتیں۔ انہوں نے
لیلارام اور رائل سلک ہاؤس اور سلک پیلیس کے کاؤنٹرز پر کپڑوں کے انبار
خرید خرید کر ڈال دیئے۔ انہوں نے کندن کے بہترین گہنے تیار کروائے۔ وہ
جیکبز کے ہاں گئیں اور فرنیچر کا انتخاب کیا۔ کتنا بڑھیا فرنیچر اُفوہ۔ ڈائمنڈ
چلاّئی۔ وہ شوروم کا چمکیلا سامان دیکھتی پھریں۔ یہ صوفہ سٹ۔ وہ سنگھار میز
وہ والا شیلف۔ وہ ادھر والا سائڈ بورڈ زیادہ اچھا رہے گا کیوں روشی ڈارلنگ
اور وہ مسہری۔ نہیں یہ زیادہ خوبصورت ہے بس یہ ہے ساری بات۔ ساری عمر کا
ماحصل محض یہ ہے۔ چوبیس سالہ زندگی سمٹ سمٹا کر اس ایک نقطے پر آجاتی ہے:
— وہ والی مسہری۔ یہ والی سنگھار میز — کیوں روشی ڈارلنگ؟" رخشندہ نے
سوچا۔ لیکن جب وہ ساری چیزیں لاد کر کرشن نرائن کول کے گھر پہنچیں تو انہیں
معلوم ہوا کہ کتنی ہڑ دوار چلی گئی ہے۔

"اس سے زیادہ حماقت کی خبر کبھی سنی تھی تم نے؟" ڈائمنڈ نے انتہائی
بے چارگی سے اس کے جہیز کے صوفہ سٹ کی ایک کرسی پر گرتے ہوئے تقریباً

چلا کر کہا۔ "او گوش۔"

"اوووو گوش۔۔!! دوسری لڑکیاں چلائیں

"تمہیں ضرور مکتی ملے گی گنی ڈارلنگ"۔۔ رخشندہ نے چپکے سے کہا۔ "تمہیں ضرور مکتی ملے گی۔ مجھے معلوم ہے"۔ اسے اب سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔

تب ایک صبح پوتو کے پاس لالہ اقبال نرائن کا تار آیا۔ "علاقے میں فساد ہو گیا۔ جلدی پہنچیے"۔

پوتو اپنے کمرے میں بیٹھا اپنے نئے ٹیریر کتے کو "ہاؤ ڈو یو ڈو" اور آج کتنی خوشگوار صبح ہے، کہنے کا طریقہ سکھلانے میں مصروف تھا۔ عباسی خانم ہڑبڑائی ہوئی تار لے کر اس کے کمرے میں آئیں۔ "یا مولا رحم کیجیو۔۔ خیریت تو ہے بھیا" جب پوتو تار پڑھ چکا تو انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔ "ارے خیریت کہاں ہے عباسی خانم"۔۔ پوتو نے کتے کو زنجیر سے باندھتے ہوئے اکتا کر کہا اور پھر تار لے کر رخشندہ کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

رخشندہ پھر مانا ٹھیر جانے کے لئے تیار ہوئی۔ ٹرین ایک بار پھر اٹھلاتی شور مچاتی چھوٹی لائن پر آگے روانہ ہوئی۔ چار باغ جنکشن سے نکل کر وسطِ شہر کے اسٹیشنوں میں سے ہوتی ہوئی گذری۔ عیش باغ۔ آغا میر کی ڈیوڑھی۔ ڈالی گنج یہ جگہیں جہاں پرانے، اصل لکھنؤ کی جان اور روح اب تک موجود تھی۔ یہ مقامات جہاں اودھ کی دم توڑتی ہوئی پرانی زندگی کی ایک جھلک اب بھی نظر آ جاتی تھی۔ یہاں کی فضا بھی اب بالکل بدل گئی تھی۔ مسلمانوں کے چہروں پر خوف و ہراس طاری تھا

خود اپنے وطن میں وہ اپنی بے وقعتی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ ٹرین اپنے معمول کے راستے پر اس تبدیلی سے بے نیاز، آگے کی طرف بڑھتی رہی۔ ایکھ کے کھیت آم کے باغ، از ابلا تھوبرن کالج کی نو آبادی، یہ سب مناظر ہمیشہ کی طرح کھڑکیوں میں سے نظر آتے رہے۔ ان ہی مانوس، پرانے راستوں پر سے وہ ان گنت مرتبہ ہنستے شور مچاتے گذرے تھے۔ ککریل، چنہٹ، بخشی کا تالاب، ملہور۔ یہ ساری جگہیں جہاں وہ ہر سال ساون مناتے جایا کرتے تھے۔ ویسی ہی موجود تھیں سب کچھ وہی تھا۔ لیکن دنیا بدل چکی تھی۔ دنیا بالکل بدل چکی تھی۔

پوٹو کھڑکی کے قریب چپ چاپ بیٹھا پائپ کا دھواں اڑاتا رہا۔ رخشندہ کھڑکی میں سر رکھے خاموشی سے باہر کی طرف دیکھتی رہی۔ مضافات کے یہ مانوس مناظر لحظہ بہ لحظہ دور ہوتے جا رہے تھے۔ فضا میں گرمی بڑھ رہی تھی۔ کمپارٹمنٹ بالکل خالی تھا۔ صرف ایک سکھ کپتان ان دونوں کی طرف سے پیٹھ کئے اخبار میں مصروف تھا۔

تھوڑی دیر بعد پوٹو نے اپنے ہمسفر اس وردی والے سکھ نوجوان سے بڑے اخلاق سے کہا۔ "کیپٹن صاحب اگر آپ کو گرمی محسوس ہوتی ہو تو پنکھا چلا لیجیئے۔" سوئچ اس کے بالکل قریب تھے۔ لیکن اس نے خود اٹھ کر پنکھا چلانے کی زحمت نہیں کی۔ لکھنؤ کا رئیس کتنا ہی لٹ جائے۔ اپنے ہاتھ سے کبھی کچھ نہیں کرے گا۔ صرف دوسروں کو حکم دے دیگا۔ پوٹو بھی لکھنؤ کا رئیس تھا جس کے گھرانے کی امارت اب صرف نام کی باقی تھی اور جو رہی سہی تھی بھی وہ بہت جلد ختم ہو جانے والی تھی۔ لیکن نوابی کی بو آسانی سے جانے والی چیز نہیں۔ وہ پی جو کی طرح بندوق ہاتھ میں لے کر قواعد پریڈ کر کے روزی کمانے والا آسامی نہیں تھا۔ اسے صرف اپنا فلائینگ کلب

چاہئے تھا اور اپنے کتے چاہئیں تھے۔ اس کے علاوہ اسے دنیا میں کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ چنانچہ اُس نے اپنے ہمسفر کو بڑی بے تعلقی لیکن اخلاق کے ساتھ حکم دیا کہ پنکھا چلا لیجئے اور پھر پائپ میں مصروف ہو گیا۔

مقابل کی برتھ پر بیٹھے ہُوئے سکھ کپتان نے اپنے ہم سفر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ دونوں یقیناً مسلمان ہیں۔ اس نے سوچا۔ کیونکہ ان کے اسباب کے ساتھ مراد آبادی منقش لوٹا رکھا ہے (مسلمان ہیں کمبخت اس نے دل میں سوچا) ویسے اسے پتہ نہ چلتا کہ یہ دونوں مسلمان ہیں یا ہندو ہیں یا کائستھ ہیں یا برہمن ہیں یا کیتھولک ہیں یا پروٹسٹنٹ ہیں۔ دو قوموں کے نظریئے نے اس کی زیادہ وضاحت نہ کی تھی کہ برّ عظیم کی دونوں قوموں میں جو نسل، رنگ، تہذیب، زبان، روایات اور معاشرت کے اعتبار سے اس قدر بے انتہا مختلف ہیں۔ ایسے موقعوں پر جبکہ ان میں سے ایک کے پاس مراد آبادی لوٹا نہ ہو تو فرق کیسے معلوم کیا جائے۔ کیونکہ اب تک اپنے سروں پر سینگ یا "چھوٹی گنتی والی جاتی" اور "بڑی گنتی والی جاتی" کا بورڈ کوئی نہ لگاتا تھا اور قوموں میں اس بالکل قطبین کے سے اختلاف کے باوجود جس کی مفصّل فہرست اس نظریئے میں بیان کی گئی تھی۔ سب کمبخت ایک سا لباس پہنتے تھے۔ ایک زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ایک طریقے سے رہتے سہتے اور جیتے تھے۔ صرف مرنے کا طریقہ مختلف ایجاد کر لیا گیا تھا۔ اس میں یہ تھا کہ ایک دوسرے کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر مکتی دے دی جاتی تھی۔ خود الگ الگ اپنی ذمے داری پر مکتی حاصل کرنے کی ضرورت اب نہ رہی تھی۔ سب یا شہید تھے یا امر تھے اور جو باقی بچے تھے وہ شرنارتھیوں اور پناہ گزینوں اور اغوا شدگان کے

گلوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ زندگی کے پرابلم کا جو حل گوتم، عیسیٰ، سینٹ فرانسس، ٹالسٹائی کسی بیوقوف کو نہ سوجھا تھا اتنی آسانی سے دریافت کر لیا گیا تھا۔

چنانچہ اس وقت تو اُسے معلوم ہو گیا کہ یہ دونوں جو شکل سے بہن بھائی معلوم ہوتے ہیں مسلمان ہیں ان لوگوں کے سوٹ کیسوں پر ان کے نام کے ساتھ کنور اور راجکماری بھی لکھا اسے نظر آیا اور تب اُسے بڑی حیرت ہوئی کہ انہوں نے اپنے آدھے نام ہندوانہ کیسے رکھ چھوڑے ہیں۔ لیکن یہ کیپٹن اجیت سنگھ اہلووالیہ ۱۹ جاٹ رجمنٹ اپنے اسکول کے زمانے میں تاریخ کے مضمون میں کمزور رہا ہوگا۔ کیونکہ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ کنور اور ٹھاکر اور مہاراجہ کے خطابات شاہان اودھ نے مسلمانوں کو اس زمانے میں دیئے تھے۔ جب دو قوموں کے نظریئے اور قوم کے موجودہ مفہوم کو سمجھنے کی سیاسی قابلیت کسی میں نہ تھی اور جب ملک میں قومی شعور اور جاگرتا بالکل نہ پھیلی تھی "ہنہہ ــــ مسلمان ہے کمبخت ــــ شور دانتیر ــــ کہتا ہے کیپٹن صاحب پنکھا چلا لیجیئے" ــــ اسے سوچ کر غصہ آیا اور اسے یاد آ گیا کہ وہ اس وقت چھٹی لے کر کہاں اور کس لئے جا رہا ہے ــــ وہ اندر ہی اندر کھولتا رہا ــــ وہ کیوں چلائے پنکھا۔ وہ جو مارنے اور مرنے جا رہا ہے۔ اسے دُنیا کی ان فانی آسائشوں کی کیا پرواہ ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس وقت یقیناً بہت وجیہہ لگ رہا ہوگا۔ جبھی اس لڑکی نے کھڑکی میں سے سر اٹھا کر اسے ایک نظر بھر کے دیکھا تھا۔ اس نے اپنی محنت سے کرل کی ہوئی نفیس داڑھی پر انگلیاں پھیریں۔ لیکن اس کا غم و غصہ اور جوش بڑھتا گیا۔ وہ چھ سال سے انڈین آرمی میں تھا اور جاپان اور مصر تک گھوم آیا تھا اور اپنے یونیفارم میں بے حد اسمارٹ لگتا تھا اور ایک زمانے میں دیال سنگھ کالج کا ہیرو

کہلاتا تھا۔ لیکن اب اُسے اپنی خوبصورتی کی پرواہ نہیں۔ اسے اس حسین لڑکی کی بھی پروا نہیں جو اس کے سامنے بیٹھی ہے اور جس کا آدھا نام ہندو ہے اور آدھا نام مسلمان ہے وہ اب شہید ہوگا۔ کملا کی خاطر۔ اندرجیت کی خاطر۔ کاکاجی کی خاطر۔ وہ سور، وہ کتے، اندرجیت کو پکڑ کر لے گئے۔ کملا کو پکڑ کر لے گئے۔ گارگی کو انہوں نے چاچاجی کے سامنے قتل کیا۔ بھراجی کو انہوں نے مار ڈالا۔ وہ سب کو قتل کرے گا۔ ایک ایک کو چُن چُن کر اپنے پستول کا نشانہ بنائے گا۔ امرسر پہنچتے ہی وہ سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔

ٹرین دھیرے دھیرے کرواہا راج کے علاقے میں داخل ہوئی۔ کھیتوں کے پرے حدِّ نظر تک ایک اُجاڑ سی اور ویران بستی نظر آرہی تھی۔ جگہ جگہ راکھ کے ڈھیر تھے اور اینٹوں کا ملبہ تھا اور لہریں مارتی بے رونق دھوپ میں چیلیں منڈلا رہی تھیں اس ہرے بھرے گاؤں میں اب ان کے لئے مرغابیوں کے شکار اور ڈھولک کے گیت، اور گنگا گرا کی کشتی رانی نہیں تھی۔ وہاں پر صرف راکھ کے ڈھیر تھے اور آپس کی نفرت تھی اور شرنارتھیوں کے کیمپ تھے۔

لکڑی کے اس چھوٹے سے ہرے اسٹیشن پر جو کھیتوں کے درمیان رکھا ہوا گڑیا کا گھر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ لالہ اقبال نرائن بھیا اور بٹیا کو حفاظت سے حویلی تک لے جانے کے لئے لٹھیت پیادوں کا ایک چھوٹا سا دستہ لے کر دیر سے آئے بیٹھے تھے۔ بہلی میں وہ اپنا موٹا ڈنڈا لے کر سب سے آگے بیٹھ گئے۔ بٹیا کے پردے کے خیال سے ہمیشہ کی طرح بہلی کے دروازے کو سُرخ اور سفید کٹاؤ کے کام کی چادروں سے بند کر دیا گیا۔ ان سڑکوں پر جہاں کھیتوں میں کام کرتے ہوئے

کسان مرد اور عورتیں ان کی بہلی یا موٹر دکھائی دیتے ہی دوڑتے ہوئے منڈیروں پر آ کر چلاتے تھے ۔" بٹیا بھیا لوگ سب جنے آگئیں۔ بندگی بٹیا۔ بندگی بڑے بھیا۔" وہاں پر صرف ببول اور بیری کے پیڑ جھکے ہوتے تھے۔ پگڈنڈیوں پر خاک کے بگولے اڑ رہے تھے۔ قصبے کی بڑی سڑک پر سے جو راستہ شرنارتھیوں کے کیمپ کی طرف جاتا تھا۔ اس پر پولیس کی چوکی بٹھادی گئی تھی۔ سپاہیوں کی سنگینیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔

یہ ان کا قصبہ تھا۔ وہ چھوٹا سا پُرسکون، پُرامن قصبہ جو ہرے جنگلوں اور چراگاہوں کے درمیان گھاگرا کے کنارے سینکڑوں برس سے رستا بستا آیا تھا۔ جہاں سب مل کر سال بھر کوئی نہ کوئی تہوار مناتے رہتے تھے۔ جہاں سبھی کا ایک دوسرے سے صدیوں کا بھائی چارہ اور میل ملاپ تھا۔ سبھی ایک دوسرے کو کسی نہ کسی رشتے داری کے نام سے پکارتے آئے تھے۔ سبھی ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے شریک تھے آج دس بلّم برداروں کی محافظت میں وہ اس قصبے میں داخل ہوئے تھے۔ یہاں انہوں نے ہولی پر حویلی اور محلے کے بچوں کے ساتھ ہوا میں گلال اور عبیر اڑایا تھا۔ یہاں انہوں نے رام لیلا پر راون کے جلنے اور سروپ نکھا کی ناک کٹنے پر بچپن میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اکٹھی خوشیاں منائی تھیں۔ یہاں انہوں نے دیوالی پر کھانڈ اور مٹی کے کھلونوں سے اپنے گھروندے سجا کر حویلی میں چراغاں کیا تھا۔ یہاں انہوں نے بچپن میں دیوانخانے کی ڈیوڑھی کے کھرے پلنگوں پر کود کود کر اور شور مچا کر لالہ اقبال نرائن اور دوسرے کائستھ منشیوں سے اردو اور فارسی پڑھی تھی اور آمدنامہ رٹا تھا۔ یہ ان کا قصبہ تھا۔ یہاں کسی کو پتہ نہیں تھا کہ کون ہندو ہے۔ کون مسلمان ہے

کون شیعہ ہے۔ کون سُنّی ہے۔ اپنے دکھوں اور تکلیفوں کے باوجود زندگی بڑی مکمّل پُرمسرت اور قانع تھی۔ پُرانی روایات کی پابندی اور قدیم چلن کو نبھانا سب کا مقدّس فریضہ تھا۔ لیکن قومی راہنماؤں اور ہمدردوں نے یکایک یہ انکشاف کیا کہ ہماری جنتا میں سیاسی حس کا شدید فقدان ہے اور MASS CONTACT کی غرض سے سیاسی کام کرنے والوں نے باہر سے آ آ کر اس میدان میں جہاں اب تک صرف کبڈی اور پتنگ بازی کے مقابلے اور مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے دھوآں دھار تقریریں شروع کیں تو اس پُرسکون نگری کے باسیوں میں سے کوئی یہ نہ کہہ سکا تم واپس چلے جاؤ۔ ہم تمہارے بغیر بھی بڑے مزے میں ہیں۔ سب ان کے لاؤڈ اسپیکرز کے نعروں اور موٹروں پر لہراتے ہوئے رنگ برنگے جھنڈوں سے مرعوب ہو گئے۔

الیکشن کے زمانے میں وہاں پر عظیم الشان سیاسی اکھاڑے قائم کئے گئے۔ میدان کے وسط میں پیپل کے چبوترے پر ایک جھنڈا لہرایا گیا۔ اس کے مقابلے میں فوراً تین چار جھنڈے اور کھڑے کر دیئے گئے۔ لاؤڈ اسپیکر ہر وقت شور مچانے لگے۔ وہاں پر سیاسی شعور اچھی طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اور اب وہاں سے ایک وفد پنت جی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ دوسرا چودھری خلیق الزماں کے پاس بھیجا جا رہا تھا۔ الگ الگ دفاعی کمیٹیاں بن گئی تھیں۔ بازار، منڈی اور محلّے تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ ضلع کی چھاؤنی میں سے ایک انگریز میجر کی قیادت میں گورکھا سپاہیوں کا دستہ امن قائم کرنے کے لئے پہنچ چکا تھا۔ ہند میں جاگرتا پھیل گئی تھی۔ ہند کو آزادی مل رہی تھی۔

دن بھر وہاں پر عبادت خانوں کے بے نور وحشتناک سفید گنبدوں اور بیمار مٹیلے کلسوں پر گدھ بیٹھے اونگھا کرتے۔ ویران مکانوں کی چھتوں پر چیلیں منڈلاتی رہتیں

حویلی کا ایک حصہ بلوائیوں نے جلا دیا تھا۔ غلے کا مکان سارا لوٹ لیا گیا تھا۔ شاگرد پیشے اور پرانے دیوانخانے میں پنجاب کے پناہ گزین آن بسے تھے۔ امریکن مشن کے ہسپتال میں ہر وقت زخمیوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ مشنری عورتیں مقدس خاندان کی خوبصورت رنگین تصویروں کے کارڈ اور کپڑوں اور فرسٹ ایڈ کے ساماں کے بنڈل سنبھالے انگریزی حمدوں کی دھنوں پر نکالے ہوئے اُردو بھجن گاتی فسادزدہ بستیوں میں گھومتی پھرتیں — وہ ایک ساتھ مل کر اپنی باریک اور مغربی موسیقی کے سروں کی عادی لرزاں آوازیں اٹھاتیں — آنکھوں میں نور تیرا، دل میں سرور تیرا، جگ میں ظہور تیرا، آجا تو یسوع پیارا — اور — راجہ یسوع آیا راجہ یسوع آیا۔ بھیڑوں کا رکھوالا بن کر راجہ یسوع آیا — اور — او چھوٹے شہر بیت لحم ہم آنے ہیں ہم آتے ہیں — اور اس ناگوار، سنسناتے ہوئے سناٹے میں ان کی آواز دیر تک سنسان گلیوں میں گونجتی رہتی

کنور صاحب نے یکلخت محسوس کیا کہ وہ بے حد کمزور ہو گئے ہیں۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے دفعتہً اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر اُسے غور سے دیکھنا شروع کیا۔ جس کی انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں تھیں — وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کا دل اس بے بسی اور بیچارگی سے دھڑکتے دھڑکتے تھک گیا تھا۔ ان کا جسم کمزور ہو گیا تھا۔ قانون شیخ اور دیوان حافظ سمیت ان کے کتب خانے کی ساری کتابیں بالکل بے معنی تھیں۔ دنیا بدل گئی تھی۔ جو وہ کبھی نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ وہ اب بھی زندہ تھے۔

انہوں نے دیوان خانے کے چبوترے کی سُرخ جالی دار پتھر والی چوکی پر سے

اٹھ کر چاروں طرف ایک نظر ڈالی۔ آفتاب خانقاہ کے میناروں تک پہنچ چکا تھا۔ زوال کا وقت تھا اور دھوپ ڈھلنے والی تھی۔ باغ کے درخت ساکت کھڑے تھے امرودوں کے جھرمٹ میں سے 'شرنارتھیوں' کے کیمپ تک جانے کے لئے راستہ نکالا گیا تھا۔ آس پاس کی چراگاہوں اور میدانوں میں حدِ نظر تک پناہ گزینوں کے خیمے نظر آرہے تھے (صوبے کی حکومت نے اس علاقے کے ایک حصّے کو اس کی ہریالی اور زرخیزی کی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ پناہ گزینوں کے سیٹلمنٹ کا بڑا مرکز بنانے کے لئے منتخب کیا تھا) وہ یہ منظر دیکھتے دیکھتے تھک کر دیوان خانے کے برابر والے کمرے میں اپنی مسہری پر جا لیٹے۔ کمرے کے اونچے اونچے دروازوں اور کھڑکیوں کے رنگ برنگے شیشوں میں سے چھنتی ہوئی دھوپ اس کے گرد آلود پرانے فرنیچر پر پڑ رہی تھی اور اس کی کرنوں کی زد میں آکر اڑتے ہوئے ذرّے کندن کی طرح دمک رہے تھے۔ چاروں طرف سجی ہوئی پرانی تصویریں، صوبے کے گورنروں کی الوداعی دعوتوں کے موقعوں کی یادگاریں، شیر کے شکار کی پارٹیوں کے گروپ، عہدِ رفتہ کے دوستوں اور عزیزوں کی دھندلی شبیہیں، جن کے شیشوں پر گرد جم گئی تھی اور جو کیل کی وجہ سے دیواروں پر سے ذرا نیچے کو جھک آئی تھیں۔ ان سب پر زوال کے وقت کی اس مٹیالی دھوپ کی کرنیں جگمگا رہی تھیں۔ حویلی کے سارے کمرے پڑے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ان کی بیٹی غالباً خیموں کی دیکھ بھال کے لئے باہر گئی ہوئی تھی۔ منجھلا بیٹا ایک شادی شدہ انگریز عورت کے چکّر میں گھر چھوڑ کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ دوسرا بیٹا دور باغ کے پھاٹک پر کھڑا مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ضلع کے دوسرے حکّام سے بلوے کے متعلق گفتگو کرنے میں مصروف تھا۔

انہوں نے لیٹے لیٹے اکتا کر قریب رکھی ہوئی کشمیری کام کی چھوٹی میز پر سے "قانون شیخ" اٹھا لی اور اس کی ورق گردانی کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن پھر کتاب ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور وہ دیوار کی طرف کروٹ بدل کے لیٹ گئے۔

"میاں خاصہ تیار ہے" ـــ تھوڑی دیر بعد گل شبو نے کمرے میں آکر ان سے کہا۔

"اٹھئے میاں ـــ خاصہ تیار ہے۔ یہیں لے آؤں ـــ؟" اس نے پائینتی کی طرف آکر دوبارہ کہا۔

لیکن میاں ختم ہو چکے تھے۔

تم نے ہمیں دیکھا۔ تم ہمت افزائی اور ہمدردی کی مسکراہٹیں بکھیرتی ہمارے سامنے سے گذر گئیں۔ تم نے ہمارے لئے گرم چیزیں بُنیں۔ کیمپوں میں ہمارے لئے کام کیا اور ہم خاموش تم کو دیکھتے رہے۔ ہمارے دماغ خالی ہیں۔ ہماری نظریں خالی ہیں۔ ہماری روحیں خالی ہیں۔ ہم کچھ سوچنا نہیں چاہتے۔ کچھ سمجھنا نہیں چاہتے ہماری آوازیں اپنی آوازیں نہیں ہیں۔ ہماری آوازیں کہیں گم ہو گئی ہیں۔ ہم سرگوشیوں میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم اپنے دلوں سے بھی باتیں نہیں کرتے۔ وہ جو اسی طرح آنکھیں کھولے کھولے اندھیرے کی وادی کے اس پار پہنچ گئے۔ ان کی پتلیوں میں ہماری تصویریں اسی طرح رہ گئی ہیں جس طرح اب ہم تمہارے سامنے کھڑے ہیں لیکن تمہاری آنکھوں میں کاجل ہے اور مسکراہٹ ہے اور تم یہاں سے جاکر یہاں کی خاک اور گرد اپنے سفید چینی کے ٹائلوں والے غسلخانوں میں دھو ڈالو گی اور شام

کو چائے کی میز پر بیٹھ کر اگلے روز کا پروگرام بناؤں گی۔ جنگل کی ہوائیں درختوں میں گا رہی تھیں اور کھیتوں پر شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ موت کے سُرخ اندھیرے کی وادی میں اُس نے ان بے حس پرچھائیوں کو ادھر اُدھر ڈولتے دیکھا اور وہ خوفزدہ ہو کر اپنے راستے سے ذرا پیچھے کو ہٹی۔ وہاں پر ناگ پھنی کی جھاڑیاں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے تلے چند مرے ہوئے انسان پڑے تھے۔ شیو کی مورتی کا گول، سیندور سے رنگا ہوا سُرخ پتھر اپنے استھان پر سے لڑھک کر نیچے گر پڑا تھا اور ہوا دریا کے پل پر سے نیچے لٹکتی ہوئی رسیوں کو ہلا رہی تھی (پھر اس خونیں اندھیرے کے پرے، موت کی اس دوسری دنیا میں وہ انسان جاگے جن کی آنکھیں اب بند ہو چکی تھیں۔ اُن کے لب لرزے۔ انھوں نے برہما وشنو مہیش کی تان پران مورتیوں کے چرنوں کو چھونا چاہا۔ لیکن مورتیاں استھان پر سے گر پڑیں وہ نیچے بکھری پڑی تھیں۔ مہ رنباں صدیوں تک اپنی بے رونقی، دہشت زدہ آنکھیں کھولے رہنے کے بعد اب گہری نیند سو رہی تھیں۔ زندگیوں کی کھوئی ہوئی جنتیں، سب اس اندھیارے کی تہہ میں جا گری تھیں۔ دریا کا پل صراط مستقیم سے بھی زیادہ مضبوط تھا اور ہوا سے اس کی رسیاں ہل رہی تھیں)

ان خالی کھوکھلے انسانوں کا گروہ بیچینی کے ساتھ جنگل کے تاریک راستے پر اپنے کیمپ کی نئی منزل کی طرف بڑھتا گیا۔

راجہ یسوع آیا۔ راجہ یسوع آیا —— سب بھیڑوں کا رکھوالا ابن کر راجہ یسوع آیا۔ وائی ڈبلیو سی اے کی عورتوں نے مل کر بھجن گانا شروع کر دیا اور ان کے خیمے کے آگے بھیڑ جمع ہو گئی۔ املی کے درخت کے نیچے ریورنڈ واکر کی سفید

کارواں کا رکھڑی تھی۔ انہیں سے للی کے پھولوں اور دواؤں کی تیز مہک نکل رہی تھی
انسان کے بیٹے نے کہا۔ "زندگی تمہارے لئے ہے۔ زندگی"
پُل کے پرے کاریں اسٹارٹ کی جانے لگیں اور پھر ایک ایک کر کے پُل
پر سے گذر گئیں۔

امیر پور راج کے انور اعظم نے جنگل کے اس تاریک راستے کے اختتام پر
آکر کار روک دی۔ اس کا انجن حسبِ عادت گرم ہو چکا تھا اور اس کے ریڈی ایٹر
کو تازہ، ٹھنڈے پانی کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ اس نے یہ ارادہ
نہیں کیا کہ ٹھاکر پرتاب سنگھ کی کوٹھی تک جا کر پانی منگوائے۔ اس نے اپنی خوبصورت
پیشانی کا پسینہ خشک کیا اور فٹ بورڈ پر ایک پیر رکھ کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ اس
نے دیکھا کہ برسات کا زمانہ ابھی دُور ہونے کے باوجود کرواہاراج کے علاقے ہمیشہ
کی طرح ہرے بھرے ہیں۔ اس کے سامنے کا وہ سُرخ بجری والا راستہ، انکھ کے
جھنڈ، گھاگرا کی روانی، اس زرد کوٹھی کے احاطے کی شکستہ دیوار، یہ سب چیزیں اپنی
اپنی جگہ پر اسی پُر سکون اور بے پرواہ انداز سے موجود تھیں۔ شرنارتھیوں کا قافلہ اگلے
کیمپ کے لئے روانہ کیا جا چکا تھا اور گورکھا دستے کا کمانڈنگ افسر میجر ڈیرک بیوے
کے جائے وقوع اور اس کیمپ کے پڑاؤ کا آخری معائنہ کرنے کے بعد اپنی کمانڈو
پر سوار ہو کر زناٹے سے ان ہرے کنجوں کی طرف نکل گیا تھا۔ جہاں ندی کے
کنارے چھاؤنی کا انگریزی کلب تھا اور اس کی موٹر کے شور کے بعد دفعتہً
وہاں پر بڑا شدید سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ امریکن مشن کے ریورنڈ واکر کی کارواں

کار اور ضلع کے حکام اور کیمپ میں امدادی کام کرنے والے دوسرے لوگوں کی موٹریں ایک ایک کر کے ندی کے پرانی کشتیوں والے پل پر سے گذر چکی تھیں اور اب وہاں وہی سکوت مطلق طاری تھا جو اس نے پہلی مرتبہ جب ادھر سے گذرا تھا۔ تب محسوس کیا تھا۔ اسے وہ گھنگھریالے بالوں والی لڑکی یاد آئی جو اس نے اس مرتبہ شکستہ دیوار پر کھڑی دیکھی تھی۔ وہ جانے اب کہاں ہوگی۔ وہ سب لوگ۔ اس وقت کہاں ہونگے۔ کیا کر رہے ہوں گے، کیا سوچ رہے ہوں گے، جو اس رات، اتنا شور مچا مچا کے اس پرانی زرد کوٹھی میں ڈنر کے بعد کے کھیلوں میں مصروف تھے۔ یہ سب کیوں ہے کیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ اتنی ہنسی کی بات ہے اور وہ خود اس وقت وہاں پر موجود تھا۔ وہ جو اتنا شریف، اتنا اچھا انسان تھا۔ وہ جو آرٹ اسکول کے باغ سے اس شام کو ٹین روز کے ساتھ ہے فیئر تک جا کر وہاں سے سیدھا گھر آ گیا تھا اور دیر تک سوچتا رہا تھا۔ کہ اپنے ضمیر کے خلاف وہ کوٹین روز کے ساتھ وہاں تک کیوں گیا۔ وہ جو اپنے بابا کی موت کی وجہ سے ریاست سے محروم کر دیا گیا تھا اور اس لئے رخشندہ سے شادی کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتا تھا۔ وہ اس وقت وہاں موجود تھا اور وہاں سے آگے جانے والا تھا۔ اس کے پاس صرف اس کی پرانی رفیق یہ نیلی ٹو سیٹر تھی اور خدا کی اتنی بڑی دنیا تھی اور چند پرانی یادیں تھیں

پھر اس نے دیکھا کہ پل پر سے اتر کر وہ اس کی طرف آ رہی ہے۔ وہ جو دن بھر فساد زدہ علاقوں اور پناہ گزینوں کے کیمپ میں کام کر کے تھک چکی تھی اور شاید اب اندھیرا پڑے، حویلی کی طرف واپس جا رہی تھی۔ جھٹ پٹے کی تاریکی میں وہ راستے کے اختتام کی سمت بڑھتی نظر آئی۔

"ارے ہلو گلیمر بوائے"۔ اُس نے کہا۔

اور وقت اپنی جگہ پر ٹھہر گیا۔ گویا ڈاکٹر سلیم، کنور صاحب کی موت۔ یہ فسادات، — یہ سب کچھ نہیں تھا۔ یہ سب ایک خواب تھا۔ وہ ابھی ابھی اس کے ساتھ دیوے کی میوزک کانفرنس کے پنڈال یا دلکشا کلب کے ڈرائینگ روم یا غفران منزل کے باغ میں موجود تھا۔" ہلو رخشندہ بیگم"— اس نے اپنی آواز سنی۔ خود کو" ہلو رخشندہ بیگم، کہتے پایا۔ نہیں — وہ اس دہشتناک تاریکی میں، اس سائیں سائیں کرتے جنگل میں، اپنی ٹوسیٹر کے پاس کھڑا تھا۔ دلکشا کلب اور لالہ رُخ اور غفران منزل کی اس دُنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس اتنی بڑی، اتنی پھیلی ہُوئی دُنیا میں بالکل اکیلا تھا۔

"گلیمر بوائے سُنا ہے تم بھی دوسری ڈومینین کو بھاگے جا رہے ہو"۔ وُہ اس کے قریب کھڑی اپنے اسی پُرانے دوستی، خلوص اور بیفکری کے انداز میں اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ہر مُلک مُلک ماست کہ مُلک خدائے ماست رخشندہ بیگم" اُس نے خود کو آہستہ سے کہتے پایا۔ اسے غفران منزل اور رامپور ہاؤس کے شدید سیاسی اختلافات کا اچھی طرح علم تھا۔

"بالکل — گلیمر بوائے — یہ تو ہے ہی —!!" اس نے گویا مذاق اڑا کر کہا۔ وہ اتنی رنجیدہ، اتنی انتہائی شکستہ نظر آ رہی تھی۔ لیکن" رقصِ حیات" والا وُہ مشہور اور رَامز تبسم زبردستی اس کے ہونٹوں پر بکھر گیا۔

وُہ خاموشی سے موٹر کے شیشے پر رومال پھیرنے میں مصروف رہا۔

"اچھا گلیمر لوائے۔ اب مجھے جانے دو گے نا؟ مجھے بہت دیر ہو رہی ہے پوٹو کھانے پر انتظار کر رہا ہو گا۔ اچھا بھئی سو لونگ"۔۔۔ اس کی آواز آئی اور وہ راستے پر آگے چلی گئی۔

وہ اور اُس کی ٹو سیٹر، اور جنگل کے درخت اندھیرے میں چند لمحوں تک ساکت کھڑے رہے۔ ندی کے کنارے آم کے جھرمٹ میں جوان ہوائیں روتی رہیں۔

لالہ اقبال نرائن کا خاندان پشتوں سے کرواہا راج کا نمکخوار اور جاں نثار رہا تھا۔ ان کے پرکھوں نے کرواہا راج کے چودھریوں کے دربار کے جن فرائض کو سنبھالا تھا۔ وہ لالہ اقبال نرائن آج تک سرانجام دیئے جاتے تھے۔ ان کے خاندان کی لڑکیوں کے کنیا دان کا زیادہ حصّہ ہمیشہ ریاست کی طرف سے دیا جاتا تھا حویلی کے بچّوں کی فارسی اور اُردو کی تعلیم ہمیشہ سے ان کی برادری کے قابل افراد کے سپرد رہی تھی۔ دیوالی پر لالہ ہر سال اپنی نگرانی میں حویلی کا چراغاں کرواتے تھے۔ محرّم میں خود تعزیہ داری کرتے تھے۔

لیکن اب دُنیا کے حالات بہت مختلف تھے۔ خود ان کے بھتیجے مہا سبھا کے سرگرم رکن بن چکے تھے اور انہوں نے دھمکی دی تھی کہ چاچا اگر تم ان ملیچھ مسلمنٹوں کی دی ہوئی روٹی کھانے سے باز نہیں آؤ گے تو یاد رکھو تمہارے حق میں آگے چل کے اچھا نہ ہو گا۔ لیکن لالہ نے ان دھمکیوں اور زمانے کے اس بالکل بدلتے ہوئے دھارے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ آخر دم تک کنور صاحب کی خدمت میں ڈٹے رہیں گے۔ لیکن جب کنور صاحب ہی نے آنکھیں مُوند لیں تو اُن کا دل ٹوٹ گیا۔

مانا ٹھیر میں ان کا مکان بلوائیوں نے لوٹ لیا تھا۔ اُن کا بڑا لڑکا جو راولپنڈی میں ملازم تھا۔ وہاں سے بالکل تباہ حال ہو کے ان ہی دنوں گھر واپس پہنچا تھا اور اُٹھتے بیٹھتے ہر گھڑی مسلمانوں کو گالیاں دیا کرتا تھا اور انتقام کی تدبیریں سوچا رہتا تھا

اب لالہ اقبال نرائن کے بھتیجوں نے اُن سے کہا "چاچا اب کرواہا راج میں جمے رہو۔ اب اپنی جگہ سے بالکل نہ ہٹنا۔ یہ سالے کنور رپو لو اور کنور کچا لو جاویں گے کہاں کرواہا راج تو بس اب اپنا سمجھو۔ کچھ گورنمنٹ چھین لے گی اور جو گورنمنٹ نہ چھینے گی، وُہ ہم اپنے ڈنڈے کے زور سے لے لیں گے۔ ان ملیچھوں کی بھگوان نے بہت دنوں رسی دراز رکھی تھی۔ اب سارا بھارت ورش ہمارا ہے۔ جے ہند"

لالہ کے دل پر یہ سب اور اس طرح کی دوسری باتیں سُنکر چھریاں چلتی تھیں۔ وُہ رخشندہ بٹیا کو لکھنؤ پہنچانے کے بعد اپنی فارسی کی کتابیں اور رامائن کی جلدیں سمیٹ کر اپنی باقی عمر رام کی دھن میں بتانے کے لئے اپنے وطن موضع زنگی پور (ضلع غازی پور) واپس چلے گئے۔

اخباروں میں چھپا ــــ "ضلع فیض آباد کے ایک گاؤں میں پنجاب کے شرنارتھیوں کے پہنچنے سے چھوٹی گنتی والے فرقے اور بڑی گنتی والے فرقے میں کچھ تنازعہ ہو گیا۔ قتل لوٹ مار اور آگ لگانے کی اکا دکا معمولی وارداتیں ہوئیں۔ لیکن فیض آباد ملٹری پولیس نے جائے واردات پر فوراً پہنچ کر حالات پر قابو پا لیا۔ تازہ ترین اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب وہاں بالکل امن ہے۔ اے۔ پی۔ آئی۔

دوسرے کالم میں، سردار پٹیل کے تازہ بیان اور ہفتے کے نئے انگریزی فلموں

کے ریویو کے درمیان میں جو جگہ بچی تھی اس میں تھا! — کنور عرفان علی خان، برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے سابق وائس پریزیڈنٹ ہفتے کے روز اپنے قصبے میں حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے انتقال فرما گئے۔ انتقال کی وجہ گاؤٹ اور ہائی بلڈ پریشر کا پرانا مرض بتایا گیا ہے۔ اے پی آئی۔

"دیکھا قبلہ۔ کر دا ہار اج ہیں بھی فساد ہو کے رہا۔ ساری قوم پرستی دھری رہ گئی ان صاحبزادی کی۔ اب تو غالباً وہ سب روتے ہوں گے کہ پہلے کیوں نہ راہِ راست پر آ گئے"۔ سید افتخار نے مولانا اچھن صاحب (ایم۔ ایل۔ اے) سے کہا۔ ان کے اخبار کے دفتر میں اس وقت ایک ضروری میٹنگ ہو رہی تھی۔

"ارے میاں راہِ راست کا کیا ذکر کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر مُہر لگا دی ہے بھائی میرے"۔ مولینا نے ارشاد کیا۔

"لیکن قبلہ وہ لوگ نام چار کے تو مسلمان ہیں۔ اس لئے افسوس ہوتا ہے"۔ سید افتخار نے عرض کی۔

"مسلمان ہ — لاحول ولا" — مولینا نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "کنور عرفان علی کی اولاد ایک سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے۔ ان کے لڑکے شراب وہ پئیں۔ انگریزی ناچ وہ ناچیں۔ ہر وقت کا انگریزوں، کافروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ سؤر بھی یقیناً کھاتے ہوں گے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ان کی لڑکی شادی بھی کسی ہندو ہی سے کرے گی۔ وہ جو ہندو لونڈے دو ہر وقت اس کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ خیالات ان کے انتہائی زہریلے اور غدار — لاحول ولا — استغفراللہ"

— مولانا نے بات ختم کر کے پانوں کی ڈبیا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سامعین نہایت عقیدت سے ان کی طرف متوجہ رہے

"اجی ہٹائیے قبلہ۔ کافروں کے ساتھ جو رہا وہ خود کافر۔ آپ نے خود فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر مُہر لگا دی ہے۔ وہ جانیں۔ ان کا ایمان جانے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ چشمِ عبرت کے لئے یہ کرواہا راج کا فسانہ سبق آموز ہے۔" سید افتخار نے قصہ گویا بالکل مختصر کر دیا۔

"اچھا یہ کنور صاحب مرحوم کی صاحبزادی بلند اقبال آج کل ہیں کہاں اور اب کیا کر رہی ہیں؟" ایک صاحب نے پوچھا

"پتہ نہیں بھئی۔ غالباً پناہ گزینوں کے کیمپوں میں کام کرنے میں مصروف ہیں اور پھر بہت ممکن ہے نہرو صاحب انہیں کسی اور ضروری کام کے لئے دتی بلا لیں۔ آج کل تو ہر ایک کی قسمت چمک رہی ہے۔ سفارتخانوں سے کم تو کوئی بات ہی نہیں کرتا۔" سید افتخار نے جواب دیا۔

"ہاں بھئی۔ یہ تو پنڈت جی کی سیاست اور ان کے سارے خاندان کی ٹکنیک ہے ہی۔ جہاں کسی سیاسی مطلب براری کی ضرورت ہوئی۔ دو چار گوری گوری کشمیری لونڈیوں کو ساتھ لگا دیا۔ تصویریں کھینچ کر پریس میں بھیج دی گئیں۔ میدان صاف ہے۔" دوسرے صاحب نے ارشاد کیا۔

"ارے میاں یہ تو زیادتی کر رہے ہو تم" — تیسرے نے ذرا انصاف سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"صاحب ہم تو حق پرست آدمی ہیں۔ صاف بات کہتے ہیں۔ لگی لپٹی تو رکھتے

نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کبھی غفران منزل والوں کے ہاں کسی ٹینس سے پہنچ کر چاء اڑا آئے ہو جبھی یہ طرفداری کی جا رہی ہے۔" ان صاحب نے فرمایا

"اجی لاحول ولا — لاحول ولا۔" انہوں نے احتجاج کیا۔

"بالکل ٹھیک کہتے ہو بھائی۔" سید افتخار نے کہا "جس تحریک میں لڑکیاں شامل ہو جائیں سمجھو کہ چل نکلی۔ یہی ان لوگوں کی سیاسیات کی ساری کامیابی کا راز ہے۔ ایک زوردار لونڈیا بھی قیادت کر دے، سارا شہر اُس کے پیچھے پیچھے جیل جانے کو تیار ہو جائے گا۔ مردوں کی شولری کی اسپرٹ ایسے موقعوں پر دوگنی ہو جاتی ہے اور اس گُر سے یہ لوگ خوب واقف ہیں۔ اب دیکھ لو۔ سفیر ہے تو عورت۔ وزیر ہے تو عورت: گورنر ہے تو عورت۔"

"ارے ہم دوسروں کو کیا کہیں۔ اب تو یہ غضب دیکھئے کہ خود ہماری مسلمان عورتیں میدانِ سیاست میں گھسی آ رہی ہیں۔ پنجاب اور سرحد میں پچھلے دنوں ان لوگوں نے کیا کیا قیامت نہ اُٹھائی۔ اللہ اکبر۔" ایک صاحب نے کہا۔

"اجی پنجاب کی عورت ہوتی ہی بڑی کراری ہے۔ بالکل پہلوان ہوتی ہے پہلوان اسے دیکھ کر تو سب ویسے ہی چوکڑی بھول جائیں۔ کوئی ہمارے ہاں کی عورتیں ہیں کہ بالکل چھوئی موئی کی بیل۔ بس ہر وقت موتیا کے پھولوں میں تُلتی رہتی ہیں — ہئی ہئی" — دوسرے نے چپکے سے اپنے ساتھی سے ارشاد کیا "رخشندہ بیگم کو دیکھا ہے؟ کیا پدمنی قوم کی عورت ہے۔ ہائے ہائے۔"

"پدمنی قوم کی عورت؟ کیا چنڈو خانے کی اڑا رہے ہو؟" ساتھی نے آہستہ سے سوال کیا۔

ہمارے درمیان تفرقہ نہ ڈلوائیے۔ حضرات! ہم نے دنیا کو اپنے قول و فعل سے دکھا دیا ہے کہ اپنے نیشنل ہوم لینڈز کے حصول کے لئے اس صوبے کا مسلمان سب سے پیش پیش رہا ہے۔ اس صوبے کے بہترین دماغوں نے اس کے لئے جد وجہد کی ہے — ہم اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں اور قربان کر چکے ہیں۔ (تالیاں) دوستو کیا وہ سنہرا دور بھول گئے۔ جب خالد بن ولیدؓ —" مجمع پر رقت طاری ہوتی گئی۔

ڈولتی ہوئی شام کے اندھیرے میں وہ آخری بار اس ندی کے کنارے جمع ہوئے۔ جہاں وہ اتنے برسوں سے اکٹھے ہوتے آئے تھے۔ ان کے چاروں طرف بہت گھور اندھیارا چھا گیا تھا۔ بہت گھور اندھیارا۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے چراغ جن کی جھلملاتی روشنی انہیں راہ دکھاتی تھی۔ تیز آندھیوں کی زد میں آکر سب بجھ چکے تھے ان کے آنچل انہیں بجھنے سے نہ روک پائے تھے۔ دنیا جس کے لئے وہ لڑتے آئے تھے۔ جس کے لئے انھوں نے اپنا قیمتی، جوان، سرخ خون مٹی میں ملایا تھا اب ان کے چاروں طرف پھیلی ان کا مذاق اڑا رہی تھی۔ تم نے تو مجھے سنوارنے کی مجھے نیا راستہ دکھانے کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ اب تم خود اتنے انشچت کیوں ہو اب تمہارے قدم اتنے تھکے ہوئے کیوں ہیں۔ تمہاری آنکھیں ویران کیوں ہیں۔ تمہارے وہ سارے جھلملاتے آنسو کہاں گئے۔ جو تم نے میرے دکھوں کے لئے گرائے تھے — یہ انجام ہے ان سارے خوابوں کا جو ہم نے شفق کے سائے تلے اکٹھے دیکھے تھے۔ انھوں نے چاروں طرف نظر ڈالی — یہ گھاؤ۔ یہ تاریک کھائیاں — یہ

دہشتناک غار۔ یہ خون۔ یہ شعلے۔ ارے یہ کیا ہو گیا۔ یہ تم نے کیا کر دیا۔ دلوں کے درمیان جو یہ بے پناہ نفرت کی اتھاہ خلیج حائل ہو گئی۔ روحوں میں جو یہ زخم پیدا ہو گئے۔ کیا یہ صدیوں تک بھی پُر کیے جا سکیں گے؟ ارے یہ کیا جنون تھا۔ کیا دیوانگی تھی۔ کیا حماقت تھی ــــ ہمارے دلوں میں جذبہ تھا۔ ہماری آنکھوں میں خواب تھے ہمارے جسموں میں روح تھی۔ تم نے ہمارے تیور دیکھے تھے؟ ہم وہ لوگ تھے جو بہتے ہوئے دریا کے بہتے ہوئے دھارے کو بدل سکتے تھے۔ ہم آزادی کے لیے لڑ رہے تھے۔ اس آزادی کے لیے ــــ سو نشتر کی سانجھ کے اس گھور اندھیارے کے لیے۔ صدیاں نکل جائیں گی۔ جگ بیت جائیں گے۔ ہم ایک دوسرے کے لئے ہمیشہ کے واسطے اجنبی بن کر رہ جائیں گے جنم جنم کے لئے ایک دوسرے کو شبے اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ ارے تم نے فوجیں، سرکاری محکمے، توپیں مشین گنیں، ہتھیار تو تقسیم کر لئے۔ لیکن ہمارے اس مشترکہ تمدن، اس ہماری موسیقی، ہمارے ادب، ہمارے آرٹ کا کیا ہو گا۔ کیا اب تم یہ کہو گے یہ ہندو موسیقی ہے۔ یہ مسلم موسیقی ہے یہ خالص اس ڈومینین کا آرٹ ہے۔ یہ صرف اس ملک کا فن ہے۔ گوکل اور بچن اور نرالا صرف ہندوؤں کے لئے ہیں، نذر الاسلام اور جوش فقط مسلمانوں کے لئے ہیں۔ ارے یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم نے اس نوجوان کی چیخ سنی جو ابھی اندھیارے میں پکارا تھا۔ اس نے کہا تھا میرے پنجاب کو مرنے سے بچا لو۔ میرا ہرا بھرا پنجاب جس کی فضاؤں میں گیت گونجتے تھے۔ جہاں ٹھنڈی ہوائیں چلتی تھیں۔ جہاں دھان کے کھیت لہریں مارتے تھے۔ میں اب تمہارے یہاں ہوں۔ میں اب شرنارتھی کہلاتا ہوں۔ میں گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ میں مال پر گھومتا تھا۔ میں ماڈل ٹاؤن میں رہتا

تھا۔ میری بہنیں کینیرڈ میں پڑھتی تھیں۔ ان کے جہیز تیار رکھے تھے۔ ان کی شادیاں ہونے والی تھیں۔ وہ اب مغربی پنجاب کے جانے کون سے اغوا شدہ عورتوں کے گلے میں قید ہیں۔ وہ پاگل ہو چکی ہیں۔ میں بھی پاگل ہو چکا ہوں۔ مجھے پاگل ہونے سے بچا لو۔ میرے پنجاب کو اس طرح نہ مرنے دو۔ تم نے اس کی چیخ نہیں سنی؟ وہ ہمارا ساتھی تھا۔ وہ نوجوانوں کی اسی دنیا کا ایک فرد تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی خواب رہے ہوں گے۔ اس کے دل میں بھی جذبہ رہا ہو گا۔ اس نے بھی ہماری طرح آزادی کی اس جد و جہد میں حصّہ لیا ہو گا۔ اب وہ یہاں پر ہمارے درمیان میں موجود ہے۔ اس کا پنجاب نہیں بچ سکا۔ اس کا پنجاب انگریزی حدبندیوں اور سنگینوں اور کرپانوں کی نذر ہو گیا اور وہ اپنے آپ کو اس اندھیرے میں موجود پا رہا ہے۔ ہمارے اپنے ساتھی جو اب تک ہمارے ساتھ ہماری راہوں کو طے کرتے رہے تھے۔ دل شکستہ ہو کر، ہمت ہار کر ہم اسے اپنے سارے پرانے ناطے توڑ کر آگے چلے گئے ہیں۔ وہ اس طرف، نئی حدبندیوں کے اس پار اسی طرح تاریکی میں بھٹک رہے ہوں گے۔ یہ سب کیوں ہوا ــ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہماری اپنی سرزمین پر یہ شعلے کیسے بلند ہو رہے ہیں ــ یہ ہماری گنگا اور جمنا اور گھاگرا کی رو پہلی دھاراؤں کے مرغزار ــ یہ تلسی داس، کبیر، ملک محمد جائسی کی سرزمین ــ یہ پورب دیس ــ یہ منفرا نگری ــ یہ جیالے سورماؤں کا مہوبہ اور روہیلکھنڈ ــ یہ اودھ ــ یہاں پر کیا ہو رہا ہے ــ نفرت اور انتقام کی کیسی آگ بھڑک اٹھی ہے ــ ہم اب کچھ نہیں کر پائیں گے۔ کچھ نہیں کر پائیں گے ــ ہوائیں زور زور سے روتی رہیں چیختی چلاتی سرخ رات خاموش ہوتی گئی۔

چاروں طرف چھایا ہوا اندھیرا بہت نیچے جھک آیا۔ خاک کے دل بالکل ٹوٹ چکے تھے۔

گنگی نے لکھا۔ "یہ مہنفرا ہے۔ یہ ہردوار ہے۔ یہ امرناتھ ہے۔ منفرا میں مسکار کرتے وقت سب بجے وادھے کہتے ہیں۔ یہ اتنا اچھا لگتا ہے۔ یہ المورڑہ ہے۔ یہاں انند موئی ماں کا آشرم ہے۔ یہاں ہرے جنگلوں کے بیٹے اور بیٹیاں پَو پھٹنے کے سمے میرا کے بھجن الاپتے ہیں اور یہاں ہوا میں تازہ تازہ پہاڑی شہد اور چنار کے پتوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ ڈارلنگ تم کہا کرتی تھیں کہ اگر تم لکھنؤ لٹ ہوتیں تو یقیناً نن بن جاتیں اور سینٹ فرانسس کی راہبات کے اورڈر میں شامل ہو جاتیں۔ یہاں آ کے دیکھو۔ یہاں کتنا سکون ہے۔ کتنا سکھ ہے۔ زندگی کی ترشنا یہاں آ کر بجھ جاتی ہے۔ بالکل بجھ جاتی ہے۔ ڈارلنگ ہم سب سینٹ فرانسس بن سکتے ہیں لیکن ہم تو چاروں اور سے گیدڑوں، بھیڑیوں اور کتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ سینٹ فرانسس جنگل کے پرندوں اور خرگوشوں کو وعظ سنایا کرتے تھے اور بھیڑوں کو بپتسمہ دیتے تھے۔ لیکن یہ کمبخت تو کسی کی سُننے کے لئے بھی تیار نہیں۔ سب ایک دوسرے کو پھاڑے کھائے اور ختم کئے ڈال رہے ہیں۔ بھیڑیوں اور کتوں کی دنیا میں انند اور سکون کس طرح مل سکتا ہے ڈارلنگ ـــــ"

"تمہیں انند مل گیا ہے گنگی ڈارلنگ۔ تمہیں مکتی بھی ضرور مل جائے گی۔" اس نے اپنے آپ سے دُہرایا اور رنیو آبرا کے فائیلوں کی بے دلی سے ورق گردانی کرتی رہی پرچے کا آخری شمارہ ابھی پریس تک نہ پہنچ پایا تھا کہ بلوے کی وجہ سے اسے

کروا ہاراج جانا پڑ گیا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں کرن کا پیاں پریس بھیجنے سے پہلے ہی بمبئی روانہ ہو گیا تھا۔ رسالے کے حسابات اور دوسرے قضئے کئی مہینے سے اسی طرح پڑے تھے۔ اس نے کاغذات اٹھا کر دیکھے اور اسے پتہ چلا کہ رسالے کے پاس روپیہ بالکل نہیں رہا ہے۔ فسادات کی وجہ سے ملک بھر کے رسل و رسائل کے ذریعے تقریباً بند پڑے تھے اور خریداروں کے چندے وصول نہ ہوئے تھے۔ پریس کو ابھی بہت سا روپیہ دینا باقی تھا۔ کاغذ کے رم کے نئے اسٹاک کا بل اب تک ادا نہ کیا گیا تھا۔ کرن نے بمبئی سے لکھا تھا۔ روشی بی بی ہم سب تتر بتر ہو چکے ہیں۔ لیکن تم کسی نہ کسی طرح پرچہ جاری رکھنے کی کوشش میں لگی رہو۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جس نئے دور کے خواب دیکھتے اور اس کا انتظار کرتے ہوئے ہم نے یہ پرچہ نکالا تھا۔ اب جبکہ وہ سمے سچ مچ آن پہنچا ہے۔ ہم اس نئے دور میں اپنے پرچے کو داخل ہوتا نہیں دیکھ پائیں گے۔ کرن کا خط پڑھ کر اس نے سوچا کہ جس طرح بھی ہو سکے گا وہ اس کام کو سنبھالنے کی کوشش کرے گی۔ اس نے ہمت کر کے حسابات دیکھنے میں شروع کئے۔ لیکن بہت جلد اکتا گئی اور کچھ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ رسالے کے کاروباری پہلوؤں کی دیکھ بھال کرن کے سپرد تھی۔ وہ ادر گنتی محض ادارات کے کام میں اس کا ہاتھ بٹا دیتی تھیں۔ اب ان سارے اکتا دینے والے رجسٹروں کا انبار اس کے سامنے پڑا تھا۔ اس نے تھک کر سوچا کہ وہ اپنے کرنٹ اکاؤنٹ میں سے روپیہ نکال کر اس وقت تو کام چلا لے گی کرن واپس آ کر باقی باتیں خود نپٹاتا رہے گا۔ اُس نے بنک کی کتاب دیکھی۔ لیکن اس کا جتنا روپیہ اس وقت بنک میں موجود تھا۔ اس سے چوگنا بھی سارے ضروری حسابات صاف کرنے کے لئے کافی نہ ہوتا۔

ایک طویل انگڑائی لے کر اُس نے میز پر سر رکھ دیا اور الموڑے کی ٹھنڈی ہوائیں اور نینی تال کا وائلڈ فلاور ہال اسے یاد آنے لگا۔ کنور صاحب نے اچانک ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے کوئی وصیت نہ چھوڑی تھی اور قانون کے لحاظ سے تعلقداری کے حق وراثت میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اودھ کے تعلقداروں میں اس شرعی تیسرے حصے سے محرومی کی تلافی شادی کے وقت کئی سیر سونے کی شکل میں کر دی جاتی تھی۔ اس کے لئے بھی یقیناً کنور رانی کے پاس اس وقت ڈھیروں سونا موجود رہا ہوگا۔ لیکن کنور رانی اسے محض 'اخبار پر پھینکنے' کے لئے قطعی کچھ روپیہ نہ دیتیں خصوصاً جبکہ بلوے کی وجہ سے ریاست کو اتنا نقصان اٹھانا پڑا تھا اور جبکہ اسمبلی زمینداری کے خاتمے کا بل پاس کر چکی تھی۔ وہ اس وقت اتنی بڑی غفران منزل میں بالکل اکیلی تھی۔ کنور صاحب کے چہلم کو بھی کافی عرصہ گذر گیا تھا۔ لیکن کنور رانی حسبِ معمول اندر اپنے کمرے ہی میں رہتی تھیں۔ پوکو ٹریکٹرز خریدنے کے لئے کلکتے چلا گیا تھا۔ ڈائمنڈا اپنے خاندان کے ساتھ دوسری ڈومینین کو جا چکی تھی۔ پی چواب تک تقریباً لاپتہ تھا اور غالباً بنگال کے کسی دُور افتادہ ضلع میں تعینات کر دیا گیا تھا۔

سہ پہر کے وقت شعلہ پری ایک لفافہ خاموشی سے اس کی میز پر رکھ کر واپس چلی گئی۔ اس نے وہ لفافہ اُٹھا لیا اور کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ کاغذ کی سطریں اور الفاظ ایک دوسرے کے آگے پیچھے ڈولنے اور ناچنے لگے۔ آسمان سرخ ہو گیا۔ کرۂ زمین کی حرکت تیز ہو گئی۔ دل اپنی جگہ پر ٹھہر گیا — چودھری شمیم نے لکھا تھا "امبر پور ہاؤس کی نسبت ٹوٹنے کے بعد اور کنور صاحب کے انتقال کی وجہ سے حالات کچھ اس طرح کے پیدا ہو گئے ہیں کہ کنور رانی کا اس خاکسار کو اپنی فرزندی میں لینا ناگزیر ہے۔ ریاست

پر جتنا قرضہ چڑھا ہوا ہے۔ اس صورت میں یہ خاکسار ادا کر دے گا۔ یہ کوئی احسان نہیں۔ اس نازک وقت پر محض آپ لوگوں کی خدمت منظور ہے۔ غور فرما لیجئے۔ تو قبلہ چھمّن صاحب سے اگلے چاند کی کوئی تاریخ مقرّر کر والی جاوے (نیز یہ کہ آج کل موسم اچھا نہیں۔ شہر میں ملیریا بخار پھیل رہا ہے۔ شام کو اتنی دیر تک باہر نہ رہا کیجئے۔ اس کے علاوہ اگر تپلون پہننے اور دلکشا کلب جانے سے احتراز فرمایئے تو عین موجب مسرت اس ناچیز کے ہو گا)

فقط چودھری شمیم عفی عنہٗ۔

("ارے موری بٹیا کیسے پھکو پھکو روتی ہیں"۔ گیلری میں آ کر گل شبّو نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے چپکے سے شعلہ پری سے کہا شعلہ پری نے رنج اور سنجیدگی سے سر ہلایا۔ وہ دونوں آگے چلی گئیں)

خط کو کئی بار پڑھ کر پھر اسے زور کی ہنسی آ گئی۔ لیکن آنسوؤں کا طوفان جو اندر کہیں امڈ رہا تھا کسی طرح نہ تھم سکا۔ آخر تھک کر وہ میز پر سے اٹھی۔ عادتاً اس نے ناک کا پاوڈر ٹھیک کیا اور پھر اس نے طے کیا کہ پریس ہو آئے۔ باہر آ کر اس نے ماتادین کو آواز دی۔ "بڑے موٹر خانے کی کنجی کہاں ہے"۔ اس نے پوچھا اور ریچو کا چھوٹا گیرج خالی دیکھ کر اس کے حلق میں کوئی چیز آ اٹکی ماتادین انگوچھا سر پر لپیٹتا دوڑا۔ "رانی صاحب کے پاس ہے بٹیا"۔ اس نے قریب آ کر جواب دیا

"جاؤ کنجی لا کر موٹر خانہ کھولو"۔ اس نے کہا۔

"بٹیا رانی صاحب کا حکم ہے کہ موٹر یا باہر نہیں نکل سکت ہے۔ ہم کا کری بٹیا۔ رانی صاحب گسلائے گئیں تو ہم اموڑ کٹا دیہیں"۔

"اچھا"۔ وہ سیڑھیوں پر ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک کر رہ گئی۔ کنور رانی کی اس سے عمر بھر کی

بیگانگی اور بے تعلقی اس وقت، انتہائی شدت کے ساتھ، پہلے سے دوگنی ہو کر اس کے سامنے آگئی۔ اس نے گیلری میں واپس آ کر سائیکل نکالی ہمیشہ وہ کہیں باہر جانے سے پہلے کنور صاحب کو بتانے جایا کرتی تھی کہ وہ جارہی ہے۔ عادتاً اس وقت اس کے قدم ہال کے زینے کی طرف بڑھے لیکن اوپر، زینے کے اختتام پر کنور صاحب کے کمرے کے دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا۔ وہی چیز اس کے حلق میں پھر اٹک گئی۔ جو اس نے پی جو کا موٹر خانہ دیکھ کر محسوس کی تھی۔ سائیکل اٹھا کر اس نے پائنیئر پریس کا رخ کیا۔

"ہلو۔ ہاؤ آر یو"۔ ایک جانی پہچانی آواز پیچھے سے اسے سنائی دی

چوراہے پر سے وہ لڑکی ایمیلی مڑ کر اپنی سائیکل پر اس کی طرف آرہی تھی۔

"ہلو ایمیلی"۔ اس نے اس انداز سے کہا جیسے وہ اس کی بہت ہی پرانی اور عزیز دوست تھی

"تم کہاں جارہی ہو؟" دوسری لڑکی نے پوچھا

"میں۔ ذرا پائنیئر پریس تک جارہی ہوں"۔ اس نے صاف جھوٹ بولا۔ کیونکہ اسی وقت اسے یاد آیا تھا کہ جب تک پچھلے مہینوں کا روپیہ ادا نہ کیا گیا۔ پریس جانا بالکل بیکار تھا۔

"اوہ۔ میں تو صبح کی مے فیئر آئی آئی اب گھر جارہی ہوں۔ ابھی ابھی میں نے اپنی قلابازیوں کی مشق ختم کی ہے"۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "تم کبھی مے فیئر بال روم نہیں آئیں تم نے کبھی میرا ناچ بھی نہیں دیکھا؟ پچھلے ہفتے تو میں نے ریڈ کراس کونسرٹ میں پیانو بھی بجایا تھا"۔ اس نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

ان کی سائیکلیں کچھ دور تک پھر ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔

"اچھا۔ سو لونگ"۔ رائل ہوٹل کے چوراہے پر پہنچ کر اس دوسری لڑکی نے سائیکل لال باغ کی طرف موڑ دی۔

"ٹھہرو ایمیلی"۔ اس نے آواز دی "میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلوں گی تم مجھے

پیانو سُنانا۔ مجھے اپنا فلا بازیوں کا ناچ دکھانا۔ مجھے یورپین میوزک بیحد پسند ہے"۔

چنانچہ کچھ دیر بعد وُہ بھی آلیوی کورٹ بیرو روڈ کے سامنے کھڑی تھی۔

یہ کوئین رُز کا بیڈ روم تھا۔ سُرخ اور نیلے کیمونو قالین پر بکھرے پڑے تھے۔ صدیقہ مریم کے مجسمے کے آگے اکیلی شمع جل رہی تھی۔ اسے اندر لیجا کر کوئین رُز نے آئینے کے سامنے اپنے بالوں کو جالی سے آزاد کیا اور سر کے ایک جھٹکے سے انہیں پُشت پر پھینکتے ہوئے مڑ کر اس کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ "بیٹھ جاؤ روشنی"۔ اس نے کہا۔

وُہ پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ کوئین رُز کے پلنگ کے کنارے پر۔

"تمہیں میرا یہ نام کیسے معلوم ہوا؟" اُس نے پوچھا

"سلیم لیا کرتا تھا"۔ اس نے بے پرواہی سے کیمونو سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔ وہی بے پرواہی وہی واقعیت جو اس کمرے کی فضا، اس سرخ کیمونو اس مریم کے مجسمے سے مترشح تھی۔

"ممّا چائے تیار کر رہی ہے۔ چائے پی لو پھر میں تمہیں پیانو سناؤں گی"۔ اس نے یہ سوچنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کہ تم رخشندہ عرفان علی اتنی اعلیٰ و ارفع و باعزت ہستی اس سمے میرے اس کمرے میں بیٹھی ممّا کی بنائی ہوئی چائے کس طرح پی رہی ہو۔ یہی وہی واقعیت تھی اور واقعیت اور حقیقت بذاتِ خود اپنی سب سے بڑی سب سے مکمل تفسیر ہے

چائے کے بعد انہوں نے ان اسکول کی بچیوں کی طرح جو اتوار کی چھٹی منا رہی ہوں سویر تک پیانو بجایا اور البم کی تصویریں دیکھیں اور قہقہے لگائے۔

چنانچہ آلیوی کورٹ اور زعفران منزل کے درمیان کوئی خلیج حائل نہ تھی۔

پھر دفعتہً پیانو بجاتے بجاتے رک کر اُس نے رخشندہ سے پوچھا "تمہارا وہ رسالہ بہت دنوں سے نہیں نکلا؟"

"ہمارا رسالہ؟ کیا تم نے اسے کبھی پڑھا ہے؟" رخشندہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ میں "موڈرن اسکرین" خریدنے اکثر یونیورسل جاتی رہتی ہوں۔ وہاں کاؤنٹر پر ہمیشہ وہ رسالہ دکھائی دیتا تھا۔ اس پر چھپا ہوا تمہارا نام میں پہچان جاتی تھی۔ اب کے بہت دنوں سے نظر نہیں آیا۔ کیا بات ہے تمہارے سارے ساتھی یہاں سے چلے گئے اس لئے؟"

"نہیں۔ اصل میں اس کے لئے اب روپیہ نہیں رہا۔" رخشندہ نے مختصر سا جواب دیا۔ اور دوسرا البم دیکھنے لگی۔ ظاہر تھا کہ اس لڑکی کو کسی سیاسی رسالے یا اس کے متعلق دوسری باتوں سے کوئی دلچسپی نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ پھر پیانو پر اس کے دوسرے نغمے کی منتظر ہو گئی۔

"تم اپنا رسالہ نہیں نکال سکتیں۔ کیونکہ تمہارے پاس اس کے لئے روپیہ ختم ہو گیا۔ ہاؤ اوفل"۔ اس نے بچوں کی طرح کے تعجب اور افسوس سے اپنے خلوص کے لہجے میں کہا۔ پھر چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد وہ بےتکلف پیانو کے اسٹول پر سے اٹھ کر اپنی مہمان کے صوفے کے قریب آگئی۔ "میں تمہاری کسی طرح سے۔ آئی مین۔ اس رسالے کے لئے کسی طرح سے کوئی مدد کر سکتی ہوں؟" اس نے صوفے پر جھک کر اپنی نیلی آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا

یہ کونین روز تھی جو مے فیئر میں کیبرے کی فلا بازیاں کھاتی تھی اور آیوی کورٹ میں رہتی تھی جو اس کے زخمی بھائی کو جنگل میں سے اٹھا کر دوبارہ دنیا میں لائی تھی، جو رات بھر اس کی تیمارداری میں جاگنے کے لئے تیار تھی جو سلیم سے اپنے گرین روم میں ملاقات کرتی تھی جس کی وجہ سے اس نے سلیم کو اپنی زندگی سے الگ کیا تھا اور وہ اس سے پوچھ رہی تھی "میں تمہاری۔ آئی مین۔ تمہارے رسالے کی کسی طرح سے کوئی مدد کر سکتی ہوں؟"۔

خداوندا۔ خداوندا۔

شام ہو گئی۔ آفتاب دور، ندی کی لہروں میں غروب ہونے لگا اور جب وہ اپنے انتہائی شیریں تبسم کے ساتھ امیلی مک گریگر اور اس کی ممّا اور اس کے پیارے چھوٹے بھائی جم کو سولونگ اور خدا حافظ کہہ کر اپنی سائیکل سنبھالے آیوی کورٹ کے پھاٹک سے باہر آرہی تھی۔ اس وقت

چودھری شمیم اپنی فورڈ پر سڑک پر سے گذرے۔ انہوں نے اندھیرے میں ٹھٹھک کر ایک لمحے کے لئے اسے غور سے آیوی کورٹ میں سے نکلتا دیکھا اور پھر تیزی سے غفران منزل کی طرف روانہ ہو گئے

وہ گھر واپس پہنچی اور اس نے دیکھا کہ چودھری شمیم اپنا بہترین سوٹ پہنے پہلے سے ڈرائینگ روم میں ڈٹے بیٹھے ہیں۔ وہ تیر کی طرح اپنے کمرے میں پہنچی اور مسہری پر گر گئی۔

کنور رانی تھوڑی دیر بعد گرانباری سے قدم رکھتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئیں اور اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں "مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ تم اس وقت کس سے مل کر آرہی ہو"۔ انہوں نے انتہائی غصے کے ساتھ دھیمی آواز میں کہا۔

وہ تکیوں میں منہ چھپا کر بے بسی سے سسکیاں بھرنے لگی "کیا کچھ واہی ہوئی ہو"۔۔

کنور رانی نے اسی غصے سے کہا "کیا بیکار کی تھنک مچاتی ہو"۔

"ممی۔ ممی۔ اس کمبخت کی یہ ہمت۔ یہ ہمت"۔ اس نے تکیوں میں چھپائے چھپائے آنسو بھری آواز میں تقریباً چلا کر کہا۔

"تو بیوی یہ تیہا کسے دکھاتی ہو۔۔ اور جو تمہارا جی چاہے کر لو۔ ایک بیٹے نے مجھے بہت سکھ پہنچایا ہے۔ جو کسر اس نے باقی چھوڑی ہے۔ وہ تم پوری کر لو"۔ وہ زور سے دروازہ بند کرتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

اندھیرا بڑے شعلہ پری کمرے میں آہستہ سے داخل ہو کر شام کی ڈاک میز پر رکھ کے پھر واپس چلی گئی۔ باغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ چاند ابھی جامنوں کے اوپر تک نہ پہنچا تھا۔

وہ دیر تک اس تاریکی میں پڑی پلکیں جھپکتی رہی۔ پھر اس نے روشنی جلائے بغیر ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ڈاک اٹھالی۔ دریچے میں سے چھنتی ہوئی مدھم چاند کی روشنی میں اس نے دیکھا۔ کرسٹابل نے بمبئی سے لکھا تھا۔ "روشی ڈارلنگ اتنے دنوں بعد خدا خدا کر کے

ٹامس کک والوں نے مجھے پیغام بھیج دیا ہے۔ میں شروع ستمبر میں سیل کر رہی ہوں۔ کیا مجھے خدا حافظ کہنے نہ آؤ گی؟"

وہ فوراً مسہری پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اندھیری گیلری اور سنسان کمرے طے کرتی ہوئی کنور رانی کے کمرے میں پہنچی۔

"ممی"۔ اس نے تخت کے پیچھے کھڑے ہو کر اپنے میں ذرا ہمت پیدا کر کے آہستہ سے کہا۔ "ممی ہم کچھ دن کے لئے بمبئی چلے جائیں"۔

"چلی جاؤ۔ ہم سے کا پوچھت ہو"۔ کنور رانی نے انتہائی بے تعلقی اور خفگی سے جواب دیا۔ "اب ہم سے کچھ کہے سنے خاطر نہ آیا کرو۔ سمجھیں؟" انہوں نے دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس آئی اور سوچنے لگی کہ اس کے کرنٹ اکاؤنٹ کا روپیہ سفر کے لئے کافی ہو گا یا نہیں۔ پاس بک اُلٹتے پلٹتے دفعتہً اُسے یاد آیا۔ اس کے پاس ریلیف فنڈ کا کچھ روپیہ اب تک میز کی کسی دراز میں پڑا تھا۔ اس نے جھک کر درازوں میں ٹھنسے ہوئے کاغذات میں وہ صندوقچہ تلاش کیا جو اس نے فیئر سے واپسی پر اس رات لا کر کہیں ٹھونس دیا تھا۔ اس نے روشنی جلائی اور اسے نچلے خانے میں وہ نظر آ گیا۔ اس نے اسے باہر نکال کر اطمینان سے پاس بک کے اوپر رکھ دیا (ضمیر کی صفائی۔ ضمیر کی صفائی ۔۔۔ یہ بھی کیا میونسپلٹی کی ماہانہ رپورٹ ہے سلیمان؟ ۔) پھر وہ گھڑی دیکھ کر گیلری میں گئی اور اس نے ریزرویشن کے لئے چار باغ جنکشن فون کرنے کے ارادے سے ریسیور اٹھایا۔

چاند بادلوں میں سرکتا جا رہا تھا۔

لکھنؤ کے قہوہ خانوں اور تفریح گاہوں کی رونق پہلے سے دوگنی ہو گئی تھی فلیشن ایبل دوکانوں پر چاندی برس رہی تھی پنجاب کی طرف سے آئے ہوئے انسانی طوفان کی، جب سے اکثر شاموں کو حضرت گنج پر بالکل لاہور کی مال کا دھوکا ہوتا تھا۔ ہر روز نت نئے پروگرام اور آزادی منانے کے جشن منعقد کئے جا رہے تھے۔ ہر طرف بڑی بشاشت تھی۔ بڑی چہل پہل تھی۔ مسلمانوں کو ریلوں کی کھڑکیوں سے باہر پھینکا جا رہا تھا۔ سالانہ آل انڈیا اولمپکس کے انتظامات کئے جا رہے تھے۔ مسلمانوں کے کاروبار معطل ہو چکے تھے۔ انہیں ہر جگہ کتے سے بدتر سمجھا جا رہا تھا اور رکتنے کی موت مارنے کے ارادے کئے جا رہے تھے۔ گل بھارت کوی سمیلن منعقد ہونے والا تھا۔ ہر طرف بڑا شدید قومی جوش و خروش طاری تھا۔ مسلمان خوف و ہراس سے سہمے جلتے تھے۔ انہوں نے اپنے مکانوں اور کوٹھیوں پر سے اپنے ناموں کے بورڈ اتار دیئے تھے۔ ریلوں میں سفر کرنے کے لئے ہندو نام تجویز کر لئے تھے۔ اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر ریل کے سفر میں حملہ آوروں کے سوالات کا جواب دینے کی ریہرسلیں کی جاتی تھیں۔ یہ سب کرتے ہوئے ہنستے جاتے تھے۔ یہ سب گویا بڑے مذاق کی باتیں تھیں۔ انسان ہر چیز کا بہت جلد عادی ہو جاتا ہے۔ ان باتوں سے دل ٹوٹتا تھا۔ دل ڈوبتا تھا۔ دل پر چھریاں چلتی تھیں۔ میرس کالج والوں نے سالانہ میوزک کانفرنس منعقد کرنی چاہی۔ لیکن بڑے بڑے گائیکوں اور فنکاروں نے جن میں اسّی فیصدی مسلمان تھے کہا ہم سفر کر کے لکھنؤ تک کیسے آویں۔ راستوں میں ہمیں چلتی ٹرین میں سے باہر پھینکا جا رہا ہے۔ پنڈت جی لکھنؤ تشریف لائے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انہوں نے کہا۔ ”میرے بھائیو اور رفیقو۔ اتنے دنوں بعد آج میں اپنے صوبے میں واپس آیا ہوں پر میرا دل دکھ سے بھرا ہے۔“ ان کی آنکھیں نم

دیکھ کر سبھی کے دل غم سے بھر گئے۔ لیکن جب وہ پنڈال سے گورنمنٹ ہاؤس واپس چلے گئے اور مجمع باہر نکلا تو سب ایک دوسرے سے چپکے چپکے کہنے لگے "اماں مارو گولی۔ پہلے تو مسلمانوں کو پاکستان دلوا دیا۔ اب کھڑے روتے ہیں۔ ایک ایک مسلمنٹے کو چن کر یہاں سے نکالا جائے جبھی ہمارے سینوں میں ٹھنڈک پڑے گی۔ ایک ایک کو چن کر" مسلمان زمینداروں کو اپنی عاقبت نظر آ رہی تھی۔ کاروباری الگ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رونے تھے۔ ملازمت پیشہ مسلمانوں کو بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نوکریوں سے برطرف کیا جا رہا تھا۔ سب حیران تھے ہم تو کسی طرح اب آخری عمر میں ہندی بھی پڑھ لیں گے۔ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر بے وقعتی بے عزتی کے ساتھ زندگی گذار لے جائیں گے لیکن ہمارے بچوں کے مستقبل کا کیا حشر ہوگا۔

غفران منزل کا کنور پپو تو آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے اپنی ساری رئیسانہ خو بو اور تن آسانی اور آرام پسندی کی عادتیں چھوڑ دی تھیں۔ اس نے خاموشی سے اپنا پائپ پیتے ہوئے بڑی اسکیمیں بنائی تھیں۔ وہ صوبے کی حکومت سے ٹریکٹرز خرید کے خود سیر کرے گا۔ ترائی کے علاقے میں جتنے جنگل بیکار پڑے تھے اور جو صرف کرسمس کے زمانے کے شکار کے کام آتے تھے۔ ان کی لکڑی سے وہ سیتا پور کے پلائی ووڈ کے کارخانے کی طرح کا ایک کارخانہ خود قائم کرے گا۔ اپنے سارے کتے بیچ ڈالے گا۔ فلائنگ کلب اور ہواؤں میں وقت گذارنے کی بجائے وہ ایک نہایت محنتی اور ایماندار کاشتکار بن جائے گا۔ بہت سے ہندو تعلقداروں نے ضبطی سے پہلے ہی اپنی لاج بچانے کے لئے اور اپنی بہرخروئی کے خیال سے اپنی ریاستوں کے بہت بڑے بڑے حصے پناہ گزینوں کو بسانے کی غرض سے حکومت کے سامنے پیش کر دیئے تھے۔ کروا ہاراج کے آدھے سے زیادہ حصے پر پہلے ہی باغی ٹھاکروں نے پچھلے دنوں کے بلوے میں اپنا قبضہ کر لیا تھا جن گاؤں کی

کروا ہا راج کی پٹی داری تھی۔ وہاں ہمیشہ فریقین سے سدا بہار مقدمے بازی رہتی تھی لیکن پولو مطمئن تھا کہ جتنا حصہ معاوضہ دینے کے بعد حکومت اسے سیر کے لئے دے گی وُہ اس پر قناعت اور صبر شکر کے ساتھ گذر کر سکے گا۔ بارہ بنکی کے سابق ڈپٹی کمشنر اپنے ماموں میاں کی لڑکی سے شادی کرلے گا اور ٹریکٹرز چلایا کرے گا۔

امبر پور ہاؤس میں ایک قیامت مچی ہوئی تھی۔ سامان بندھ رہا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔ موٹریں بیل گاڑیوں کی طرح لادی جا رہی تھیں۔ امبر پور ہاؤس والوں پہ اچھے خاصے بیٹھے بٹھائے دہشت سوار ہو گئی تھی اور وُہ انتہائی سراسیمگی کی حالت میں اپنے نیشنل ہوم لینڈز کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ بار بار شہر کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر شانتی پرشاد کو فون کیا جا رہا تھا کہ کہیں شہر میں گڑبڑ کے آثار تو پیدا ہونے نہیں شروع ہوئے۔ بیگمات نے طے کیا تھا کہ کچھ عرصے کے لئے کربلائے معلےٰ چلی جائیں گی۔ ایسے نازک موقعوں پر خدا خوب یاد آتا ہے۔ یا مولاؑ ہم مظلوم ہندی مسلمانوں کو اپنے پاس بُلا لیجئے۔ اب دیر نہ کیجئے کہ یہ دُنیا ایک سرائے فانی ہے۔ ان پاپی آنکھوں نے بند ہونے سے پہلے نجف اشرف کے گنبدوں کی زیارت نہ کی تو گویا کچھ نہ کیا۔ کچھ اسی قسم کے جذبات دلوں میں موجزن تھے۔ سب پر قریب قریب رقّت طاری تھی

سید افتخار اور ان کے ساتھی سخت چکرائے ہوئے تھے۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے۔ ارے میاں جن قوم پرستوں کو پچھلے آٹھ سال تک گالیاں دیں۔ اب ان ہی کے دروازوں پر پہنچنا پڑ رہا ہے کہ بھائی خدا کے لئے بتاؤ اب کیا کریں۔ میاں ہم تو نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ اب سٹی گم ہے۔ ہم لوگوں کو تو ایسا فراموش کیا گیا۔ ایسا فراموش کیا گیا۔ گویا ہم اور ہمارے کام اور قربانیوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ عمر عزیز کے دس سال، غور کیجئے

پورے دس سال اسی چکّر میں گذارے اور اب اس کا صلہ کیا ملا کہ قسم خدا کی دل روتا ہے مقامِ عبرت ہے بھائیو۔ صبر کرو کہ اللہ تعالیٰ صابرین کے ساتھ ہے اور چشم دل وا کر کے عبرت پکڑو"۔ دُوسرے نے کہا "میاں ہم تو کل پنت جی کے پاس گئے تھے۔ ان سے عرض کی کہ قبلہ ہم آپ کے وفادار ہیں، وفادار رہیں گے۔ اس سہ رنگے جھنڈے کے لئے جئیں گے اور مریں گے۔ لیکن یار گورمنٹ ہاؤس میں تو کوئی نوٹس ہی نہیں لیتا اپن کا۔ سب سالے مذاق اڑاتے ہیں کہ وُہ دن گئے جب آپ فاختہ اڑاتے تھے۔ اب پڑھیے بال تُشکشا ورنہ لیجئے اپنے وطن مطلوبہ کا راستہ۔ میاں آنکھیں کھل گئیں آنکھیں تارے نظر آرہے ہیں۔ چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں"۔ "اب کاہے کو روتے ہو بھائی"۔ ایک اور صاحب نے ارشاد فرمایا۔ "یہ لوگ جنہیں تم قوم فروش کہتے تھے یہی تو چلاتے تھے کہ میاں اقلیت کے صوبوں میں تمہارا کیا حشر ہوگا۔ وہی بات اب تم کو یاد آئی ہے لیکن اب تو چڑیاں چگ گئیں کھیت، پرسوں سے غفران منزل اور دوسری جگہوں میں شام کے وقت ہندی کی کلاسیں کھولی گئی ہیں۔ اگر یہاں زندہ رہنا ہے تو بھائی دل پر جبر کر کے جیسے بنے آ آ ای اِی او اُو کی گردان کرو۔ وردھا اسکیم میں تو اُردو ہندی برابر برابر رکھی گئی تھیں۔ صرف رسم الخط اختیاری تھا۔ لیکن اس پر کیسی کیسی واویلا مچائی تھی تم نے۔ صوبے کے ہندو اُردو کس شوق سے پڑھتے تھے۔ اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو اور فارسی کی کلاسوں میں ہندو طلبا کا اوسط مسلمانوں کے لگ بھگ ہی رہتا تھا۔ لیکن اتنی گالیاں سُننے کے بعد ہندو پر اس کا ایسا ردِّ عمل ہوا ہے اور انتقام کا جذبہ اور خیال اس کے دل و دماغ میں اتنا رچ گیا ہے کہ اب وُہ اُردو کا ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کر سکتا۔ پڑھنا او

پڑھانا تو کجا۔ عبرت پکڑو بھائی عبرت۔ میاں لکیر پیٹتے جاؤ بیٹھے بیٹھے۔ جس کلچر، روایات اور زبان کے تحفظ کے لئے یہ ساری قیامت اُٹھائی گئی تھی۔ ان علاقوں میں جنہیں حاصل کیا گیا ہے۔ وُہ کلچر اور وہ زبان کہاں ہے۔ اس کے مرکز اور گہوارے اور اپنی تاریخ و تمدن کی ساری وراثت تو خود اپنے ہاتھوں سے ہم نے دوسروں کو سونپ دی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ قوم کے حسب وقار اور عزت کے لئے یہ سب کیا گیا تھا۔ اس کے آدھے حصے کا وقار خاک میں مل گیا۔" میاں ایک دم سے اتنے مایوس اور قنوطی نہ بن جاؤ۔ نئی سرحد اس پار کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائے گا۔ کسی ملازمت، کسی اخبار، کسی کاروبار میں چپک جانا۔ اس ردِ عمل کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ چوتھے صاحب نے کہا کہ بھائی پندرہ تاریخ سے پہلے اتنا جوش و خروش تھا کہ مرنے اور مارنے کو تیار تھے۔ لیکن جب حسبِ دلخواہ کوئی صلہ اپنی خدمات کا نہ مل سکا تو انہیں کو جو تمہیں یہاں سہ رنگے جھنڈے کے سائے تلے اپنی قسمت آپ بنانے کے لئے چھوڑ کر پلین چارٹر کر کے اڑ گئے۔ اب انہیں سب کو گالیاں دیتے ہو۔ ارے واہ رے تھالی کے بینگنو۔

گورنمنٹ ہاؤس میں مسز نائیڈو کی وجہ سے بڑی رونق تھی جس کے جی میں سماتا تھا منہ اُٹھا کے سیدھا گورنمنٹ ہاؤس جا پہنچتا تھا۔ ہر طرف پارلیمنٹری سکرٹریوں کی دھوتیاں اور پیتل کی گڈویاں دھوپ میں پھیلی نظر آتی تھیں۔ سابق غیر ملکی گورنروں کے بال روم میں پتیلوں اور تھالیوں میں بھوجن پروسے جا رہے تھے ــــ اصل سوراج یہ تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ چاروں اور بلا کی رونق اور چہل پہل اور جوش و خروش تھا۔ اودھ

کا قدیم، افسانوی دارالسلطنت ہمیشہ سے زیادہ رومینٹک، زیادہ گلیمرس، زیادہ رنگین نظر آرہا تھا۔ شاعروں اور اپنچیوں کی اس سرزمین کو پہلی بار ایسا گورنر میسر ہوا تھا جو فارسی کے اشعار پڑھتا تھا اور ساری پہنتا تھا۔ آزادی مل چکی تھی۔ زندگی جوان ہوئی تھی۔

ان سب باتوں سے بالکل بے نیاز، آغا میر کی ڈیوڑھی کی ایک محلسرا میں شاہِ اودھ کی مجلس مشاورت منعقد ہو رہی تھی۔ چاء کا دور چل رہا تھا اور بنارسی پانوں کے بیڑے چاندی کے ورقوں سے سجے خاصدان میں پڑے مہک رہے تھے۔ خمیرے اور دوسرے خوشبودار تمباکوؤں کی وجہ سے دل ودماغ مفرح ہو رہا تھا۔

"توں قبلاں حکیمن صاحب"۔ شاہِ اودھ نے کاغذات پر سے سر اٹھا کر پوچھا۔ "ہماری رعایاں گویاں بالکل خونش ہے؟ اسے کوئی موذی تنگ تو نہیں کر رہاں"؟

"عالی جاہ بھلا کس کو کھے کی مجال ہے کہ حضور پرنور یا حضور کی رعایا کی طرف ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھ سکے۔ یہ جاں نثار خادم کس دن کے لئے موجود ہیں"۔ مجلس مشاورت کے سکریٹری نے کہا۔

شاہِ اودھ کو یہ سنکر اطمینان ہوگیا۔ انہوں نے ارشاد کیا۔" تو بھائی یہ مردود کانگریس والوں نے جو گورمنٹ ہاؤس میں دھوتیا راج پھیلا دیا ہے یہ تو گویا ــــ"

"بالکل ــ بالکل عالیجاہ"ــ سکریٹری نے عرض کی ــ" یہ تو ایک چٹکی بجاتے میں یہ دھوتیا راج اور لٹیا راج اور چٹیا راج سب ختم ہو جاوے گا بس حضور کے ایک اشارے کی دیر ہے ــــ واللہ سو سال کے لگ بھگ ہوتے ہیں کہ سلطنت کی رعایا

روتی پیٹتی حضور اختر پیا جنّت مکانی کو مٹیا برج رخصت کرنے کے لئے شہر پناہ کے پھاٹکوں تک گئی تھی۔ آج الحمدللہ وہ دن آیا ہے کہ حضور انہیں پھاٹکوں سے کامران وشادمان و فاتح اپنے بزرگوں کے تخت پر واپس تشریف لاویں گے۔"

"لیکن بھائی یہ خیال ہوتا ہیں کہیں یہ کانگریسی اپنی فوج ووج لیکر نہ چڑھ آویں"۔ جہاں پناہ نے کہا۔

"واللہ عالیجاہ دونوں وقت ملتے ہیں۔ ایسی بات مُنہ سے نہ نکالئے۔ بندے کا دل ہولتا ہے"۔ مجلسِ مشاورت کے دوسرے رُکن نے کہا۔

"اماں کس بات کا خوف کرتے ہو اُستاد"۔ سکریٹری صاحب نے ارشاد کیا۔ "ایسے ایسے تین سو ساٹھ مسز نائیڈو اور پنت یہاں ناخنوں میں پڑے ہیں۔ میاں اگر کسی نے شوریدہ سری کی کوشش کی تو واللہ ایک ایک کے حق میں یزید و شمر بن جاؤں گا کیا نام کہ ــــ ہم کوئی مذاق کرتے ہیں یا سلطنت اور حکومت کے مسائل کو بچّوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔ بھائی ہم باقاعدہ قانونی طور پر کارروائی کرکے تخت دوبارہ حاصل کررہے ہیں۔ کمپنی سے جو مراسلت ۵۶ء تک حکومت اودھ کی ہوئی تھی اس کی ساری نقلیں کیا نام کہ ہمارے پاس موجود ہیں۔ کون مردود کہہ سکتا ہے کہ یہ خلاف قانون یا ناممکن ہے۔ اماں کیا وہ دن آگیا کہ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے شاہی خاندان کی حق تلفی ہوتی دیکھیں اور اُف نہ کریں ـــ ہئی ہئی۔"

سب پر رقت طاری ہوگئی۔

دوسری صبح ہز میجسٹی شاہِ اودھ کی طرف سے ایک لمبا چوڑا بیان پریس میں بھیجا گیا جو پانیر، نیشنل ہیرلڈ، لیڈر، سارے انگریزی اخباروں میں چھپا۔" ہم یعنی سلطنتِ

اودھ کے جائز اور صحیح وارث، چونکہ انگریزی راج اب چلا گیا ہے، دوبارہ تخت نشین ہوئے ہیں۔ انگریزی حکومت نے نوّے سال قبل ہمارے نگڑ دادا خلد آشیانی جنّت مکانی کو انتہائی بے کسی کے عالم میں تاج و تخت سے محروم کر دیا تھا اور سلطنت پر لٹیروں کی طرح قابض ہوئے تھے۔ آج بدیسی حکومت کے خاتمے کے بعد ۱۵ اگست ۴۷ئہ کے بعد سے ہم یعنی آخری تاجدار اودھ کے نگڑ پوتے پرنس چھبّن صاحب قانونی اور لازمی طور پر سربرآرائے سلطنت ہوتے ہیں۔ ہمیں اُمّید ہے کہ ہماری پیاری رعایا ہمارے زیر سایہ امن و عافیت اور خوشی کی زندگی بسر کرے گی۔ اودھ نوّے سال کی غلامی سے آزاد ہوا ہے۔ ہم اپنی رعایا کو آزادی کی مبارکباد دیتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں۔ کہ وُہ تخت سلطنت سے اپنی وفاداری کا ثبوت دے گی۔ بہت جلد حکومت کی طرف سے دوسری اطلاعات شائع کی جائیں گی۔"

شام کو ریسٹوریشن اف اودھ تحریک کی مجلس عمل کی طرف سے بادشاہ سلامت کا جشنِ تاجپوشی منعقد ہوا۔ پھولوں سے سجی ہُوئی بگھی کے ساتھ جلوس سڑکوں کا چکّر لگا کر امین آباد پارک پہنچا اور اس تحریک کے لیڈروں کی دھواں دھار تقریریں شروع ہو گئیں۔

"واللہ حضرات آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ میرا تو خون کھولتا ہے۔ دشمنوں سے مقابلے کے لئے واللہ ہم یوں خنجر چلائیں گے — یوں خنجر چلائیں گے (انہوں نے ہاتھوں کی نرت سے اشارہ کر کے بیان کیا) کہ کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے اپنے جائز حق کے حصول کے لئے ہم اپنی اور دشمنوں کی جان ایک کر دیں گے۔"

"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ کیا بات کہی ہے واللہ کہ دل باغ باغ کر دیا۔ کیا موتی بکھیرے ہیں بھائی چھبّن صاحب" — ہال داد و تحسین کے شور سے گونج اٹھا

"تسلیمات۔ تسلیمات۔ حضور کی قدر افزائی ہے"۔ قابل مقرر نے چاروں طرف جھک جھک کر سلام کیا اور مائیک کے پاس کی میز پر سے خاصدان اٹھایا۔ دیر تک ان تقاریر کی وجہ سے سامعین کو بالکل مشاعرے کا لطف آتا رہا۔ جشن تاجپوشی کے بعد یہ محفل ختم ہوئی۔ صبح کو ایک اور بیان پریس میں بھیجدیا گیا۔ صوبے کی حکومت نے اس ریسٹوریشن اف اودھ تحریک کا ذرا نوٹس نہ لیا۔ اور اس کی کوئی نیوسنس ویلیو بھی نہ سمجھی۔ البتہ لوگوں کو جو ذرا پنجاب کی قیامت اور پناہ گزینوں کے قافلوں اور ٹرینوں کے لوٹے جانے کے متعلق خبریں پڑھتے پڑھتے اکتا گئے تھے۔ کچھ دیر تک کے لئے یہ بیانات اخباروں میں دیکھ کر کچھ لطف ضرور آیا۔ بہت سے لکھنؤ کے نوابوں کے روائتی ایچپن کا مذاق اڑاتے رہے۔ بہت سے افسوس کا اظہار کرنے لگے۔ کہ یہ بچارے بالکل ہی گھاس کھا گئے ہیں۔ ایک دو دن بعد اس دلچسپ تحریک کو فراموش کر کے سب پھر اپنی اپنی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ کسی کے عزیز و اقارب لٹ لٹا کر لاہور سے وہاں پہنچ رہے تھے۔ کوئی کراچی سے اپنے رشتے داروں کی خیریت منگانے کے لئے سرگرداں تھا۔ کوئی اپنے سامان کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا جو مال گاڑیوں کے ذریعے دوسری ڈومینین کو بھیجا گیا تھا۔ ہر طرف ایک افراتفری اور قیامتِ صغریٰ کا عالم نظر آ رہا تھا۔ دنیا ایک عجیب دیوانگی کے دور میں سے گذر رہی تھی۔

لیکن کسی نے اس جشنِ تاجپوشی کے لطیفے کے پیچھے چھپی ہوئی اس شدید ٹریجڈی کو محسوس نہیں کیا۔ اس دردناک تکلیف اور بے کسی کا اندازہ کسی کو نہ ہوا۔ جو دریا کے تیز بدلتے ہوئے دھارے کے ساتھ کشتیوں کے آگے نکل جانے کے

بعد ساحل پر اکیلے کھڑے رہ جانے والوں کو ہوتی ہے۔ دُنیا بدل رہی تھی، پرانی دُنیا ختم ہو چکی تھی۔ یہ معرکے کے مشاعرے منعقد کرنے والی، یہ تہذیب و ثقافت پر جان دینے والی دنیا، یہ زبان کو نکھارنے، سنوارنے والے لوگ، یہ روائتیں، یہ پُرانی انجمنیں دم توڑ چکی تھیں۔ جو کچھ باقی بچا تھا۔ وہ اس قدر بے کس، اتنا حماقت زدہ ایسا مجبور تھا کہ دُنیا اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ تہذیب کے مرکزوں اور گھواروں میں پلنے والے در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے صحراؤں کی طرف نکل گئے۔ امام باڑے ویران اور مسجدیں شکستہ ہو گئیں۔ پُرانے خاندان مٹ گئے زندگی کی پُرانی قدریں خون اور نفرت کی آندھیوں کی بھینٹ ہو گئیں۔ ایک عالم تہ و بالا ہو گیا۔ وُہ تہذیب، ہندوؤں اور مسلمانوں کا وُہ معاشرتی اور تمدّنی اتحاد، وہ روایات، وُہ زمانے، سب کچھ ختم ہو گیا۔

اِک دُھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

(۳)
منزلِ لیلیٰ

"کرن بہادر کا بچہ ——!" موتی لال نے اس سے کہا۔ "کیوں ایسی شکل بنا رکھی ہے جیسے لکھنؤ سے پٹ کر آئے ہو۔"

وہ چپ رہا۔

"ممی —" موتی لال نے پھر کہا۔ "کیا قصہ ہے۔ کیا تمہارا بالکل ہی کٹل کون ہو گیا ——؟"

"نہیں۔ بالکل قتل خون نہیں ہوا۔ میں اب تک زندہ ہوں۔ تمہارے سامنے، زہرہ ابراہیم بھائی کے ڈرائنگ روم میں، مالابار ہل پہ بیٹھا لیمن کورڈیل پی رہا ہوں۔ لو تم بھی پیو۔ یا ممکن ہے زہرہ ابراہیم بھائی ابھی کوئی اور چیز آفر کرے۔"

"اچھا تو چلو ولنگڈن کلب۔"

"نہیں۔"

"سی۔سی۔آئی۔"

"نہیں۔"

"تاج۔"

"نہیں۔"

"جہنّم ——؟"

"چلو ——" کرن نے جواب دیا۔ دونوں ہنس پڑے۔

"سارا واقعہ کیا ہے —— محض یہی ——" موتی نے بیحد سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ "کہ ایک کشمیری لونڈیا کے عشق میں مایوس ہو کر تم لکھنؤ سے بمبئی آ گئے ہو۔ اس میں قطعی تمہاری کوئی اوریجنلٹی نہیں ہے۔ تم سے پہلے بھی ان گنت گدھے یہی حرکت کر چکے ہیں۔ اور یہاں پر بیٹھ کر تم گویا بڑی تپسیا کر رہے ہو۔ دنیا کو تیاگ دینے کا ارادہ کر چکے ہو۔ اور سب مجھے ڈر ہے کہ کہیں ڈھینچو ڈھینچو کرتے سڑک پر نہ نکل جاؤ۔ واللہ کرن بھائی۔ تمہاری اس تپسیا کا کسی دوسرے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔" گنی کول سے وہ مسوری میں کئی بار مل چکا تھا۔ ڈائمنڈ اگر کسی کا خیال چھوڑ دے گی تو بعد میں یہ سوچنے کی بھی تکلیف گوارا نہ کرے گی کہ جائے کمبخت جہنم میں، (اور وہ بھی ایک نہایت ہی vulgar قسم کی جہنم ہو گی جس کا خیال کبھی ڈائمنڈ کو آئے گا) لیکن اگر گنی کسی کا خیال چھوڑے گی تو بہت دیر تک سوچتی رہے گی کہ اسے جہنم میں بھیجنے کی دعا بھی دی جائے یا نہیں۔ اس نے مسوری میں ایک بار ان دونوں لڑکیوں کے ہاتھ کی ریڈنگ کر کے انہیں بتایا تھا۔ "سنو بھائی ——" اس نے کرن کو سمجھایا۔ "ہم کائستھ زندگی میں

اچھی طرح زندہ رہنا اور ہنستے کھیلتے اسے گذارنا جانتے ہیں۔ یہ تھوڑی سی مہلت
جو خدا نے ہمیں اس دنیا میں رہنے کے لیئے دی ہے، اگر یہ بھی ہم نے منہ بنا کر
گذار دی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں کے لطیفوں کی داد دینے کے
لیئے ہمارے پاس مزاحی حس کافی طور پر موجود نہیں ہے۔ لہذا چلو مہالکشمی"۔
(قومی نعرہ بیگم پارہ) ——!!

کرن بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ موتی کی باتوں پر اسے پی چو شدت
سے یاد آ گیا جو کہا کرتا تھا کرن بھائی میری طرح تم بھی بہت جلد اس نتیجے پر
پہنچ جاؤ گے کہ دنیا میں صرف تم خود ہی ایک ایسی ہستی ہو جسے اپنے آپ سے
تعارف کرا کے خوشی حاصل ہو گی۔ سب اتنے گدھے ہیں۔ آرام کرسی پر لیٹے لیٹے
ایک آنکھ آدھی کھول کر وہ کہتا تھا — "کوئی کسی کا ساتھی نہیں کرن بھائی"۔ —
"بالکل ٹھیک کہتے ہو پی چو!" وہ برساتی کی سیڑھیوں پر سے جواب دیتا۔ "اسی نکتے
پر ایک شعر ہوا ہے سنو گے؟" — پی چو برآمدے میں سے چلاتا۔ "فرماؤ" "عرض
کیا ہے کنور صاحب"۔ وہ کہتا ہے "دنیا کا یہ حال نظر آتا ہے گا"۔ "خوب دنیا
کا یہ حال نظر آتا ہے گا"۔ پی چو سر ہلا کے بیحد سنجیدگی سے دہراتا۔ "کہ حضور ہر آنکھ میں
سؤر کا بال نظر آتا ہے گا"۔ وہ شعر ختم کرتا اور پی چو زور شور سے داد دیتے دیتے
برآمدے میں سے کود کر نیچے اترتا۔ "کیا قیامت کا شعر کہا ہے کرن بھائی —
ہئی ہئی —" اور ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ پھر پی چو کہتا۔ "تو
میں تم سے یہ عرض کر رہا تھا کرن بھائی کہ دنیا میں تمہارا بہترین دوست بس تم خود
ہی ہو۔ ایک روز میں دو زانو جھک کر اپنے آپ سے کہوں گا پی چو ڈارلنگ مجھے تم

سے اتنا عشق ہے۔ پھر وہ چلاّتا۔ "کرن بھائی زندگی کو اتنی سنجیدگی سے نہ لیا کرو گویا زندہ رہنا ایک بڑی بھاری ذمّے داری ہے۔ اتنے تھیوری زدہ مت بنو۔ سمجھے۔ اتنی اونچی مورل ٹون کا صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔" اس تھیوری زدہ کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔! آم کی شاخوں پر چڑھی ہوئی زخشندہ چلاّتی وہ بارش میں بھیگتے ہوئے آم کھاتے رہتے۔ مینہ کی پھوار پڑتی رہتی۔ ارے ہائے وہ دن۔ وہ لوگ۔ گھر کی وہ برساتیں جھوم کر اٹھنے والی گھنگھور گھٹائیں مولسری کے جھنڈ۔ گنی کول کے ملہار۔ بمبئی کا ٹیکسٹائل کمشنر بہت جلد بارات لے کر لکھنؤ جانے والا تھا۔ کرسٹابل کی میزبان لیڈی ابراہیم بھائی کہہ رہی تھیں کہ لکھنؤ کے ایک بہت اونچے، کول خاندان میں ان کے ہمسائے کی شادی ہو رہی ہے۔ خاندانوں اور انسانوں کا یہ اونچا پن اور نیچا پن۔ یہ بڑھیا کوالٹی۔ اور گھٹیا کوالٹی۔ یہ حسب نسب اور یہ ارسٹو کریسی کے سلسلے۔ انسان بھی گویا نمائش کے کتّے یا ریس کے گھوڑے ہیں جن کے سلسلۂ نسب اور کوالٹی کے اظہار سے ان کی قیمتیں چکائی جاتی ہیں۔ سنا بھائی تم نے ـــــ" ایک مرتبہ ڈوِن انورڈی گرِ بیٹ کے اس دلچسپ دوست جمیل احمد نے کہا تھا۔ "تمہاری گنی کول اور ڈائمنڈ اور کرسٹابل اور ایمیلی مک گریگر اور تمہاری بہن زخشندہ۔ ان سب کی قیمتیں الگ الگ حساب سے مقرر ہیں۔ حفیظ احمد نے ان میں سے ایک کی قیمت اپنے حساب ادا کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ وہ کہاں ملے گی۔ ازلی اور ابدی "وہ" ـــــ یہ سب کمبختیں تو بیوقوف بنائے رکھنے میں ماہر ہیں۔ ارے پارٹنر میں لونڈیوں کی قوم کی خاصیت سے خوب

واقف ہوں۔ روپے پہ مرتی ہیں، خوشامد پر مرتی ہیں، شہرت پر مرتی ہیں، کوئی
مشہور انسان ہو۔ اسمارٹ اور خوبصورت سا لکھنے والا یا ٹینس اسٹار یا عمدہ قسم
کا اسکرین ایکٹر یا سیاسی لیڈر۔ فوراً راجہ اندر بن جائے گا۔ پھر آج کل ایک اور
اسٹائل نکلا ہے۔ کہ عشق میں کہیں نہ کہیں سے لاکر سیاست ٹھونس دی جاتی ہے
ہیرو صاحب بنگال یا بہار کی ریلیف کے دورے پر چلے جا رہے ہیں اسمارٹ
قسم کے کھدر کے لباس پہ چار خانہ شال لپیٹے جیل تشریف لئے جاتے ہیں۔
زیادہ Pathos اور سنسنی پیدا کرنے کے لئے موقعہ پڑنے پر پولیس کی
مشین گنوں کا سامنا کر رہے ہیں اور صاحبزادی بلند اقبال اپنے ڈرائنگ روم
میں بیٹھی سرمایہ داروں اور اپنے جاگیردارانہ نظام پر لعنتیں بھیج رہی ہیں۔ اور
افسانے اور نظمیں تصنیف فرما رہی ہیں۔ شہلا رحمٰن کو دیکھا ہے تم نے ——؟"
اس نے بات ختم کر کے پوچھا تھا۔

ہاں اس نے شہلا رحمٰن کو دیکھا تھا۔ اس کی وہ نظمیں دیکھی تھیں "نیچی نظروں
بولے ڈولے، اونچی نظروں چپ چاپ رہے۔ اونچی نظروں چپ چاپ رہے"
اس کے وہ بیٹر ڈے کلب کے انٹلکچوئل مکالمے سنے تھے جو وہ ہر ہفتے
نئے ملنے والوں سے بڑے اہتمام سے ایک ہی طرح دہراتی تھی۔ شہلا رحمٰن ایک
ٹریجڈی تھی۔ ایک بار ومل نے اوشیر سے کہا تھا۔ اوشیر بھائی تمہارا آرٹ۔
درخشندہ اور رنگینی اور پیچ کا حسن۔ ہم سب کے ذہن و دماغ۔ یہ سب ٹریجڈی
ہے —— سب ٹریجڈی ہے ——

"دنیا بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ یہاں کیا کیا مزیدار تجربے ہوتے رہتے ہیں۔

اسے بھی اپنی مزاحی حس سے کام لیتے ہوئے ایک دلچسپ تجربہ سمجھو کرن بہادر"
موتی نے پھر کہا۔

وہ چپ رہا۔ کیا قیامت ہے ۔ زندگی کی ٹریجڈی کا نام یار لوگوں نے
تجربہ رکھ چھوڑا ہے۔ جمیل احمد کا فلسفہ بہت ہی سستا اور گھٹیا تھا۔ لیکن موتی
کے اس اسٹریم لائنڈ فلسفے سے بھی فی الحال اسے کوئی مدد نہ مل سکتی تھی۔
وہی الفاظ۔ الفاظ۔ الفاظ، تم مغالطا فایڈ کیوں نہیں ہو کرن بھائی ۔ تمہیں تھوڑا سا
مغالطہ فائیڈ ہونا چاہیئے تھا۔ اپنے متعلق تھوڑا سا مغالطہ بڑی نعمت ہے ۔
اس سے زندگی بیحد خوشگوار معلوم ہونے لگتی ہے۔ ڈائمنڈ سموسوں کی
پلیٹ صاف کرتے ہوئے ایک بار اسے سمجھا رہی تھی۔ وہ مغالطہ فائیڈ
نہیں ہے۔ وہ تجربہ کار نہیں ہے ———— وہ کچھ بھی نہیں ہے
وہ اس سمے، یہاں ۴ - مالابار ہل پر زہرہ ابراہیم بھائی کے ڈرائنگ روم
میں کیوں بیٹھا ہے۔ وہ اس موسیقی کی آواز کیوں نہیں سن رہا جو اس کے
جانے بغیر آہستہ آہستہ اونچی اٹھتی جارہی ہے۔ غفران منزل کے باغ کے
سناٹے میں گھلی ملی وہ آواز اس کے کانوں میں دوبارہ آئی۔ میں جو کچھ نہیں ہوں
تم جو کچھ نہیں ہو۔ یہاں سے آگے چلو کرن بھائی۔ تمہاری پرم آتما یوں کبھی شانت
نہ ہو پائے گی۔ وہ یہاں سے آگے جائے گا۔ وہ ضرور دیکھے گا کہ اس اندھیارے
کے اس پار کیا ہے۔ اسے مشعلیں نہیں چاہیئے۔ اسے کچھ بھی نہیں چاہیئے۔
دریچے میں سے اسے نظر آیا کہ کرسٹابل اور رخشندہ اپنی میزبان زہرہ
ابراہیم بھائی کے ساتھ اوپر کی طرف آرہی ہیں۔ موتی لال سگرٹ پرے پھینک

کر تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا۔

آسمان پر مون سون کی گھٹائیں امنڈتی آرہی تھیں۔ ارے ہائے گھر کی برساتیں۔ گھر کا ساون اور بھادوں۔ گھر کی برکھا رُت۔ رخشندہ نے دریچے میں سے باہر، اوپر، نیچے، چاروں اور نظر ڈالی۔ بھیگی ہوئی سمندری ہوائیں اس کے بالوں کو پریشان کرنے لگیں۔ بارش کا ایک زوردار ریلا آیا اور بجلی سیاہ، نیچے تک گھرے ہوئے بادلوں میں تیزی سے کوندنے لگی۔ ناریل کے پتّے بادوباراں کے زور سے جھک گئے۔ وہ دریچے میں سے ذرا ڈر کے پیچھے ہٹ آئی بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج سے وہ بہت ڈرتی تھی۔ اس نے دریچے کے پٹ بند کر دیئے۔ وہ یکلخت اس دنیا سے خوفزدہ بیحد خوفزدہ ہوگئی۔ وہ اب تک آیوری کے برج میں رہتی آئی تھی۔ اب اس نے پہلی بار اپنے ماحول، اپنی فضا، اپنی مخصوص زندگی سے خود کو علٰحدہ کر کے چاروں طرف دیکھا، دنیا اتنی خوبصورت۔ اتنی تکلیف دہ۔ اتنی فضول ہے۔ اس میں کیسے کیسے انسان بستے ہیں تب اس نے محسوس کیا کہ ہم دنیا میں واقعی کتنے کم لوگوں کو جانتے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف، یہ رنگا رنگ کائنات کیسے کیسے دلچسپ انسانوں سے پُر ہے۔ ڈاکو، اچکے، کروڑپتی، ہوموسیکشوئل، سیلانی، سیاست داں، قوم کے لیڈر، ڈون ژواں۔ اسے جہانگیر قدر یاد آیا۔ جو اسے پچھلی شام گرین میں چند لڑکیوں کے ساتھ نظر آیا تھا، وہ بہت صاف ستھرا، مستعد، سمندروں کا بڑا ہوشیار اور ذہین افسر، جو یقیناً دھوبی کے کپڑوں کا حساب

خود رکھتا ہو گا اور اپنے خدمتگار سے الجھتا ہو گا کہ کھڑکیوں کے پردے کیوں
نہیں تبدیل کئے۔ جو بالوں کو بڑھیا قسم کی کریم سے سنوارتا ہو گا اور شیو کرتے میں
اگر کہیں خراش لگ گئی تو گنگناتے ہوئے آئینے میں غور سے دیکھتا ہو گا کہ اس
خراش سے اس کے حسن میں اضافہ ہوا یا نہیں، اور جو شام کو پابندی سے اپنی
دوست لڑکیوں کو گرین میں کھانا کھلانے لے جاتا ہو گا۔ اسے کرسٹابل کی دوست
اور میزبان زہرہ ابراہیم بھائی کا خیال آیا جس کا ٹیلی فون اس کی مسہری کے برابر
والی میز پر رکھا رہتا تھا اور جو چھوٹے چھوٹے کتّوں کی انتہائی دلدادہ اور شوقین
تھی۔ اس نے کرن کے دادر کے فلیٹ کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم دیکھا جہاں
طرح طرح کے لوگ جمع رہتے تھے۔ کامیاب اور ناکامیاب اخبار نویس
اور مصنّف اور فلم ڈائرکٹر اور اداکار۔ وہ شاعر اور ادیب جو لکھنؤ، دہلی،
لاہور اور حیدرآباد سے روپے، شہرت اور عورت کے لالچ اور کشش
میں وہاں کی فلم کمپنیوں میں پہنچ گئے تھے۔ ایسے لوگ جو بہت کچھ کرنا چاہتے
تھے اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ ایسے لوگ جو بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن کچھ نہ کرنا
چاہتے تھے۔ کرن نے اسے اپنے پڑوس میں رہنے والی ایک لڑکی سے
ملوایا جس کا سروجنی مانفر یا اسی قسم کا کوئی عام سا کانسٹنٹ نام تھا۔ اس کا بھائی
ان ہی دنوں کرن کے اخبار کے دفتر میں ملازم ہو کر الٰہ آباد سے وہاں آیا تھا
وہ لڑکی الٰہ آباد کے کسی گرلز کالج میں پڑھ رہی تھی اور اس نے رخشندہ سے
بڑی جلدی دوستی کر لینی چاہی۔ آپ کے لکھنؤ میں تو ابھی گڑبڑ شروع نہیں ہوئی
آپ یہاں کس کس فلم اسٹار سے ملی ہیں۔ وہ دیکھیے ادھر والی بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور

ہیں پرتھوی راج رہتا ہے۔ سنا ہے بچارا بڑا شریف آدمی ہے۔ اس طرف اس کا بھائی نزلوک کپور رہتا ہے۔ اس کی بیوی بڑی سیدھی سادی اور بہت اچھی ہے۔ اس سائڈ میں پہلے مس پردھان رہتی تھیں۔ اب ستارہ رہتی ہے۔ سنا ہے ستارہ نے کسی مسلمان سے شادی کر لی اور آروڑہ کو چھوڑ دیا۔ آپ بیگم پارہ کو جانتی ہیں؟" اور زہرہ ابراہیم بھائی نے اس لڑکی کو بھی ایک روز مالا بار ہل مدعو کیا۔ زہرہ ابراہیم بھائی کو کرن اور کرن سے تعلق رکھنے والی اس کے آس پاس رہنے والی سب چیزیں شدت سے پسند آگئی تھیں۔ کرن کی سنجیدہ باتیں، اس کی بچوں کی سی ہنسی۔ اس کی ہمسایہ کائستھ، عام سی لڑکی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمیں اپنا کوئی پالتو خرگوش، کوئی بدصورت یا خوبصورت سا بلا، کوئی چلاّتا ہوا بکری کا بچہ بھلا معلوم ہوتا ہے تو ہم اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ اسے اپنے صوفوں پہ رکھنا چاہتے ہیں۔

رخشندہ نے گھبرا کر، خوفزدہ ہو کر کرن کی طرف دیکھا۔ وہ قریب کے دریچے میں کھڑا بارش میں پام کے جھکتے ہوئے درختوں کو غور سے دیکھ رہا تھا اور چاروں طرف، دور دور تک، ایک اجنبی، انوکھی، عجیب و غریب دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں ہمدردی نہیں تھی۔ سکون نہیں تھا۔ مسرّت نہیں تھی۔ نیچے سڑک پر سے گلابی فراک پہنے ایک پندرہ سولہ سالہ یہودی لڑکی روز صبح کے وقت انڈوں کی ٹوکری لئے ہوئے گذرتی، ہر پھاٹک کے آگے ٹھہر جاتی۔ اور اپنی براؤن آنکھیں اٹھا کر اوپر دیکھتی۔ پھر اس کے چاروں طرف بہت بڑا مجمع لگ جاتا۔ نوکر چاکر، موٹر ڈرائیور، سفید برّاق پتلونیں پہننے والے گوانیز چھوکرے۔ پھر "ہیپی لوائے"

آئس کریم والا آتا اور آیا تین بچوں کو لیکر اسے گھیر لیتیں۔ ہر وقت رنگ برنگی موٹریں گذرا کرتیں۔ صبح سے شام تک زہرہ ابراہیم بھائی سے ملنے قسم قسم کے لوگ آتے۔ طویل، چمکیلی کاروں میں پھسلنے والی کروڑپتی کاروباریوں اور افسروں کی بیویاں، سیاہ ڈنر سوٹ پہننے والے آدمی، ہندوستانی ریاستوں کے پرنس، ان کے اور ان کی بیگمات اور رانیوں کے اسمارٹ اے۔ ڈی۔ سی اور سکریٹری، ریشمیں بالوں اور سرخ زبانوں والے چھوٹے چھوٹے کتے سنبھالے اور سیاہ چشمے لگائے ریس کورس کو جاتی ہوئی رہ جکھاریاں۔ شمالی ہند کے شہروں سے آئی ہوئی جے جے اسکول اور سوشل سروس کے انسٹیٹیوٹ اور اسکول آف اکنومکس میں پڑھنے والی لڑکیاں، جو حیرت سے ان سب چیزوں کو دیکھتیں۔ سروجنی ماتھر جو حیرت سے ان سب کو دیکھتی۔ یہ تیزی سے بہتی ہوئی، ڈولتی ہوئی، گرمیوں کی رات کے دیوانے خواب کی ایسی دنیا اور تاج میں ٹینگو رقص ہوتا اور اونچے اونچے فلیٹوں کی بھول بھلیاں میں برقی پنکھوں کے نیچے جوڑوں میں سجے ہوئے گجروں کی خوشبوؤں کی لپٹوں کے ساتھ ساتھ گربا ناچ ناچے جاتے اور فرشوں پر رنگ برنگی چاک کے نقوش بنا کر لکشمی کی آرتی کی جاتی۔

زہرہ ابراہیم بھائی نے رخشندہ سے کہا۔ "کمن بڑا پیارا لڑکا ہے۔"

"ہاں ہے تو۔" اس نے دل میں سوچا۔

"تم لکھنؤ واپس جانے سے پہلے اسے یاد دہانی کراتی جانا ڈارلنگ کہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے آجایا کرے۔ آئی وڈ لو ٹو —— او ڈارلنگ تم اور کرسٹی کیوں اتنی جلدی بھاگی جا رہی ہو۔"

وہ خود بھی چند روز کے لئے باہر جانے والی تھی۔ اس کی ممی لیڈی ابراہیم بھائی کو اختلاجِ قلب اور اعصاب کو شکایت ہو گئی تھی۔ اور وہ ایک مہینے کے لئے ماتھران یا مہابلیشور جانے والی تھیں" اوہ ڈیئر۔ ڈیئر۔" انہوں نے زخشندہ سے کہا۔ "یہ میرا بیچارہ دل۔ میں نے اپنے سکریٹری کو فون کر دیا ہے کہ وہ اس مہینے کی میری ساری انگیجمنٹس منسوخ کر دے، ڈارلنگ تم ایک بار ماتھران ضرور آؤ۔ وہاں میرے چھوٹے لڑکے نے بڑی خوبصورت وِلا خریدی ہے۔ تم جب گھر واپس جاؤ تو اپنی ممی کو میرا کو دیدینا مائی ڈیئر۔ وہ تو مجھ کو بالکل بھول ہی گئیں۔ آہ۔ نینی تال۔ جب بھی میں جاتی تھی وہ اور تمہارے بیچارے ڈیڈی مجھ سے کتنے پیار سے ملا کرتے تھے۔" انہوں نے فرطِ محبت سے آنکھیں تقریباً بند کر لیں۔ اور ڈیبکس سونگھنے لگیں۔

ہوزن سُمن کی مہاوٹیں اسی تیزی سے برستی رہیں۔ وہ دریچے میں سے ہٹ آئی۔ اس نے پیشانی پر بار بار آ کر گرنے والی لٹوں کو ہٹا کے کرن کو دیکھا۔ "کرن بھائی لکھنؤ واپس چلو۔" اس نے دفعتاً تقریباً چلا کر کہا۔

کرن ہنس پڑا۔ "کیوں ——؟" اس نے پوچھا۔

"کرن بھائی! مجھے اس دنیا سے، ان انسانوں سے، اس شہر سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے سال جاڑوں میں وہاں آتی تھی، وہاں سمندر کی موجوں کے شور اور انسانی زندگیوں کے اس دیوانے بھنور سے خائف ہوتی تھی لیکن گھر واپس پہنچتے ہی اسے گرین کے ڈنر اور جوہو بیچ پہ جھکا ہوا چاند اور ماہم کے ساحلوں پہ لرزتے ہوئے ناریل کے

سائے یاد آنے لگتے تھے اور وہ سردیاں آتے ہی کنور صاحب سے کہتی
تھی۔ میاں بمبئی چلو —— بادل تیزی سے گرج رہے تھے۔ سڑکوں پر ٹھہرا ہوا
پانی برقی قمقموں کی روشنی میں جھلملا رہا تھا۔ زہرہ ابراہیم بھائی بیٹی گریسیل کا
کوئی نیا اور مقبول گیت گنگناتے ہوئے اپنے ڈریسنگ روم کی ساری
بتیاں جلائے، کلب جانے کو تیاری کر رہی تھی۔

دریچے سے باہر نظر ڈالتے ہوئے رخشندہ کو دفعتاً گیتی کا خیال آیا۔ خداوندا
کیا کچھ عرصے بعد، تاج کے کھانے کھاتے کھاتے، ہندوستانی راجکماروں اور
سیاہ ٹیل کوٹ والے آدمیوں کے ساتھ ناچتے ناچتے۔ بڑے بڑے پرس
جھلاتے ہوئے ریس کورس جاتے جاتے وہ بھی لیڈی ابراہیم بھائی کی طرح
موٹی اور بے ہنگم اور غیر دلچسپ ہو جائے گی۔ کیا وہ بھی ایک روز کہے گی۔
او ڈیر ڈیر مجھے اختلاج ہو رہا ہے۔ آہ میرے اعصاب۔ میرا بچارہ دل
میں میتھران جا رہی ہوں۔ تم بھی وہاں ایک بار ضرور آؤ ڈارلنگ۔ وہاں
میں نے نئی وِلا خریدی ہے۔ کیا وہ بھی اس دنیا کے ان تیسرے درجے کے
انسانوں میں سے ایک بن کر رہ جائے گی۔ وہ جو اس سمے ہمالیہ کی جانے
کون سی ہری گھاٹیوں میں اپنی دانست میں مکتی اور آنند کی کھوج میں لگی
ہوئی ہے۔ خداوندا —— کرن عفران منزل کے سن شیڈز کے نیچے بیٹھے بیٹھے
ان سے کہا کرتا تھا —— تم جنگلی خرگوشنو۔ زیادہ باتیں نہ بناؤ —— کرن کہا کرتا
تھا۔ کرن اسی طرح اپنے دادر کے فلیٹ سے اپنے اخبار کے دفتر تک
بسوں اور ٹرینوں کے ذریعے اپنی زندگی کا راستہ طے کرتا رہے گا۔ وہ کبھی

ایک دوسرے سے نہ ملیں گے۔ مہالکشمی کی طرف زنّاٹے سے نکل جانے والی گنتی ورکو وہ کبھی نہ پہچان پائے گا۔ اس کی زندگی کے اس راستے کے کنارے کنارے وہ اندھیری گلیاں ہیں جہاں چھرے بھونکے جاتے ہیں اور جہاں وائٹ لین کی ننگے پیروں والی سفید فام یہودی لڑکیاں اپنی خاموش براؤن آنکھیں اوپر اٹھاکر چپکے سے مسکرا دیتی ہیں۔ اور اسی راستے کے کنارے اس عام سی کائستھ لڑکی کا چھوٹا سا فلیٹ ہے جس کی طرح کی لڑکیوں کو ہمارے پیارے کامریڈ بورژوا، کہہ کر ایک قسم کا ذہنی انتقام لیتے ہیں، وہ لڑکی جو ستارہ اور پرتھوی راج اور ترلوک کپور کی ہمسائگی کی وجہ سے بےحد اکسائٹڈ رہتی ہے اور جو خواب دیکھا کرتی ہے کہ کاش زہرہ ابراہیم بھائی کی طرح مالابارہل پر اس کی بھی ایک کوٹھی ہوتی۔ مالابارہل پر کوٹھی اسے کبھی نہ ملے گی، لیکن دادر کی سڑکوں پہ پیدل چلتا ہوا کوئی کرن اسے یقیناً مل جائے گا۔ یہ چکّر اتنا پرانا اتنا فرسودہ، اتنا گھسا پٹا ہے کہ اس کی ٹریجڈی پر غور کرکے ذرا بھی رقّت نہیں ہوتی ــــ خداوندا ــــ خداوندا۔

طوفان کی گرج کے ساتھ ساتھ باہر درختوں کی ٹہنیاں اور پتّے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔

"اماں یہی ہیں وہ سارنگ پور کے راجہ کی مسماۃ ــــ؟" ایک نے چپکے سے پوچھا۔ "وہ گئی۔ وہ گئی ــــ ایک بجلی تھی کہ آنکھوں کے سامنے سے کوند کر نکل گئی ــــ ہی ہی ہی۔"

"ہاں میاں۔" دوسرے نے سنبھل کر جواب دیا۔ "یہی تھی۔"
"راجہ صاحب نے تو، ہم جانتے ہیں دوسری شادی کر لی؟" پہلے نے پوچھا۔
"ہاں جبھی کر لی تھی۔ اماں یہ میمیں سب کو یہی مزا چکھاتی ہیں اور پھر بھائی واپس آتے ہیں گھر کو روتے ہوئے۔ اس سفید قوم والوں نے کبھی کسی کے ساتھ وفا کر کے دی ہے ــــ؟" دوسرے نے جواب دیا۔

دو لکھنوی نما انسان پھلوں کی دوکان کے پیچھے سرگوشی میں باتیں کرتے رہ گئے۔ وہ دونوں خریداری ختم کر کے کرافرڈ مارکیٹ سے باہر نکل آئیں۔ کرسٹابل ہمیشہ کی طرح بے فکری کے چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی زخشندہ کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ وہ اگلے روز "ہوم" کے لئے "ویسل" کر رہی تھی اور جلدی جلدی اسی ساری آخری وقت تک کی خریداری نپٹانی تھی۔

شام پڑے جب وہ گھر پہنچیں اس وقت زہرہ ابراہیم بھائی مسہری پر نیم دراز رسیور تکیے پر رکھے حسبِ معمول وینو وسانی سے باتیں کر رہی تھی۔ وینو وسانی نے اپنی تازہ ترین شادی یو۔ پی کے ایک کائستھ نائٹ کی لڑکی سے کر لی تھی۔ ان دونوں کی عمروں میں بہت بڑا فرق تھا اس لئے اس شادی پر کافی تعجب ظاہر کیا گیا تھا۔ پچھلی گرمیوں میں وینو اپنی بیوی کو ہنی مون کے لئے کولمبو لے گیا تھا اور اب نئی حکومت کی طرف سے کسی سفارت کا عہدہ اس کے لئے ٹپ کیا جا رہا تھا۔ زہرہ ابراہیم بھائی سے اس کی بہت پرانی دوستی تھی۔ اس کی پارسی، انگریزی، ہندو بیویوں میں موسم اور کیلنڈر کے ساتھ وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہتی تھی لیکن زہرہ سے اس کی پرانی دوستی اسی شدت اور

گرمجوشی اور خلوص اور باہمی سمجھوتے کے ساتھ قائم تھی۔ ان دنوں اس کی پیاری بیوی اپنے والدین کے پاس شمالی ہند گئی ہوئی تھی اور وہ پابندی سے صبح اور شام اور جب بھی موقع یا وقت ملتا زہرہ ابراہیم بھائی سے پہروں فون پہ باتیں کیا کرتا تھا۔ زہرہ کا اپنا فون چونکہ اس کے بیڈ روم میں تھا اس لئے لیڈی براہیم بھائی یا اس کے ماموں اور قانونی نگران سرداؤدبھائی سوڈا واٹر بوٹل والا یا گھر کے کسی اور فرد کو اس کی گھنٹی کی آواز وقت بے وقت مخل نہ کر سکتی تھی۔ وہ فون پہ جھکی بڑی دیر سے اس سے باتیں کر رہی تھی۔ "وینو تم بالکل ناقابلِ برداشت ہوتے جا رہے ہو" اس نے رخشندہ اور کرسٹابل کے انتظار میں گھڑی پہ نظر ڈالتے ہوئے ذرا بگڑ کر اس انداز سے ریسیور رکھ دیا گویا اگر وہ اس وقت اس کے پاس ہوتا تو وہ اسے ایک ہلکی سی چپت بھی اسی طرح رسید کرتی۔ اور گویا اس چپت کی Hallo تاروں کے ذریعے وینو وسانی تک پہنچ گئی۔

"اوہ ڈارلنگز تم نے اتنی دیر کہاں لگائی" دروازے کی طرف مڑتے ہوئے وہ اسی سانس میں چلّائی۔

کرسٹابل نے تھک کر انگڑائی لیتے ہوئے خریداری کے پیکٹ صوفے پر پھینک دیئے اور جھک کر زرینہ کے بالوں کا سرخ ربن ٹھیک کرنے لگی۔

"تم اتنی دیر میں واپس آئی ہو میں بالکل مر رہی تھی کہ تمہیں ایک خوشخبری سناؤں" زہرہ ابراہیم بھائی نے کاہلی سے چوڑی مسہری پر ادھر سے ادھر لوٹ لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا خوش خبری زہرہ ڈارلنگ ؟" رخشندہ نے بے خیالی سے پوچھا۔

اس وقت تینوں میں سے کسی ایک کا بھی جی نہ چاہ رہا تھا کہ ایک دوسرے سے باتیں کریں لیکن مجبوراً اور اخلاقاً کرنی پڑ رہی تھیں۔

اسی وقت ڈرائنگ روم میں دوسرے فون کی گھنٹی تھرّا اٹھی۔

"رخشندہ ڈارلنگ ذرا دیکھ لوگی کون ہے؟ جو کوئی بھی ہو کہہ دینا ہم سب مر گئے ہیں — اچھا؟" زہرہ نے مسہری پر اسی طرح لوٹ لگاتے لگاتے شگفتگی سے کہا۔

رخشندہ اسی بے خیالی سے زہرہ کے بیڈ روم میں سے باہر آکر نشست کے کمرے کی طرف گئی۔ موتی اسی وقت اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے سلام کا جواب دے کر اس نے ریسیور اٹھایا۔

"موتی بھائی تمہیں کوئی پوچھ رہا ہے"۔ رخشندہ نے اکتا کر اس سے کہا۔

"ارے کرا کا تو نہیں —؟ وہ آج کل شہر میں ہے۔ پھر کچھ روپیہ قرض مانگتا ہوگا۔" موتی نے گھبرا کر پوچھا۔ اور اپنے گنتی کے چند بالوں پر پریشانی سے ہاتھ پھیرتا فون تک پہنچا۔

"ارے کون ہے بھئی" — اس نے اپنی ہمیشہ کی سی فطری بشاشت سے پوچھا۔ "سنا تم نے روشنی بی بی۔ کوئی میر اشیر تاج سے بول رہا ہے اور فون پر کرن کو مانگتا ہے۔" اس نے مڑ کر رخشندہ سے کہا۔

"تو موتی بھائی اس اپنے شیر سے کہہ دو نا کہ کرن اس وقت یہاں نہیں ہے اگر کوئی پیغام ہو تو تمہیں دیدے۔" رخشندہ نے لسنر کے ورق الٹتے ہوئے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک — اگر کوئی پیغام ہو تو میر اشیر مجھے دیدے۔" وہ نہایت سنجیدگی

اور مستعدی سے ٹیلی فون پر جھک گیا۔ رخشندہ کو ہنسی آگئی۔

"کون تھا ــــ؟" گہرے سبز ہاؤس کوٹ میں ملبوس اپنے پیروں کو کاہلی سے گھسیٹتی ہوئی اور ایک کیلا کترتی ہوئی زہرہ ابراہیم بھائی کمرے کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

"میرا کرنل زور میں آیا ہوا ہے۔ کل اپنی میم صاحب کے ساتھ ولایت جا رہا ہے اور تم سب سے جہاز پر اپنے کو سی اوف کرنا مانگتا ہے اور سب کو اپنا لو دیتا ہے۔" ریسیور رکھ کر بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مڑ کر اس نے رخشندہ، زہرہ ابراہیم بھائی اور کرسٹابل کو مخاطب کیا جو اسی وقت کمرے میں آگئی تھیں۔

"ادو ویٹ ری مائینڈس می ــــ کہ رخشندہ ڈارلنگ انہیں کرنل صاحب نے مجھے پہلے بھی رنگ کیا تھا۔ وہی تو میں تمہیں خوش خبری سنا رہی تھی۔ انہوں نے کہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ بھی اسٹریتھ مور سے سیل کر رہے ہیں اور تم سب سے ملنا چاہتے ہیں ــــ۔ ہو از دس گائے بائی دوے ــــ؟" زہرہ نے کیلا ختم کر کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارے ایک رشتے کے بہنوئی ہیں بھئی۔ یعنی میری چچا زاد بہن کے شوہر۔" رخشندہ، زہرہ ابراہیم کے متواتر سوالات اور اپنی ناک ہر جگہ ڈبونے کی عادت سے اتنی عاجز آچکی تھی۔

"ادو ــــ تمہاری چچا زاد بہن۔ آئی وُڈ لو ٹو میٹ ہر ــــ وہ بھی تمہارے رومینٹک اودھ کی راجکماری ہے؟ تمہاری طرح لمبے لمبے فرش پر پیچھے گھسٹتے ہوئے غرارے پہنتی ہے؟ میں اس سے ضرور ملوں گی"۔ زہرہ ابراہیم بھائی نے کشن

اپنی طرف کھینچتے ہوئے، صوفے پر لیٹ کر انتہائی جوش اور اشتیاق کے ساتھ سوال کیا۔

"جہنم میں جاؤ تم اور تمہارا رومینٹک اودھ ۔۔۔" رخشندہ نے چپکے سے کہا اور دوسرے کمرے میں جا کر کرسٹابل کے سامان کی پیکنگ میں اس کی مدد کرنے میں مشغول ہو گئی۔

جزیرے کے کنارے کنارے لہریں مارتا ہوا تاریک سمندر رات بھر سوتا رہا۔

یہ بیلرڈ پیئر تھا۔ یہ وکٹوریہ ڈوکس تھے۔ یہ اسٹرینڈ مور تھا۔ یہاں اتنا بڑا مجمع تھا۔ یہاں کسٹمز اور پورٹ ٹرسٹ اور ریری ونٹو کے سفید یونیفارم والے مرد اور عورتیں تھیں۔ یہاں نیوی کے اکّا دکّا داڑھی دار افسر اور انگریز اور امریکن اور پارسی اور مدراسی تھے ان کے گنتے تھے۔ ان کا اسباب تھا۔ کریں تھے۔ وہ ہی ازاے جولی گڈ فیلو، گاتے ہوئے سفید فام فوجی اپنے وطن واپس جانے کی خوشی میں سیٹیاں بجاتے پھر رہے تھے۔ اتنی گہما گہمی تھی اتنا رنگا رنگ ہجوم تھا۔ ہجوم۔ ہجوم۔ ہجوم۔ ہر جگہ یہی ہجوم۔ یہی مجمع۔ ہر طرف یہی، تیز، آنکھوں کو تکلیف پہنچانے والے چیختے چلّاتے۔ رنگ۔ شور۔ اضطراب۔ اس مجمع میں وہ سب موجود تھے۔ اس نے کرسٹابل کی بچّی کو گود میں اٹھا رکھا تھا سامان کی چیکنگ کی جا رہی تھی۔ سب ایک دوسرے سے جلدی جلدی باتیں کر رہے تھے۔ اس ہجوم میں دفعتاً اس کی نظر قمر آرا پر پڑ گئی۔ بیحد اہتمام سے گہری سرخ چمکتی ہوئی زرتار ساری پہنے، بالوں کو پنوں سے سنوارے، ہاتھ میں

موتیوں سے بنے ہوئے تاج محل والا کار چوبی پرس بڑے تکلف سے اٹھائے
بہت سامیک اپ کیئے، وہ اپنے نوکروں کو اسباب کے متعلق کچھ احکام دے
رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ خوشی کی ہلکی سی چیخ مار کے اس کی طرف دوڑی "تسلیم
بجیا"۔ اس نے قریب آکر بازو پھیلا دیئے۔ "بجیا تم ہم کا چیھن نہیں سکن کا؟"
اس نے اسی سانس میں پوچھا۔
وہ اسے کرسٹابل کی طرف لے آئی۔
"وہ بھی تو یہاں ہیں" ــــ قمر آرا نے ان دونوں سے کہا۔
"وہ کون ــــ؟" رخشندہ نے زرینہ کے بالوں کا ربن ٹھیک کرنے کے
لئے جھکتے ہوئے نظر اٹھا کر بے خیالی سے اس سے پوچھا۔
"میاں ہمارے۔ اور کون ــــ" قمر آرا نے بیحد خود اعتمادی اور فخر سے
جواب دیا۔ پھر وہ زرینہ کو گود میں اٹھا کر اس کا نام پوچھنے میں مشغول ہو گئی۔
اور اپنی بجیا کی اس انگریز سہیلی کے لباس کی سلیکس کو غور سے دیکھنے لگی۔ کیا
باؤلا پہناوا ہے۔ بس کوٹ اور ٹوپ کی کسر ہے۔ وہ بھی کیوں نہیں پہن لیتیں۔
واہ بھئی۔ اس نے دل میں سوچا۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ بھی "اُن" کے ساتھ
ولایت جا رہی ہے۔ اور اگر وہاں پہنچ کر "انہوں" نے اس سے کہا کہ تم بھی
ٹوپ لگاؤ اور کوٹ پتلون پہنو تو کیا ہوگا ــــ ہائے اللہ ــــ
تھوڑی دیر بعد وہ سب کرسٹابل کو خدا حافظ کہنے جہاز پر آگئے۔ کرسٹابل
خاموشی سے ریلنگ پر جھکی ہوئی تھی۔
"تم اتنی رنجیدہ کیوں ہو کرسٹی ڈارلنگ۔ تم تو اتنی خوش قسمت ہو کہ ہوم واپس

جارہی ہو۔ نوپلیس لائیک ہوم۔ کاش کہ اس مرتبہ میں بھی تمہارے ساتھ چل سکتی۔" زہرہ ابراہیم بھائی نے اس کے قریب کھڑے ہو کر شگفتگی سے کہا۔
"چپ رہو زہرہ" کرسٹابل نے دفعتاً بڑی ترش روئی سے اس سے کہا وہ چپ ہو گئی۔ اور پھر مڑ کر کرن سے باتوں میں مشغول ہو گئی۔

لیکن کرن بھی معمول سے زیادہ خاموش تھا۔ اتنے جذباتی ہیں یہ سب کے سب زہرہ ابراہیم بھائی نے اکتا کر سوچا۔ یہ شمالی ہند والے کمبخت سب جذباتی ہوتے ہیں۔ جبھی تو شاعری کرتے ہیں، موسیقی کے ماہر ہوتے ہیں، اتنی سنجیدگی سے ایک دوسرے سے محبتیں کرتے ہیں۔

رخشندہ اور کرن نے برآمدے کے سرے پر کرسٹابل کو کھڑے دیکھا۔ اس کے تیز سرخ بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اور وہ دیر سے اسی طرح ریلنگ پر جھکی لہروں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ "خدا حافظ ——— روشی اور کرن ———" اس نے آہستہ سے کہا۔

خدا حافظ ——— انہوں نے کہنا چاہا ——— خدا حافظ برطانیہ کی کرسٹابل ڈورین ——— ہم تمہارے آگے بہت شرمندہ ہیں۔ ہم تمہیں جلانے کے لئے لالہ رخ اور عفران منزل کے صوفوں پر بیٹھے بیٹھے جی بھر کے تمہاری قوم کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ اب تم جا رہی ہو۔ اس لئے کہ ہم نے تمہیں نظر انداز کر کے خود ہی ایک دوسرے کو گالیاں دینی شروع کر دی ہیں۔ لیکن کرسٹابل ڈورین ——— انہوں نے کہنا چاہا ——— جب تم اپنی ہری وادیوں اور کینٹ کے مرغزاروں میں حفاظت سے واپس پہنچ جاؤ تو ہمیں ریڈ کراس کی امداد

سمجھتے ہوئے ہمارے لئے اپنے خدا سے دعا کرنا کہ اے خدا انہیں معاف
کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ لیکن کرسٹابل ڈورین بڑا افسوس
ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں سے یہ جانتے
چلے آئے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ہمارے لئے تو بخشش اور معافی کی بھی کوئی
امید نہیں۔" وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتے لاؤنج میں آ گئے۔

لاؤنج میں لفٹنٹ کرنل سلیم کا خاندان موجود تھا۔ چھوٹا سا قُوتُو آپا کے
بازوؤں میں تھا۔ کیننگ وے کو طے کرتے ہوئے اس کے ڈیڈی نے حفاظت
کے خیال سے سخت بے ڈھنگے پن سے اسے خود اٹھا لیا تھا۔ اور اب وہ رونے
لگا تھا۔ کیا چیاؤں پیاؤں کیاؤں مار ایک مصیبت۔

"اَرے ہلو کرن بھائی —" سلیم نے کرن کو دیکھ کر خوشی سے ہاتھ بڑھایا۔
"ہلو — ہلو بھئی سرتاج من سلامت —!" کرن کی بشاشت پھر واپس
آ گئی تھی۔

"ہشت چپ رہو کیا بیہودگی ہے۔" سلیم نے اسے ہنس کر ڈانٹا۔ وہ ذرا
سا جھینپا۔ (اس میں جھینپنے کی کیا بات تھی؟ ساری دنیا ہی شادی کرتی ہے)
تُوتُو یکلخت پھر زور زور سے رونے لگا۔ قمر آرا اسے چپ کراتے کراتے
تھک گئی۔ اللہ اللہ بھائی کے۔ اونہ کان کاٹوں نانی کے۔ وہ اسے گود میں لئیے
اِدھر اُدھر ٹہلنے اور سلانے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔ قمر آرا، جو مکمل بیوی
اور ماں تھی۔

"ارے مولانا ٹوٹو بخش — کرن نے اس پر جھکتے ہوئے اسے کھلانے

کی کوشش کی۔ "انگریزی میں روتا ہے" اس نے بچے کو غور سے دیکھنے کے بعد کہا سب ہنسنے لگے۔ کرن کی باتیں پی چو کی یاد اتنی شدت سے دلاتی تھیں۔

"پی چو کہاں ہے؟" سلیم نے کرسٹابل سے اس کا سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

پی چو — سب یکلخت خاموش ہو گئے۔

"پی چو — " چند لمحوں کے بعد کرن نے آہستہ سے کہا "پی چو کا تقرر آجکل غالباً دلی میں کیا گیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اس کا ایک خط روشنی بی بی کے پاس مشرقی پنجاب سے آیا تھا۔ جہاں اسے شاید مغربی پنجاب جانے والے پناہ گزینوں کے انتظام کے لئے بھیجا گیا تھا۔

"اوہ — سلیم نے کہا۔ "مشرقی پنجاب۔ مغربی پنجاب۔" اتنی عجیب بات تھی۔ لیکن اب وہ ان تمام نئے ناموں اور نئی اصطلاحوں کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔

زرینہ کو کرسٹابل کے کیبن میں آیا کے سپرد کر کے رخشندہ لاؤنج میں آ گئی۔

"ہلّو روشنی — " کرنل سلیم نے اسے دیکھ کر بیحد تپاک سے کہا۔

"ہلّو بھئی جالینوس — " اس نے اسی تپاک اور شگفتگی سے جواب دیا۔

پھر وہ نہایت اخلاق اور سرگرمی سے سمندری سفر کے صعوبات، اور جگہ جلد نہ دینے میں طامس کک والوں کی بدمعاشی اور دوسری دنیا بھر کی چیزوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ رائل کالج آف میڈیسن میں جس کام کے لئے سلیم کو بھیجا جا رہا تھا دیر تک اس کا ذکر ہوا کیا۔ کرنل اوبیرائے کے خاندان کی خیریت پوچھی گئی۔ الہ آباد اور لکھنؤ اور بمبئی کے برسات کے موسموں کے ٹمپریچر کا موازنہ کیا گیا

۹. Make-Believe کی دنیا ان سب نے اپنے لئے تخلیق کی تھی۔
وہ اس میں ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے یہاں تک آن پہنچے تھے
اور اب یہاں سے اپنے اپنے راستے، آگے جانے والے تھے۔ جہاز لنگر اٹھا چکا تھا
اور پہلی سیٹی بجنے والی تھی۔ آسمان پر مون سون کی گھٹائیں پھر نہایت تیزی، نہایت
شدّت سے اُمڈ آئی تھیں۔ آفتاب سیاہ، گھنگھور بادلوں میں چھپتا جا رہا تھا اور
چاروں طرف حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تیز سبز سمندر کی لہریں اس کی کرنوں میں
جھلملا رہی تھیں۔

ہجوم بڑھتا گیا۔ ہجوم۔ رنگ برنگی، آنکھوں کو تکلیف پہنچانے والی، ملتی جلتی
ڈولتی ہوئی چیزیں۔ جہاز کی تیسری سیٹی بج رہی تھی۔ رومال ہلائے جا رہے تھے۔
دوربینیں آنکھوں پر سے اٹھائی اور نیچی کی جا رہی تھیں۔ دنیا ڈول رہی تھی۔ کائنات
ڈول رہی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جہاز دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس جہاز میں
مگر سٹابل تھی۔ اس جہاز میں صرف کرسٹابل تھی اور کوئی نہ تھا اور کوئی بالکل نہیں تھا۔
جہاز دور ہوتا جا رہا تھا۔ سمندر کی موجیں اسی طرح شور کرتی رہیں۔ ماضی حال
اور مستقبل سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔

پھر اس نے اپنے چاروں طرف ایک دفعہ پھر ڈرتے ڈرتے نظر ڈالی۔
بڑی خوبصورت، تکلیف دہ دنیا اسی طرح دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔
"کمن بھیّا — کمن بھیّا — خدارا لکھنؤ واپس چلو —" اس نے تقریباً
چلا کر کہا۔
"لکھنؤ نہیں روشنی بی بی —" کمن نے آہستہ سے کہا — "ہم دلّی جا رہے ہیں

—تم نے اخبار کب سے نہیں دیکھا روشی بی بی —؟" اس نے رسان سے پوچھا۔

کائنات یکلخت بہت تیزی سے چاروں اور ڈولنے لگی۔ فضا کی چیخیں بلند ہو گئیں۔ شعلے اونچے اٹھنے گئے۔ چاند تیزی سے گھومنے لگا۔ عناصر کے طوفان کی گھن گرج کے ساتھ ساتھ تاریک ہوائیں فرّاٹے بھرنے لگیں۔ زمین، آسمان، ساری دنیا، ساری کائنات، سب سرخ ہو گئے۔ اس نے خوفزدہ ہو کر، بیحد خوفزدہ ہو کر ڈرتے ڈرتے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ مرے ہوئے انسان، ان گنت مرے ہوئے انسان چاروں طرف نیچے گر رہے تھے۔ گدھ چکر کاٹ رہے تھے۔ گیدڑ چیخ رہے تھے۔ چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ ایک اور سفر تھا۔ کاٹھ گودام سے نینی تال، راجپور سے مسوری، کالکا سے شملہ، یا ناسک سے بمبئی تک کا خوشگوار، سہانا سفر نہیں تھا۔ دوسرے کام کرنے والوں کے ساتھ دلّی تک کا سفر تھا۔ دلّی کے کیمپ تھے۔ پرانے قلعے اور لال قلعے کے میدان تھے۔ بارش اور گھنگھور گھٹائیں تھیں۔ مہرولی اور قطب صاحب پر ہمیشہ کی طرح چھانے والے کالے بادل تھے بجلیوں کی کڑک تھی۔ ستمبر کی دھاوڑیں تھیں۔ شدید تکلیف دہ بخار کی سی کیفیت تھی۔ سرخ پپوٹوں میں انتہائی تیز جلن کہیں سے گھس آئی تھی۔ کرۂ آفتاب اپنی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ زمین سے ٹکرا گیا تھا۔ ان کے ساتھ وہاں پر مہاتما گاندھی کے صرف چند چیلے اور عقیدت مند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں کمیونسٹ پارٹی کے مخلص اور ان تھک کام کرنے والے رفقا تھے جو اپنے سارے سیاسی اختلافات بھول کر جی توڑ کے ان کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ جمیعت العلمائے کے

رضا کار تھے۔ سید افتخار کے ساتھی پہلے تو مسلمانوں کو Demoralise کر رہے تھے اور پھر بھاگے جا رہے تھے یا پہلے ہی بھاگ چکے تھے۔ اور وہاں پر بارش میں پھولی ہوئی ان گنت لاشیں تھیں۔ اور گورکھا سپاہیوں کی سنگینیں اور سکھوں کی کرپانیں تھیں۔ اور ان گنت مسلمانوں کا خون تھا جو گلیوں میں بہتا تھا۔ سڑکوں پر بہتا تھا۔ بارش کے پانی میں مل کر سڑکوں کے دونوں طرف کی نالیوں اور نالوں میں بہتا تھا۔ اور پھر دوائیں تھیں، ہسپتال تھے۔ پرانے قلعے کے میدانِ حشر کی موتیں تھیں۔ زخمیوں اور مرتے ہوئے انسانوں پر ڈھکے ہوئے سرخ کمبل تھے۔ جو ہر طرف قطاروں میں نظر آتے تھے۔ سرخ کمبل ــــ سرخ کمبل ــــ وہ رات کو چور چور جسموں، ماؤف دماغوں کے ساتھ لال قلعے کے میدان میں کام کرنے والوں کے ہیڈکوارٹرز کے کیمپ میں جمع ہوتے۔ وہاں اکٹھے بیٹھتے اور سوچتے۔ سوچتے اور [illegible] جاگتے۔ وہ اکتا کر دھیرے دھیرے، نیچی آوازمیں کوئی گیت یا جن گن من شروع کرنا چاہتے لیکن آواز ان کے حلق میں اٹک جاتی۔ وہ مسکرا کے ایک دوسرے کی ہمّت افزائی کا ارادہ کرتے لیکن جی میں سب کو کوستے۔ خدا کی قسم یہ سب غلط ہے۔ دھوکا ہے۔ بہت برا خواب ہے۔ یہ سب کچھ نہیں ہے۔ ابھی ہم جاگیں گے۔ [illegible] یہ سب کچھ جھوٹ معلوم ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔ یہ حقیقت تھی۔ گولیوں کے سنسنانے کی آوازیں، اور ست سری اکال کے نعرے، اور اندھیرے آسمان میں [illegible] رنگ بلند ہوتے ہوئے شعلے یہ سب واقعہ تھا۔ یہ سب لاکھوں انسانوں پر [illegible] لمحے، ہر گھڑی بیتتا جا رہا تھا۔ کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ کنٹرول روم بے کار تھا۔ [illegible] ہوم ڈیفنس کونسل بیکار تھی۔ وہ مدراسی فوج بالکل بے فائدہ تھی جو پنڈت نہرو نے

انتہائی پریشانی کے عالم میں جس قدر جلد ہو سکا تھا جنوب سے اس خیال سے
منگوائی تھی کہ فرقہ پرستی کا یہ زہر اب تک جنوب کی فوجوں میں نہ پھیلا تھا۔ پنڈت جی
نے بلدیو سنگھ سے کہا۔ خدا کے لئے دلّی کی حفاظت کے کام پہ فوج اور ملٹری پولیس
میں مسلمان افسر بھی رکھو لیکن حسبِ معمول ان کی کسی نے نہیں چلنے دی۔ ان کے
پاس فون آیا مکتبہ جامعہ جل رہا ہے۔ خدا کے لئے کچھ کیجئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگے۔ اور انہوں نے چلّا کر کہا ارے یہ کیا غضب کر رہے ہو۔ اس مکتبے
کو تو چھوڑ دو۔ یہ محض کاغذوں کا انبار نہیں ہے۔ یہ ایک پوری نسل کا سرمایہ ہے
قوم کی عزیز ترین دولت ہے مستقبل کے لئے ہماری زادِ راہ ہے۔ اس کے لئے
اسے بنانے، اس ذخیرے کو جمع کرنے کے لئے ذاکر حسین نے اپنی آنکھیں کھوئی
ہیں۔ آنسو انکی پلکوں پر جھلملاتے رہے۔ لیکن زندھاوا کے کان پر جوں نہ رینگی۔
سونی پت میں فساد ہو گیا۔ وہ موٹر پر بیٹھ کر بھاگے بھاگے وہاں پہنچے۔ انہیں دیکھتے
ہی ہجوم نے نعرے بلند کیے۔ نہرو جی زندہ باد، نہرو جی ہم نے سب کمبختوں کا بالکل
صفایا کر دیا۔ یقین نہ ہو تو موٹر سے اتر کر خود دیکھ لیجئے۔ رات کے گیارہ بجے انکے
پاس فون آیا کہ جامعہ ملیہ پہ حملہ کر دیا گیا ہے۔ وہ فوراً کسی کو ساتھ لئے بغیر تنہا
اوکھلے پہنچے۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ اطلاع غلط تھی۔ راجکماری امرت کور اور لیڈی
ماؤنٹ بیٹن کو پتہ چلا کہ وہ تنہا حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے چل دیئے ہیں تو وہ
گھبرا کر ان کے پیچھے پیچھے گئیں۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ اوکھلے سے ادھر ایک
بستی میں دیہاتیوں کے ساتھ چارپائی پہ بیٹھے پانی پی رہے ہیں۔ ان سے گپیں ہانک
رہے ہیں اور انہیں سمجھا رہے ہیں کہ بھائی مسلمانوں کو نہ مارو۔ یہ سب کچھ انہوں نے

کیا۔ لیکن یہ سب بیکار تھا۔ مہاتما گاندھی کلکتے سے واپس آئے۔ انہیں دیکھ کر
مسلمان، جو انہیں قوم کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے، بچوں کی طرح رونے لگے۔
انہوں نے کہا بھائیو۔ مجھے یہاں سبزی نہیں ملتی۔ کیسے ملے۔ مسلمانوں کو تو تم نے
سبزی منڈی میں مار کے ختم کر دیا۔ مسلمانوں کو کیوں کاٹ رہے ہو۔ ایک زمانہ
وہ تھا جب خلافت کے دنوں میں علی برادران نے انہیں جامع مسجد کے منبر پہ
لا بٹھایا تھا۔ آج وہ ایک دفعہ پھر اسی جامع مسجد کی خون آلود سیڑھیوں پر چڑھے
علی برادران نے ان محرابوں کے تلے جو خواب دیکھے وہ آج ٹوٹ پھوٹ کر
خاک و خون میں مل چکے تھے۔ مہاتما گاندھی نے خدا کے اس گھر میں پناہ لینے والی
بے کس عورتوں اور لڑکیوں کے سروں پہ ہاتھ رکھا۔ ان سے کہا مت روؤ۔
میں تمہارا باپ ہوں۔ مجھے اپنا باپ سمجھو۔ کسی نے، خود ان کی قوم نے انہیں
اپنا باپ نہ سمجھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جو کشمیر سے واپسی میں مشرقی پنجاب سے گذرتے
ہوئے جالندھر کے سٹیشن پہ موت کے منہ سے بچ کر نکلے تھے، دن دن بھر خود
کھڑے ہو کر گلی قاسم جان میں تندور پہ پناہ گزین مسلمانوں کے لئے روٹی پکواتے
تھے اور خود تقسیم کرتے تھے، ان کی بینائی بیحد کمزور ہو چکی تھی، جالندھر کے واقعے
سے ان کے اعصاب کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن وہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روز
کام کر رہے تھے۔ ہائی کمشنر کے ہاں روٹیوں اور کھانے پینے کے ذخیرہ پر پڑا پڑا
سڑ رہا تھا۔ لیکن کسی میں ہمت یا فکر نہ تھی کہ باہر جا کر مسلمانوں تک پہنچائے۔
بی، او، اے، سی کے طیاروں کے ذریعے جو روٹیاں اور کھانا کراچی سے بھیجا گیا
تھا، وہ پرانے قلعے کی بلیک مارکیٹ میں فی روٹی پانچ پانچ دس دس روپے کے

حساب سے فروخت کیا جا رہا تھا (اور نئی سرحد کے اس پار گورنمنٹ ہاؤس
کی اسٹریم لائینڈ لاؤنج میں ایک نسوانی آواز گجراتی لہجے میں کسی معزز مہمان کو
بتا رہی تھی۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہماری کوم خود اتنی بے ایمان ہے۔ بی او اے سی
کے ہوائی جہازوں پر انگریز ہوا بازوں کے ہاتھ جو خاص طور پر ولایت سے
اڑ کر اسی لئے یہاں آئے تھے، ہم نے دلّی کے مسلمانوں کے لئے روٹیاں
بھجوائیں جو ہماری کوم کے ذمے دار افسروں نے بلیک مارکیٹ میں بیچیں اور
ہمیں انگریزوں کے آگے شرمندہ ہونا پڑا) رفیع احمد قدوائی کی کوٹھی میں چپّے
چپّے پر خیمے لگا دیئے گئے تھے اور کونے کونے میں مسلمانوں کو پناہ دی گئی تھی۔
یہ وہ قوم پرست مسلمان تھے جنہیں اٹھتے بیٹھتے گالیاں دیتے رہنا ہر ایک کا
مقدس فریضہ تھا۔ جو نفرت کی بنیادوں پر اٹھائی ہوئی سیاست کے اس
بھیانک نتیجے کے خلاف برسوں سے چلّا رہے تھے۔ لیکن کسی نے ان کی
نہ سنی تھی کرن   تھکا ہوا، بہت شکستہ، برلا ہاؤس سے واپس آتا۔ باپو نے
کہا ہے تم لوگ ہمّت نہ ہارو۔ میں تمہارے لئے دعا کر رہا ہوں۔ پنڈت جی
اپنے جذباتی لہجے میں کہتے۔ میرے دوستو اور رفیقو۔ انسانیت کا عظیم ترین
امتحان اس سمے ہمارے سامنے ہے۔ بہت بڑا بوجھ ہمارے کندھوں پر ہے
ہمیں ہمّتیں نہ ہارنی چاہئیں ـــــ اور پھر انہیں معلوم ہوتا کہ کام کرنے والوں کے
ہیڈکوارٹرز کے انچارج شیر جنگ کو ان سب کی حفاظت کے لئے دو ریوالور
بھی دیدیئے گئے ہیں پھر بھی ان کی ہمّتیں نہ بندھ پائیں۔ کمزور انسان اتنا کٹھن
سمے نہیں سہار سکتا۔ نہیں سہار سکتا۔ یہ سب راکشسوں، دیوں اور غاروں میں

رہنے والے وحشیوں اور بھیڑیوں کے زمانے کی باتیں تھیں۔ انسان مرچکا تھا۔ انسان کب کا ختم ہو چکا تھا۔ انسان جسے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔ جسے زمین پر خدا کا خلیفہ بنایا گیا تھا، جس سے زمین پر خدا کی آسمانی بادشاہت کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن انسان نہیں تھا۔ خدا نہیں تھا۔ خدا، یا کہیں دور دراز سفر پر چلا گیا تھا یا اس کے رحم و کرم کے مشہور و معروف سارے خزانوں کا دیوالہ نکل چکا تھا۔ اور وہ بخار کی سی جلن، وہ پپوٹوں کی شدت کی بے چینی قائم تھی۔ دنیا سرخ اندھیاری میں ڈولتی، گھومتی، چکّر کاٹتی، قیامت کے سرخ صحراؤں کی طرف نکلی چلی جا رہی تھی۔ روشی ڈارلنگ تم مسلمان ہو۔ اس لئے بندی لگا کر کورو کشیتر کیمپ تک ہمارے ساتھ چلنا۔ بچارے شرنارتھی مسلمانوں کے نام ہی سے اب اتنی نفرت کرتے ہیں کہ وہ تمہیں دیکھنا برداشت نہ کر سکیں گے۔ روشی ڈارلنگ تم یہاں غرارے نہ پہننا — اچھا؟" او ما اس سے کہتی۔ اپنے ملک میں، اپنے وطن میں، شیر شاہ اور اکبر اور شاہجہان کی دلّی میں مسلمان ہونا جرم تھا۔ خطرہ تھا، شرم تھی یہ سب ایک تماشے کی طرح، ایک دیوانے خواب کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گذرتا جا رہا تھا۔ ایک دیوانہ خواب — سنگین — خون آلود سڑکیں — ملٹری پولیس کے ٹرک — خوبصورت جمپوں والے فوجی افسر۔ ولنگڈن ایئر پورٹ پر سے اترتی اور چڑھتی ہوئی سنہرے بالوں والی حسین فضائی میزبان لڑکیاں اخباروں کے غیر ملکی نمائندے۔ پناہ گزینوں کے قافلے۔ چلتی ہوئی ٹرینیں لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن — لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن — کیمپوں میں دن دن بھر اور رات گئے تک کام کرنے کے بعد اس کا کوئی ساتھی تھک کر

چند لمحوں کے لئے کسی محبوب شاعر کی کتاب اٹھا لینا اور انقلاب کے متعلق ترنم سے کوئی نظم پڑھ کر وقت گذارنے اور دھیان بٹانے کی کوشش کرتا تو وہ چیختی ـــ انقلاب! انقلاب!! ارے یہ انقلاب ہے شرم نہیں آتی تمہیں ایسی نظمیں پڑھ کر خوش ہوتے ہوئے۔ ملک بھر کے اس قتلِ عام کو تم کرانتی کے مقدس نام سے پکارنے کی کوشش کر رہے ہو ـــ؟ اگر ہمیں شرم آتی ہوتی تو اس حالت کو ہی کیوں پہنچتے۔ تم یہاں اس کیمپ میں کیوں موجود ہوتیں میری عزیز دوست۔ وہ رسان سے کہتا۔ وہ چپ ہو جاتی۔ سب چپ ہو جاتے۔ اور اگلی صبح کا انتظار کرنے لگتے جب انہیں مزید لاشوں کو اٹھوانا، مزید زخمیوں کو سرخ کمبلوں میں لپیٹنا ہو گا۔

پھر ایک شام، جب کہ شہر کے سب علاقوں میں فساد زوروں پر تھا اور ولنگڈن ایرپورٹ کی طرف بھاگتے ہوئے بے کس مسلمانوں کے قافلے لوٹے اور قتل کئے جا رہے تھے اور مضافات کے اسٹیشنوں پر سے نئی سرحد پار جانی ٹرینوں کے مسافروں کا صفایا کیا جا رہا تھا اس وقت کسی نے پھولے ہوئے سانس سے سائیکل پر بھاگتے ہوئے آ کر زخشندہ کو خبر دی کہ پی چو دلی ہی میں موجود ہے۔ کسی نے اسے فوج کی ایک اسٹاف کار میں بیٹھے کنگ ایڈورڈ روڈ یا کوئنز وے پر سے گذرتے دیکھا ہے۔ لیکن اس کے آگے وہ کچھ نہ بتا سکا۔ اور وہ سب کچھ بھول گئی۔ اسے صرف یہ یاد رہ گیا کہ پی چو وہاں پر ہے۔ اسی شہر میں موجود ہے۔ اسے واپس مل سکتا ہے۔ اس کے ساتھ گھر واپس چل سکتا ہے۔ اس کے دماغ میں صرف ایک خیال گونجتا رہا۔ پی چو ـــ پی چو

بھی جو اس قیامت میں سے گذر کے وہ ایک بار پھر اسے مل جائے گا۔ اس کا اپنا
پیارا، چہیتا بھائی پی چو ——— وہ تیزی سے پردہ ہٹاتی ہوئی خیمے سے باہر نکل آئی۔
اس نے کرن کو آواز دی۔ لیکن کرن اسی وقت کچھ دیر پہلے کسی ضروری کام کے
لئے پہلے ہوائی جہاز سے جالندھر بھیج دیا گیا تھا۔ اس نے پتہ چلانے کی کوشش
کی کہ پی چو کس مقام پر تعینات ہے۔ لیکن اسے معلوم ہوا کہ اس وقت دلّی کی فوج
یا پولیس میں ایک بھی مسلمان افسر کو نہیں رکھا گیا ہے۔ اس نے ہر ممکن جگہ فون کیا
ہر اس شخص سے جو اس کے خیال میں پی چو کا پتہ بتلا سکتا تھا اس نے پوچھا۔ لیکن
سب بیکار تھا۔ پھر اسے دفعتاً خیال آیا کہ کنٹرول روم سے فوراً معلوم ہو جائیگا۔
کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ کرفیو کئی دن سے لگاتار جاری تھا لیکن
اس نے دنیا کی کسی بات کا مطلق دھیان نہ کرتے ہوئے اپنے ایک ساتھی کی
کار باہر نکالی اور اسے اطلاع دیئے بغیر اپنا کرفیو پاس پرس میں ڈال کر زنّاٹے
سے گھنٹہ گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ دور سے گولیاں چلنے کی آواز آتی رہی —
ایکسلریٹر پر اس کے پیر کا دباؤ حسب عادت زیادہ ہوتا گیا۔ سنسان سڑکوں پر سے
گذرتے ہوئے، اس نے اپنی رفتار اور تیز کردی۔ اور تیز ——— اور تیز۔
یہاں تک کہ وہ کنٹرول روم تک پہنچ گئی۔ میونسپل ہال کی عمارت کے
پھاٹک پر اس نے کار روک لی۔

پہرے دار کے خیمے میں سے گرجتی ہوئی آواز نے پکارا
"ہالٹ ہُو کمز دیئر۔"

"فرینڈ" ——— اس نے جواب دیا۔

پھاٹک کے سنتری نے بندوق کا دستہ بجاتے ہوئے
"ہالٹ حکم صدر" ———

اپنے افسر کا سوال دہرایا۔

وہ پھاٹک کے اندر داخل ہو گئی۔ کار کے لیمپوں کی روشنی خیمے کے دروازے پر پڑی پہرے کا افسر سنٹرل گورنمنٹ کے ہاں کی کار دیکھ کر کرسی پر سے اٹھا۔ اور خوش خلقی سے مسکرا دیا۔

اس اجنبی، دشمن، خوفناک علاقے میں دوستی کا ہلکا سا تبسّم — یہ بھی بہت تھا۔ اس نے کار آگے بڑھانی چاہی۔ لیکن اس کی روشنی میں ایک اور انسان اس کے مقابل میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھہر جاؤ — وہ تحکمانہ انداز میں چلّایا —

کار کی پوری روشنی اس کے چہرے پر پڑی اور رخشندہ کا دل اپنی جگہ پہ ٹھہر سا گیا — "خورشید — !" وہ چیخی —

وہ انسان بے پرواہی سے کھڑا سگریٹ سلگاتا رہا۔

"خورشید — تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ پھر چیخی۔

"میں — ؟ میں یہاں جھک مار رہا ہوں۔ تم اس وقت کیا کرنے یہاں پہنچ گئیں؟ کنٹرول روم میں۔ سب بیحد مصروف ہیں تم کس سے ملنا چاہتی ہو — ؟" اس نے کار کی کھڑکی کے قریب آ کر پوچھا۔ اس کے بال الجھے ہوئے نہیں تھے۔ اس کی آنکھیں بیخواب نہیں تھیں وہ کھدر کے لباس کے بجائے فوج کی وردی پہنے کھڑا تھا۔

"خورشید۔ تم یہاں کیسے موجود ہو؟" رخشندہ نے پھیلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

"یہاں موجود نہ ہوتا تو کیا بھوکا مر جاتا — ایک سہانی صبح میں نے انکشاف کیا رخشندہ بیگم کہ دنیا کی نعمتیں صرف کرواہا راج والوں ہی کے لئے مخصوص نہیں۔ ہر وہ انسان

ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے جو سوچنے کی عادت بالکل چھوڑ دے۔ چنانچہ میں نے بھی سوچنے کی عادت ترک کر دی اور اب چین کی زندگی گزار رہا ہوں سوائے اس کے کہ راولپنڈی جانے سے پہلے سپریم ڈیفنس کونسل والوں نے مجھے کل سے یہاں بھیج رکھا ہے ـــــ اور مجھے کل سے اپنا پانچسو پچپن کا ڈبہ نہیں مل سکا ہے۔ تمہارے پاس ہے؟ تم اتنی زرد کیوں نظر آرہی ہو" اس نے آگے جھک کر پوچھا

"کیا کرو اہا راج والے بھی سوچنے کی عادت میں مبتلا ہو گئے ـــــ خیر اب یہ وقت ان خوشگوار باتوں کا نہیں ہے جلدی بتاؤ تم اس وقت کیسے آنکلیں، اور بالکل تنہا۔ غضب کر دیا تم نے۔ رات کا وقت ہے، کرفیو لگا ہوا ہے، فساد ہو رہا ہے اور تم کار میں اسی طرح گھوم رہی ہو جیسے یہ حضرت گنج کی سڑکیں ہیں"۔

"خورشید چپ رہو خدا کے لئے" ـــ اس نے چلا کر کہنا چاہا۔ لیکن اسی لمحے پھاٹک میں سے ایک برق رفتار موٹر بائیک پر گشتی دستے کا ایک افسر اندر داخل ہو کر خیمے کے سامنے آن رکا۔ اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دونوں طرف سے سلیوٹ ہوئے، ہتھیار جھنجھنائے اور کار کے لیمپ کی روشنی میں نووارد نے ایک پرچہ ہاتھ بڑھا کر لفٹننٹ خورشید کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "شاہدرہ سے ٹیلی فون آیا ہے۔ وہاں کا کمانڈنگ افسر آج شام کے چھ بجے مارا گیا۔ اسے ری پلیس کرنے کے لئے مسٹر پرتھوی پال سنگھ آئی۔ پی کو فوراً روانہ کرو"۔ اس نے کہا۔

"کون ـــ کون کمانڈنگ افسر؟" رخشندہ نے کار میں بیٹھے بیٹھے سانس نیچے کو روکتے ہوئے پوچھا۔

"کون ـــ؟ پتہ نہیں ـــ ٹھہرو مجھے پورا پیغام پڑھ لینے دو۔" لفٹننٹ خورشید

نے کہا۔"یہ اندر کی دوسری روشنی جلاؤ"۔۔۔ اس کی آواز میں ہمیشہ کا بچّوں کا ساضدّی پن اور تحکّم تھا۔ کار کی بتّیوں کی روشنی میں وہ جلدی سے پرچے پر جھک گیا۔ "مر گیا"۔۔۔ اس نے اپنی کالی آنکھیں اوپر اٹھا کر کہا۔ "تمہارا بھائی مر گیا۔۔۔ سمجھیں تم ۔۔۔ کروا ہا راج اور غفران منزل کا چراغ گل ہو گیا۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ، یہ سب کہنے کی مجھے فرصت نہیں ہے۔ لہٰذا تم اب فوراً واپس چلی جاؤ۔۔۔۔ رات زیادہ آگئی ہے۔۔۔۔ ذرا ایک منٹ رکو۔ میں تمہارے ساتھ چند کانسٹبل کیئے دیتا ہوں ۔۔۔ واقعی تم سب عجیب و غریب ہو۔۔۔ اتنے خطرناک زمانے میں تنہا چلی آئیں۔۔۔ کمال ہے بھئی۔۔۔ ارے حوالدار کھڑک سنگھ ہے؟"۔۔۔ دوسری طرف مڑ کر اس نے آواز دی۔۔۔

یکلخت فضا پر مکمل سناٹا طاری ہو گیا۔ گولیوں کی سنسناہٹ، اور ست سری اکال کے نعرے خاموش پڑ گئے۔ ریڈیو کا روشن ڈائل ورکرز کے ایک اندھیرے خیمے میں مدھم سی روشنی پھیلاتا رہا۔ رات کا گجر بجنے والا تھا۔ موت کی رات کا گجر۔ اور پارلیمنٹ اسٹریٹ کے محفوظ اسٹوڈیوز میں بیٹھا ہوا آل حسن اپنی خوبصورت آواز میں حسب معمول پروگرام کے اختتام کے بعد اناؤنس کر رہا تھا۔ یہ دلّی ہے۔

پی چو مر گیا۔ پی چو مر گیا۔ پی چو اور موت۔ جوانی اور موت۔ وہ مر گیا۔ موت جناب کوئی آسان بات نہیں کہ میلوڈرمیٹک بن کے یا قومی جذبے اور جوش کے مارے مر جائیے۔ موت خوفناک ہے۔ بیحد خوفناک ہے۔ اس سے ڈر لگتا ہے۔ پی چو مر گیا جبکہ وہ جوان تھا۔ دنیا جوان تھی۔ مرغزاروں میں پھول مہک رہے تھے۔ دور

وطن کے سبزہ زاروں اور آم کے ہرے کنجوں پر گھٹائیں برس رہی تھیں۔ اس وقت
وہ ختم ہو گیا۔ وجود کے اس چکر میں سے علیحدہ ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔
اس سے زیادہ حماقت انگیز خبر کبھی سنی تھی کسی نے؟ زندگی پر ہنسی آتی ہے۔ موت
پر ہنسی آتی ہے۔ یہ اتنی مضحکہ خیز باتیں ہیں۔ وہ شیلانگ میں تھا جس وقت اس
کے دفتر میں سردار پٹیل کی طرف سے بھیجا ہوا سرکلر پہنچا۔ وہ قوم پرست تھا۔
سیاسیات میں اس کے اپنے چند عزیز اصول تھے۔ اسے پتہ تھا کہ حالات اس
طرح کے کر دیئے گئے ہیں کہ ملازمتوں کے بہت سے لوگ اپنے سیاسی عقائد کے
باوجود دوسری ڈومنین کو منتخب کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ لیکن وہ اپنے ملک
کے باقیماندہ بے کس مسلمانوں کو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود دوسری
ڈومنین کو بھاگ جانے پر تیار نہ تھا۔ اس نے فائینل طور پر ہندوستان کا انتخاب
کیا اور اس کے چند روز بعد اس کا تبادلہ دلّی کا ہو گیا۔ اس وقت تک پنجاب
کے فسادات اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے ۳ر جون کا پلان اناؤنس کر دیا گیا
تھا۔ اس اعلان کو دونوں سیاسی جماعتوں کے منظور کرنے سے کچھ ہی دیر قبل
رات کے بارہ بجے کے قریب مولانا آزاد انتہائی پریشانی اور دکھ کے ساتھ
گل رنگیں پہنچے ——————— گل رنگیں
پہنچ کر انھوں نے کہا، خدا کے لئے اس پلان کو منظور نہ کرو۔ اس کا نتیجہ انتہائی
تباہ کن ہو گا۔ انگریزوں کی چالبازی کا اس سے بڑا اور بدترین نمونہ آج تک
کہیں نہیں دیکھا گیا ہے، خدارا اسے نامنظور کر دو۔ ملازمتوں کے مسلمانوں کو
راوپٹ آؤٹ، کرنے سے کسی طرح روکو۔ کیبنٹ مشن کی تجاویز اب بھی مان لو۔ یہ

غلط ہے کہ ۳ رجون کے اعلان کے علاوہ اب ہمارے سامنے کوئی دوسری صورت نہیں ہے کیبنٹ مشن کی تجاویز اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ غنیمت ہیں۔ اب بھی موقع ہے۔ ورنہ ملک تباہ ہو جائے گا۔ قوم تباہ ہو جائے گی۔ ہم صدیوں تک نہ سنبھل سکیں گے۔ لیکن ان سے کہا گیا کہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ وہی ہو گا جو طے کر لیا گیا ہے۔ مولانا آپ کی یہ تبلیغ بالکل بے سود ہے۔ وہ مایوس ہو کر اس روتی ہوئی اندھیری رات کے سناٹے میں اپنے گھر لوٹ آئے۔ اگلے روز ریڈیو پر اعلان کر دیا گیا کہ ۳ رجون کا پلان منظور کر لیا گیا۔ دو الگ الگ ریاستیں قائم کر دی گئیں۔ باؤنڈری کمیشن بٹھا دیا گیا۔ باؤنڈری فورس تیار کر لی گئی۔ خدا کے انسان باہمی نفرت کی اتھاہ خلیج کے دونوں طرف بٹ گئے۔ سلامتی ہو ان سب پر جنھوں نے اس پلان کو پیش کیا، منظور کیا۔ اور اس پر عمل کیا ——

وہ جس وقت دلّی پہنچا پندرہ اگست کی شبھ گھڑی آکر گذر چکی تھی۔ دفاعی ملازمتوں کے مسلمان پاکستان جا چکے تھے۔ اس کے علاوہ وہ بلدیو سنگھ پٹیل رندھاوا اینڈ کو نے دہلی پولیس کے سولہ سو مسلمان کانسٹیبلوں کو یک لخت برطرف کر دیا تھا پی جے کے لئے دارالسلطنت کی پولیس میں کوئی جگہ نہ تھی۔ لیکن اس کی غیر معمولی قابلیّت اور اپنے محکمے میں ہر دلعزیزی کی وجہ سے اسے سپریم ڈیفنس کونسل کے افسروں میں لے گیا کونسل کے دوسرے ہندو سکھ اور انگریز عہدیداروں کے ساتھ، پاکستان جانے والی ٹرینوں اور قافلوں کی نگرانی اس کے سپرد کر دی گئی۔ اسے اپنے ساتھیوں کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ اسے صرف یہ معلوم تھا۔ کہ کنور صاحب کا انتقال ہو چکا ہے، درخشندہ، کرسٹابل اور کرن بمبئی میں ہیں۔ گنّی کی

شادی ہو رہی ہے۔ ڈائمنڈ پاکستان چلی گئی۔ سلیم اپنی بیوی کے ساتھ الٰہ آباد میں ہے
اور پھر ولایت جانے والا ہے۔ وہ دن دن بھر اور رات گئے تک، باہر کی دنیا سے
سارے تعلقات منقطع کئے اپنے دفتر میں کام میں مصروف رہتا۔ نئی سرحد کو دونوں
سمتوں میں عبور کرنے والے قافلے ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے سے گذرتے
رہتے، ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے قافلے، پیدل، بیل گاڑیوں پر، خون آلود ٹرینوں
پر جو قافلے، انسانیت کی ٹریجڈی کے عظیم الشان کارواں، گرتے پڑتے دہلی کی نواح
اور مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب جا رہے تھے، ان گنت شکستہ انسان، سینکڑوں
ہزاروں برہنہ عورتیں اور لڑکیاں، زینبؓ کے نانا کی امت کی بیٹیاں، جو چلتے چلتے
تھک کر اور شرم و غیرت سے نڈھال ہو کر سڑک پر بیٹھ جاتیں تو کوئی ان کی پرواہ نہ
کرتا۔ کارواں آگے بڑھتا چلا جاتا، پیچھے سے کوئی فوجی، کوئی مرد مجاہد، کوئی خالصہ
سورما قریب آ کر انہیں جلتی زمین پر گید ڈالتا یا پھر آگے دھکیل دیتا۔ امریکن نامہ نگاروں
کے کیمرے کلک کلک کرتے۔ لائف اور پوسٹ میں قرون وسطیٰ کے اس ہندوستان
کی مذہبی جنگ کی تصویریں چھپتیں۔ امپریل جم خانہ میں رقص ہوتے، اور لیڈی پیملا ماؤنٹ
بیٹن اغوا شدہ عورتوں کے کیمپوں میں جا کر ان سے ہاتھ ملاتیں۔
وہ اپنی رائفل پر ہاتھ رکھے یہ سب دیکھا رہتا۔ وہ پناہ گزین جن کی بیویاں اور
بیٹیاں پنجاب کے میدان حشر میں ان سے بچھڑ گئی تھیں یا ان کی آنکھوں کے سامنے
ان سے چھین لی گئی تھیں، دیوانوں کی طرح چیخ اٹھتے۔ ذرا سوچو۔ بھگوان کے لئے
ذرا سوچو۔ ہماری بیٹیاں، ہماری بہوئیں، ہماری بہنیں، ان کتوں کے وہاں موجود ہیں
اور ان سے چھڑا کر یہاں منگوائی جا رہی ہیں۔ سوچ سوچ کر خون کھولتا ہے۔ جی چاہتا ہے

سب کو، ساری دنیا کو گولی مار دی جائے۔ ہمیشہ کے لئے اس بکھیڑے کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن مردود لالہ سارا بھائی ہم سے کہتی ہیں ان عورتوں کو واپس لو۔ یہ تمہاری قوم کی لاج ہیں۔ تمہارے گھروں کی عزت ہیں۔ ارے یہ ہمارے گھروں کی لاج اور عزت ہیں۔ ارے یہ ہماری عورتیں ہیں۔ یہ ان سوروں کے بچے اپنے ساتھ لیکر آئی ہیں۔ ارے کبھی دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ اس سے شدید ٹریجڈی کہیں ہوئی تھی؟ وہ دفتر میں بیٹھے بیٹھے اپنے ساتھیوں کی باتیں سنتا۔ لاہور تمہارے لئے محفوظ ہے۔ دہلی ہمارے لئے محفوظ ہے۔ ہم ہندی ہیں۔ تم پاکستانی ہو۔ ہماری قومی زبان شدھ ہندی ہے۔ تمہاری قومی زبان خالص اردو ہے۔ ہم چٹیا رکھتے ہیں۔ تم گائے کا گوشت کھاتے ہو۔ تم نے اپنا ملک ہمیں سونپا ہے اور ہمیں ہمارے وطن سے نکالا ہے۔ ہم اب تمہارے یہاں آکر تمہیں تمہارے ملک سے نکال رہے ہیں۔ انسانیت کی تاریخ میں کہیں اس سے زیادہ حماقت انگیز جنوں کبھی ہوا تھا؟

لیکن یہ سب حقیقت تھی۔ اور واقعہ یہ تھا کہ اب پی چوہ مر چکا تھا اور اس کی موت سے، خدا کی تخلیق کی ہوئی ایک خوبصورت زندگی کے ختم ہو جانے سے دنیا کی کسی چیز پر کوئی اثر کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ شاہدرہ کا قبرستان اسی طرح سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ایک کچی قبر کے اضافے سے اس کی دہشت میں کوئی کمی یا بیشی پیدا نہ ہوئی تھی۔ شہر کے وسط میں کنٹرول روم میں کام اسی طرح جاری تھا۔ امپیریل جم خانہ اسی طرح جگمگاتا تھا۔ پنڈت جی کی آنکھوں میں آنسو اسی طرح جھلملاتے تھے۔ شاہدرہ کے اسٹیشن پر سے ریلیں اسی طرح گذر رہی تھیں جیسے

اس شام گذری تھیں۔ جب ایک پاکستان اسپیشل کے سارے مسافروں کو چن چن کر پٹری کے کنارے کھڑا کرکے انہیں گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا تھا اور ٹرین کے ڈوگرہ اور بلوچی محافظین، ایک دوسرے پر پل پڑے تھے، اور جب اس قیامت خیز دست بدست لڑائی میں انڈین پولیس کا ایک بڑا افسر (قومیت و مذہب نا معلوم) مارا گیا تھا، ٹرین گڑگڑاتی ہوئی آگے چلی گئی تھی اور اس کے بعد وہاں پر مکمل سکوت طاری ہوگیا تھا۔ اگلی، ٹھنڈی اور خوشگوار صبح کے ہندوستان ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق یہ مضافات کی ایک اکّا دکّا واردات تھی اور اس کے بعد حالات پر مکمّل قابو پا لیا گیا تھا۔ جلدی کی وجہ سے اس رپورٹ میں انڈین پولیس کے اس افسر کا نام نہ دیا جا سکا تھا۔ ایک اٹھائیس سالہ، نامکمّل، خوبصورت، جوان، گرم زندگی کے خاتمے کی ساری حقیقت سمٹ سمٹا کے ہندوستان ٹائمز کی رپورٹ کی ان چند ٹھنڈی، چیونٹیوں کی قطاروں جیسی سطروں میں آگئی تھی۔

چنانچہ یہ واقعہ تھا کہ پی چو مر گیا۔ پی چو جو قوم پرست تھا جو نیو آیرا میں آزادی کے حصول کے لئے شعلہ ریز مضامین لکھا کرتا تھا اور جو انڈین یونین کا وفادار ملازم تھا اور رات رات بھر جگ کے ہندو شرنارتھیوں کی حفاظت کے انتظام میں لگا رہتا تھا۔ اسے انہوں نے بندوقوں کے کندوں اور سنگینوں کی نوک اور گولیوں کی بوچھار سے ختم کر دیا۔ اور وہ ختم ہوگیا۔ وہ اس اندھیرے کے اس پار چلا گیا۔ پی چو کو انہوں نے مار ڈالا جس کے حسن میں زندگی کی، جوانی کی، انسانیت کی پاکیزگی تھی جس کا کندنی ایسا رنگ تھا جس کے کسی مرمریں مجسمے کی طرح ترشے ہوئے ہونٹ تھے، جس کی اپنی بہن کی طرح بڑی بڑی، حیرت زدہ

جھپکتی ہوئی آنکھیں تھیں، جس کے بالوں میں رات کے سمندر کے جیسے طرح طرح کے رنگ جھلکتے اور لہریں مارتے تھے، جو زندگی کی ابدی غنایئت، ابدی محبّت کا فرشتہ تھا جس طرح کے فرشتے ہمیں خوبصورت کرسمس کارڈوں میں نظر آتے ہیں لیکن اس کا کندن ایسا رنگ سپید پڑ چکا تھا۔ اس کے ترشے ہوئے ہونٹ خون آلود تھے۔ اس کی بڑی بڑی حیرت زدہ آنکھیں بہ تکلیف اٹھانے کے بعد بند ہو گئی تھیں۔ اس کے سمندر کی لہروں جیسے بال خاک آلود ہو گئے تھے۔ جوانی کی شدید پاکیزگی مٹی اور خون میں مل چکی تھی۔

اور وہ آنکھیں بند کئے سنسان پلیٹ فارم کے ٹھنڈے سخت فرش پر پڑا تھا۔ سرخ، جیتے جیتے، جوان خون کی جھیل اس کے چاروں طرف بن گئی تھی۔ وہ یقیناً مر چکا تھا۔ وہ اتنی آسانی سے اندھیارے کی وادی میں سے نکل گیا تھا۔ اسے موت کی تکلیف زیادہ نہ محسوس ہوئی ہو گی۔ موت جو خوفناک ہے۔ موت جس سے ڈر لگتا ہے۔ حملہ آوروں کی پہلی گولی اس کے خوبصورت بالوں میں سے گذرتی ہوئی اس کے دماغ میں لگی۔ اس کے فوراً بعد آناً فاناً متواتر پانچ چھ گولیوں نے اس کا جسم چھلنی کر دیا۔ لیکن اس وقت تک اس کی جان کب کی نکل چکی تھی۔ لیکن انہوں نے یہ کافی نہ سمجھا۔ پہلے انہوں نے اس کے بازو علحدہ کئے پھر اس کے پیروں کی رگیں کاٹ ڈالیں۔ اس کے بعد انھوں نے زیادہ وقت اس کے ساتھ ضائع کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی اور ست سری اکال کے نعرے لگاتے پلیٹ فارم کے دوسری طرف بڑھ گئے جہاں زیادہ شکار ملنے کی امید تھی۔

اور ٹرین گڑگڑاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اور اندھیرا اور خاموشی چھا گئی۔ رات کے اندھیرے
میں اس کے ساتھی افسر اسے اٹھا کر دفن کرنے کے لئے لے گئے۔ گہرے بادل
بہت نیچے جھک آئے تھے۔ اور گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ شاہدرہ کے
قبرستان میں ہوائیں تیزی سے سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے قبرستان کے
چاروں طرف پہرہ لگا دیا تھا کیونکہ جاٹ اور سکھ حملہ آوروں کے ان گنت ٹڈی دل
اب تک شاہدرہ میں چاروں طرف گھوم رہے تھے۔ اس کی بٹالین کے سارے سپاہیوں
اور افسروں میں کوئی مسلمان نہ تھا۔ بڑی مشکل سے وہ ایک مسلمان کہیں سے تلاش
کر کے لائے جس نے موم بتی اور ٹارچ کی روشنی میں کتاب دیکھ دیکھ کر نمازہ جنازہ
پڑھائی اور تلقین پڑھی۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں نماز جنازہ کی پرانی کتاب کے ایک
صفحے پر دھندلے دھندلے الفاظ دکھائی دے رہے تھے۔ اے خدا تو اسے
ہمارے لئے میرِ منزل بنا۔ تو اسے ہمارے لئے میرِ منزل بنا۔ پھر اس کے سپاہیوں
نے خود بڑی مشکل سے قبر کھودی اور ٹارچ اور موم بتی کی مدھم روشنی میں اسے

انہوں نے اس اندھیرے غار میں اتارا۔
خدا کی خوبصورت زمین پر خدا کے انسانوں نے اسے زندہ اور خوش نہ رہنے
دیا لیکن زمین کے نیچے تاریکی کے غار میں کم از کم اس کا جسم اب محفوظ تھا۔
تاریک فضاؤں میں عناصر کے طوفان کی گھن گرج شدید ہو گئی اور جھکڑ جو
بہت دیر سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ رات کی ساعتوں کے گذرنے کے ساتھ ساتھ
یک لخت بے انتہا زور پکڑتا چلا گیا۔

"پی چو اگر اب تک لکھنؤ واپس آگیا ہو تو اسے میرا بہت سا لو۔ دینا روشی۔ڈارلنگ۔ پتہ نہیں تم سب آج کل کہاں ہو۔ لیکن میں یہ خط غفران منزل ہی کے پتے پر بھیج رہی ہوں" ۔۔۔ ڈائمنڈ لاہور میں اپنے اسٹریم لائینڈ بیڈ روم میں بیٹھی خط لکھ رہی تھی۔ اور ٹافی کھاتی جاتی تھی۔ "ڈارلنگ ہمیں ماڈل ٹاؤن میں بہت بڑی، سجی سجائی کوٹھی مل گئی ہے۔ اس میں پینتیس ایرانی قالین ہیں، ذرا سوچو تو پانچ نہ دس پورے پینتیس ایک سے ایک بڑھیا ایرانی قالین، پیانو ہے، ٹینس کورٹ ہے۔ یہاں تک کہ گیسٹ ہاؤس بھی موجود ہے۔ جانے اتنی شاندار کوٹھی کا مالک بھاگ کر کہاں گیا ہوگا اور آج کل کس حال میں ہوگا۔ لاہور بڑا عمدہ شہر ہے۔ یہ وہ شہر ہے روشی ڈیئر جہاں بہترین آبنوس اور ٹیک کا فرنیچر ہفتوں سڑکوں کے کنارے الاؤ میں جلایا گیا اور قوم کی معزز لیڈر خواتین کے ہاں سے سینکڑوں ریڈیو سیٹ برآمد ہوئے ہر طرف لوٹ کے مال میں دلہنوں کے جہیز تھے۔ سہرے تھے۔ کتابیں تھیں گیتا نجلی اور بانگِ درا اور میدانِ عمل۔ ان کتابوں کے انباروں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کے ہندو کتنے خوش ذوق اور اردو کے شائق تھے۔ تقریباً متوسط طبقے کے ہر بھاگے ہوئے ہندو کے گھر میں الماریاں اچھی اچھی اردو کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔ ہمارے نوکروں نے شروع شروع میں بہت سی کتابوں سے تو چاہ بنائی۔ لاہور میں نے ابھی تمہیں بتایا ڈارلنگ کہ بےحد عمدہ شہر ہے۔ گو غلیظ بھی ہے۔ سنا ہے پاکستان بننے سے پہلے اور بھی زیادہ بارونق تھا۔ اور ہندوستان کا پیرس کہلاتا تھا۔ لیکن اب تو وہ سائیکل سوار حسین انچی فلم والی لڑکیاں نظر نہیں آتیں کیونکہ ڈارلنگ یہ پاکستان ہے اور شریعت بل پاس ہونے والا ہے لیکن بعض جگہیں

خاصی دلچسپ ہیں۔ برٹ اور تورینگ اور اسٹینڈرڈ۔ اسٹینڈرڈ تو بالکل اپنے
مسوری والے اسٹینڈرڈ کی شاخ معلوم ہوتا ہے۔ اور کافی ہاؤس دیکھ کر اپنا
لکھنؤ کا کافی ہاؤس یاد آتا ہے۔ ہائے لکھنؤ۔ لیکن روشی ڈیئر یہ پھر اپنا آزاد ملک
ہے۔ اپنا پاکستان ہے۔ اب تو جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ اب تو یہی ہمارا ملک ہے
ہیں نا؟ اور سنو۔ یہاں پنچولی کے اسٹوڈیوز ہیں۔ لیکن سیٹھ پنچولی سنا ہے کہ بھاگ
گیا ہے۔ اب شاید واپس آجائے تو پھر فلم بننے لگیں گے اور بڑا مزا آئیگا۔ ہم
شوٹنگ دیکھنے جایا کریں گے اور یہاں روشی ڈیئر میں نیناسے ملی۔ وہی شاہدہ آپا
محسن بھائی تو بچارے شاید بمبئی ہی میں ہیں۔ اور یہاں بہت سے لوگ نظر آئے سارے
علیگڈھ کے لڑکے۔ اور سنا تھا کہ یہاں میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں بڑے
سوپر ڈیلشر اسمیشر ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے تو اب تک کوئی ایک بھی ڈھنگ کا نظر نہیں
آیا۔ اور ایک روز یہاں کافی ہاؤس میں کچھ لوگوں کو روتے سنا کہ یار پاکستان کیا
بنا لاہور کا سارا کلچر ختم ہوگیا۔ اور روشی یہاں کا جمخانہ اتنا عمدہ کلب ہے۔
اتنا عمدہ کلب ہے کہ بالکل اپنے لکھنؤ کے دلکشا اور محمد باغ اور چھتر منزل کی
طرح کا ہے۔ بلکہ ان سے بھی اچھا۔ ڈارلنگ یہاں سب پنجابی ہیں۔ سب اس طرح
باتیں کرتے ہیں۔ جیسے ایک دوسرے سے لڑتے ہوں۔ بس ہر وقت تسی، مسی،
ساڈے تواڈے کرتے رہتے ہیں۔ لیکن سنا ہے ان کا مطلب دراصل بڑا اخلاق
اور تہذیب ہوتا ہے۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ بڑے پُرخلوص اور صاف دل ہوتے
ہیں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ اسی لئے کھینچ کر ڈنڈا دے مارتے ہیں۔ تُسی مُسی میں
اب پنجابی سیکھ رہی ہوں۔ بڑا لطف آرہا ہے۔ اور سنو۔ کہ کشمیر میں لڑائی شروع

ہوگئی۔ اتنا غصہ آیا کہ مسوری اور نینی تال چھٹا تھا تو خیر یہ اطمینان تھا کہ کشمیر قریب ہوگیا۔ اب وہاں بھی باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ خدا کرے اگلی گرمیوں تک سب ٹھیک ٹھاک ہوجائے تو سرینگر جائیں۔ ڈارلنگ تم بھی ضرور آنا۔ ویسے اس کشمیر کے قصے کی وجہ سے بڑا مزا آرہا ہے خوب اکسائیٹ منٹ ہو رہا ہے۔

اور روشنی ڈیئر ہماری کوٹھی میں الماریاں کی الماریاں بہترین سے بہترین کپڑوں سے بالکل چھت تک پُر تھیں۔ اللہ میرے ہم کیا کریں ان کا۔ کل وہ انسپکٹر آیا تھا جو سامان چیک کر کے بیت المال لے جاتا ہے تو ممّی نے سوچا کہ اتنا سامان سب کیوں انسپکٹر کے حوالے کردیں۔ آخر ہمارا بھی تو آتنا ہزاروں کا سامان مسوری میں لٹ گیا۔ لیکن ڈیڈی نے کہا کہ ان کا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ڈارلنگ جانے آجکل گلیمر بوائے کہاں ہوگا۔ اور گنی اور کرن اور سب لوگ۔ ہائے لکھنؤ ——— ہائے لکھنؤ ——"

خط لکھتے لکھتے اور ٹافی کھاتے کھاتے اسے نیند آنے لگی اور وہ لیمپ بجھا کہ مسہری پر جا کے سوگئی۔ باہر جھٹ پٹے کی تاریکی سارے میں پھیلتی جا رہی تھی اور آسمان پہ قازیں شور مچاتی ہوئی شمال کی طرف پرواز کر رہی تھیں۔

جھٹ پٹے کی تاریکی سارے میں پھیل گئی۔ ساری کائنات کو اس نے اپنے آنچل میں سمیٹ لیا۔ برف پوش چوٹیاں اور کہر آلود گھاٹیاں اور سفیدے اور چنار کے درختوں کے جھنڈ سب اس دھندلکے میں چھپ گئے۔ آسمان پر سے قازیں قہقہے لگاتی ہوئی گذرتی رہیں۔ موت۔۔۔ موت۔۔۔ موت۔ ارے ہائے۔ موت تو

بڑی خوفناک چیز ہے۔ اس سے اتنا ڈر لگتا ہے۔ اتنا ڈر لگتا ہے۔ کاش میں ۴۲ئہ
کے قصّے ہی میں ختم ہو گیا ہوتا۔ کاش میں انڈونیشیا میں گولیوں کا نشانہ بن گیا
ہوتا۔ کاش میں کسی انگریز کو مار کے مرا ہوتا۔ ارے یہ تو شہادت بھی نہیں ہے۔
صرف موت ہے۔ اس سنسان وادی کی سرد اکتائی ہوئی بے جان موت۔ اب جو
اگلے لمحے کسی قبائلی کی رائفل کی گولی سے میں ختم ہو جاؤں گا اس وقت مجھے اس
کا کیا یقین ہو گا، اس کا ثبوت کہاں سے ملے گا کہ بہت ہی شاندار طریقے سے میری
مکمّل اور بھرپور زندگی کا اختتام ہوا۔ دور برفیلی اور منجمد جھیلوں پر سے گذرتی ہوئی
سرد ہوا آ کے اس کے چاروں طرف سنسناتی رہی۔ جنوب کی سمت سے آنے والی
قازیں قہقہے لگاتی ہوئی اوپر سے نکل گئیں۔ مکمّل اور بھرپور — کیوں بکواس کرتے
ہو۔ مکمّل اور بھرپور — مائی فٹ — انسانیت۔ انصاف۔ جمہوریت۔ متحدہ
ہندوستان۔ قوم — فنڈل اسٹکس۔ ہوا کا جھونکا بہت خنک تھا۔ اس میں برفانی
سردی کی کپکپا دینے والی رو تھی۔ بہار ابھی بہت دور تھی۔ کشمیر کی بہار۔ گلمرگ کی
بہار۔ ارے وہ تو انڈین آرمی کا پبلک ریلیشنز آفیسر کرن بہادر کا لچو تھا۔ وہ
تو خیمے کے اندر کانگڑی کے پاس بیٹھا روشنی بی بی اس پیاری سی لڑکی کو جو اسے
سگی بہن کی طرح عزیز تھی خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ وہ تو ابھی روشی کو خط لکھے گا
دمّل کو خط لکھے گا۔ پھر وہ نیوز ایرا کے لئے کشمیر کے محاذ کے متعلق اپنا تازہ ترین مضمون
لکھ کر روشی کو بھیجے گا۔ وہ اتنی خوش ہو گی۔ بی چہ اتنا خوش ہو گا۔ اس نے فاونٹین پن
اٹھا لیا۔ ہوائیں خیمے کے پردے کو ہلاتی رہیں۔ برفباری شروع ہو گئی تھی۔ گرم گرم
روئی کے گالوں ایسی برف آہستہ آہستہ نیچے گرنے لگی۔ اس کے قریب بریگیڈیر

شمشیر سنگھ اور کرنل چڈہ ایک کیمپ کوٹ پر آلتی پالتی مارے بیٹھے سبز چائے پی رہے تھے اور خاموش تھے، ساری فضا خاموش تھی۔ دور سے مشین گنوں اور گولیوں کی آوازیں ہوا کی لہروں پر سنساتی ہوئی آجاتی تھیں اور بمبار طیارے گڑگڑاتے ہوئے اُوپر سے گذر رہے تھے۔ اس نے فاؤنٹن پن اٹھالیا۔ اس نے پیڈ پر غیر ارادی طور پر ادوم لکھا۔ اور پھر کاٹ دیا جو اس کی ہمیشہ کی عادت تھی۔ پھر اس نے خط شروع کرنا چاہا۔ خط شروع کرنا چاہا —— ارے یہ کیا ہے اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ اس نے آگے دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ کیا ہے —— اس کی آنکھوں میں شعلے لپکے۔ اس کے دل و دماغ اور اعصاب کے سارے تاروں میں بجلیاں کوندیں اور تیزی سے جھنجھنائیں۔ اس کے کانوں میں قیامت خیز طوفان گرجے۔ اس نے پوری کوشش سے، اس سرخ اندھیارے میں اپنے پپوٹے چیر کے بمشکل چاروں طرف دیکھا۔ پھر وہ کہیں نیچے کو گر گیا۔ (مار ڈالا سور کی اولاد کو ——؟ ہندوستانی فوج کی اس چوکی پر شبخون مارنے والے پٹھانوں کے گوریلا دستے میں سے کسی ایک نے تاریکی میں دوسرے کو پکار کر پوچھا —— بریگیڈیر سنگھ کرنل چڈہ اور دوسرے فوجیوں کی لاشوں پر سے پھلانگتے وہ سب اندھیرے میں دوسری طرف چلے گئے) وہ کہیں نیچے کو گرتا چلا گیا۔ موسیقی آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی۔ اس نے پھر کوشش کی کہ وہ سنے کہ یہ موسیقی کہاں سے بلند ہو رہی ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ میں کیا ہوں۔ میں تو کرن بہادر کا بچہ ہوں۔ میں الہ آباد میں پیدا ہوا۔ لکھنؤ میں پلا بڑھا۔ زماں و مکاں کے اس تاریک خلا کے یہ چھوٹے چھوٹے دھندلے سرخ دھبے۔ سرخ دھبے ——)

میں یونیورسٹی میں چمکا۔ میں نے صحافت کے آسمان کے تارے توڑے۔ میں سلطان شہر یار کا سکہ بڑھی بنا۔ میں نے گنّی کول کو چاہا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ گنّی کول۔ یہ جاڑوں کی سرد رات ہے۔ بہت برفانی رات ہے۔ اس رات کے اختتام پر پَو پھٹے گی۔ پَو پھٹنے کے سمے کل صبح گنّی کول کے گھر میں لشپ پوجا ہوتی ہو گی اس کے کانوں میں نقرئی اٹھر و جھلملائیں گے۔ اس پر اور اس کے سامنے سرخ دوشالے میں چھپے ہوئے ایک انسان پر پھولوں کی بارش ہو گی۔ لڑکیاں گنّی کول کی لشپ پوجا کے سمے بھیرو راگ کے بھجن الاپیں گی۔ یہ سب ہو گا یہ سب ہو گا۔ اور اس ویرانے میں، اس برفانی صحرا میں، کرن بہادر کا بچّو تم مر جاؤ گے تم مرنے والے ہو۔ تم مر چکے ہو۔ وہ بہت نیچے کو گر گیا۔ سرخ اندھیارا گہرا ہو گیا۔

چنانچہ وہ مر رہا تھا۔ اس نے پپوٹے بڑی تکلیف سے چیر کر پھر تاریکی میں چاروں طرف دیکھا۔ چنانچہ یہ یقینی بات تھی کہ وہ مر رہا تھا۔ قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ بجلیاں پھر تیزی سے کوند اٹھیں۔ یہ بہار کے گلاب کی طرح کے سرخ زخم ـــــ یہ سفید، نرم، گرم، آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والے برف کے گالے۔ یہ سرد، یخ بستہ ہوائیں۔ زندگی کی رَو۔ زندگی بلند ہے۔ زندگی مقدّس ہے، زندگی پاکیزہ ہے۔ اندھیرا زور زور سے گرجنے لگا (نسیم جاگو، کمر کو باندھو، اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے۔ روشنی بی بی کی آواز، جب وہ کبھی کبھی اسے ساتھ شکار پر لے چلنے کے لئے سویرے سویرے دوسرے دوستوں کے ہمراہ اس کے گھر پہنچ کر اسے جگایا کرتی تھی؛ اس کے کانوں میں گونجی۔ موسیقی تیز ہوتی گئی۔) زندگی خوبصورت ہے۔ زندگی ـــ مائی فٹ۔ زندگی کی خوبصورتی، زندگی کی

پاکیزگی سب غلط ہے۔ زندہ رہنے سے، وجود کی حقیقت اور واقعیت سے دہشت ہوتی ہے، کراہت آتی ہے۔ جسم گھائل ہوتا ہے۔ روح گھائل ہوتی ہے مکتی کہیں نہیں ملتی۔ سارے اعلیٰ خیالات، بلند و مقدس ارادے، آئیڈیل، اصول ساری خوبصورت کہانیاں، کوتائیں، اچھے مناظر جو آنکھوں نے دیکھے، خوشگوار باتیں جو دماغ نے سوچیں، سکھ اور چین کے لمحات جو ساتھیوں کے ساتھ بتائے۔ یہ سب ختم ہو جاتا ہے۔ صرف خون کے ٹکڑے اور بخار کی جلن، اور سرخ زخم اور دواؤں کی، مٹی کی مہک باقی بچتی ہے۔ اور کول تار سے لپی ہوئی لمبی لمبی سفید دیواریں۔ اور سرخ کمبل ــ سرخ کمبل۔ اور پھر جسم بجھ جاتا ہے۔ بجھ جاتا ہے۔ آتما کا برہما زخمی ہو چکا ہے۔ بہت جلد وہ مر جائے گا۔ جسم ہمیشہ کیلئے بجھ جائیگا (مر گیا خنزیر کا بچہ ــ؟ برف کے تودے کے پرے سے آواز آئی۔ ابھی شاید تھوڑی سی جان باقی ہے۔ ایک دو منٹ میں ختم ہو جائیگا۔ دوسری آواز نے جواب دیا۔ اچھا اسے وہیں چھوڑو اور جلدی سے بند وقیں سمیٹ کے ادھر آؤ۔ صبح سے پہلے پہلے ان کتوں کی دوسری چوکی کا صفایا کرنا ہے ـــــ یہ آوازیں اور گولیوں کی سنسناہٹ دور چلی گئی) لیکن وہ اندھیرے کے اس پار دیکھے گا۔۔ ضرور دیکھے گا ــ ارے یہ سب کیا ہے ــ ست، چت اور انند۔ کہاں ہو بھائی ــ ست، چت اور انند ــ ہوائیں سنسان خیموں کے پردوں کو اڑاتی رہیں ــ

یکلخت جھکّڑ نہایت تیزی سے چلنا شروع ہو گیا۔ برف اور ہواؤں کے طوفان کی گرج تیز ہو گئی۔ موسیقی یکلخت بہت بلند ہو گئی۔ اس موسیقی کو پہلی بار اس

نے بہت سے قریب سے سنا۔ کیونکہ وہ اندھیرے کے اس پار پہنچ گیا تھا۔ زندگی کی روح وقت کے صحراؤں سے آگے نکل گئی۔ زندگی کی روح، جو شفق زاروں اور تاریک جنگلوں میں گھومتی ہے۔

جھکڑ بہت تیزی سے چلتا رہا۔ ہر طرف مکمّل تاریکی چھا گئی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر سے اتر کر اندھیرے باغ میں آ گئی۔ ہوا اس کے بالوں کو اڑا رہی تھی۔ رات کی تاریکی میں اکّا دکّا تارے ٹمٹما رہے تھے اور بادل آسمان پر گھر آئے تھے۔ اس نے بال اپنی پیشانی سے ہٹا کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ کرشن نرائن کول آئی، سی ایس کی کوٹھی کا باغ تھا۔ اور وہ خود گنی کول تھی جس کے لہروں والے بال اس کے شانوں پر کھلے پڑے رہتے تھے۔ جس کی براؤن آنکھوں میں اب سنتوش کی جھلک جھلملاتی تھی، جو اب ہمیشہ سفید ساری پہنتی تھی۔ جس نے میرا کا روپ دھارن کر لیا تھا چنانچہ وہ خود گنّی کول تھی۔ اور یہ اس کے باپ کی کوٹھی کا باغ تھا۔ اور اس کے باپ کے اس باغ میں پہلو کے لان پر رات گئے تک اس کی شادی کے لئے شامیانہ تیار کیا گیا تھا۔ اس کی رنگین چھت میں برقی قندیلیں سجائی گئی تھیں، باغ کے درختوں میں رنگ برنگے قمقمے لٹکائے گئے تھے اور ریکارڈوں اور موسیقی کے لئے لاؤڈ سپیکر لگائے گئے تھے، اور باغ کے وسط میں منڈپ کو کیلے کے پتّوں اور پیڑوں سے مزیّن کیا گیا تھا۔ رات گئے تک وہاں پر انتہائی گہما گہمی اور سرگرمی سے کام ہوتا رہا تھا اور چہل پہل رہی تھی۔ اب وہاں مطلق سکوت تھا۔ وہ سب خاموش تھے اور شاید تھک کر اپنے اپنے بستروں پر جا کر سو چکے تھے۔ ساری کائنات

اس جھکڑ کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے متوازن سانس لے رہی تھی۔ ساری کے آنچل کو اپنے جسم کے گرد لپیٹتی ہوئی وہ اس اندھیرے میں اتر گئی۔

اور اس نے اپنی براؤن آنکھیں پوری طرح کھول کر چاروں طرف غور سے دیکھا

ہوائیں تیزی سے سنسناتی رہیں۔

"تم کون ہو بھائی —" گنی کول نے پھر آہستہ سے پوچھا۔

"میں —؟ میں خود —" اس نے جواب دیا۔ پتے سرسرانے لگے۔

"تم خود —؟"

"ہاں — میں — جو زندہ ہوں۔ اور میں جو مر چکا۔ میں جو زخمی ہوں۔ اور میں جو زخموں سے محفوظ رہا" — اس نے اسی طرح جواب دیا۔ درختوں کے پتوں اور سوکھی ٹہنیوں کی کھڑکھڑاہٹ زیادہ ہو گئی۔

"جانے کون ہے یہ۔ اور کیا کہہ رہا ہے" گنی کول نے دل میں سوچا۔ پھر وہ شاخوں کو سامنے سے ہٹاتی اندھیرے میں اور آگے بڑھی "تم کہاں سے آ رہے ہو۔؟"

اس نے رسان سے پوچھا۔

"مجھ سے یہ پوچھو کہ میں کہاں جا رہا ہوں"

"تم کہاں جا رہے ہو —" گنی کول نے دھیرے دھیرے اس کے الفاظ دہرائے

"تم — پشپ مالا کول — تم متھرا اور ورندابن اور امرناتھ، سب جگہ سے واپس آئی ہو۔ تم اپنے ساتھ کیا لائی ہو۔ ؟"

وہ خاموش رہی۔ ہوائیں سرسراتی رہیں۔

تم جو وہاں سے لانا چاہتی تھیں۔ میں اسی کی تلاش میں آگے جا رہا ہوں

تم پشپ مالا کول، اسی دائرے میں گھومتی رہو۔ اسی دائرے میں گھومتی رہو"—

"پھر کیا یہ ممکن ہوگا کہ ہم کسی اگلے دوراہے پر مل جائیں"؟ گنی کول نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پوری طرح کھول کر آہستہ سے پوچھا۔ اوپر، اندھیرے آسمان پر بادلوں میں سے نکل کر، شہد کے رنگ کا چاند تیزی سے جھلملانے لگا۔

"نہیں —" اس نے ٹھہری ہوئی چاندنی رات کے جھرنوں ایسی آوازمیں، جس میں ابدیت کی گمبھیرتا گرج رہی تھی، دھیرے سے جواب دیا۔ "نہیں — ہم اگلے کسی دوراہے پر نہ ملیں گے۔ کسی دوراہے پر نہ ملیں گے۔ ہمیں اپنے اپنے چکّروں میں تنہا گھومنا ہے۔ اس تنہائی کو تم پہچانتی ہو —؟ تم پشپ مالا کول اسی دائرے میں گھومتی رہو گی —" جھکّڑ دفعتاً بہت تیز ہوگیا۔ باغ کی تاریکی میں درختوں کی ٹہنیاں کھڑکھڑاتی رہیں۔

وہ اپنی جگہ پر کھڑی اندھیرے میں پلکیں جھپکاتی رہی۔ شہد کے رنگ کا چاند، مدھم ہو ہو کر رفتہ رفتہ بادلوں میں اوجھل ہوگیا۔

"گنّی ڈارلنگ اندر آجاؤ۔ باہر بہت سردی ہے اور پوس کی ہوائیں تیزی سے چل رہی ہیں"۔ دور، تاریک برآمدے میں سے کرشن نرائن کول آئی سی، ایس کی بیوی اور اس کی ماں یشودھرا کول کی آواز آئی۔

طوفان گرجتا رہا۔ اس کے بال ہوا میں اڑتے رہے۔

"گنّی ڈارلنگ — گنّی ڈارلنگ،" — چاروں اور سے آوازِ بازگشت نے پکارا۔

"ممی مجھے اسی دائرے میں گھومنا ہے"۔ اس نے اسی طرح آنکھیں کھولے ہوئے چپکے سے کہا۔

"مجھے اسی دائرے میں گھومنا ہے" — آواز بازگشت چیخی ـــ

ہواؤں کا شور زیادہ ہوتا گیا۔ آندھی کالے بادلوں کو اِدھر اُدھر بہانے لگی۔ (جھکڑ چلت چلت رکے کا نام ناہیں لیت ہے۔ ارے ڈھیّا رے — ماہ نگر کے موضع کے ایک چھپّر میں، آگ تاپتے ہوئے، جمائی لیکر مینیا نے اپنی سوت گیندا سے کہا، جس سے اب اس کی صلح ہوگئی تھی، ان دونوں کا آدمی رام بھروسے مانا ٹھیر کے بلوے میں حویلی کی حفاظت کرتے ہوئے کسی جرم جلے ٹھاکر کے گنڈاسے سے مارا گیا تھا اور اب ان دونوں کے پاس ایک دوسرے کے سہارے اور ہمدردی کے علاوہ زندگی بتانے کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا کیونکہ کنور رانی اپنی عدّت کی میعاد ختم کرنے کے بعد چودھری شمیم سے نکاح کر کے سندیلے جا چکی تھیں اور غفران منزل پر حکومت نے شرنارتھیوں کے ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا دفتر بنانے کے لئے قبضہ کر لیا تھا۔ گیندا نے بھی گھٹنوں پر سر رکھے رکھے ایک طویل جمائی لی اور بجھتے ہوئے اوپلوں کی آگ کریدنے لگی) پوس کی ہوائیں فضا میں منڈلاتی رہیں۔

پوس کی ہوائیں رات بھر اور دن بھر چلتی رہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کا اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر پراکرم ملیشور سہ پہر کے نزدیک، بھاری بھاری قدم رکھتا ٹمٹر تک کی بجری طے کرتا ۲۲، کوپر روڈ کی برساتی میں پہنچا (لکھنؤ چھاؤنی کی یہ کوٹھی مرحوم کنور سلمان علی خان آئی۔ پی، کو سرکار کی طرف سے ملی تھی۔ لیکن وہ چونکہ اپنی ذاتی کوٹھی میں، اوڈرم روڈ پر رہتے تھے۔ اس لئے اس میں ان کے محکمے سے متعلق کسی

چیزنکا دفتر منتقل کر دیا گیا تھا اور اس کا آدھا حصہ ہمیشہ ان کے لئے ریزرو رہتا تھا) اس نے برآمدے میں داخل ہو کر گیلری کے دروازے پر دستک دی ۔سنسان احاطے میں درختوں کی پیلے پتیاں اور پرانے اخباروں کے کاغذوں کے زرد ٹکڑے ہوا کے زور سے ادھر ادھر اڑتے اور پھڑپھڑاتے پھر رہے تھے۔ برساتی کے فرش پر موبل آئیل کے سیاہ دھبے بہت ہلکے پڑ گئے تھے اور ان کی چکناٹی پر گرد جم گئی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کوٹھی کو عرصے سے استعمال نہیں کیا گیا۔

پراکرم وِلیشور نے دروازہ پھر کھٹکھٹایا اور اس کے کھلنے کے انتظار میں مصروف ہو گیا۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے سے دروازہ یکلخت کھل گیا۔ تاریک گیلری کے سرے پر کرواہا راج کی کالی آنکھوں والی راجکماری رخشندہ کھڑی اپنے سامنے کی طرف ذرا دھیان سے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"سارا دن گذر گیا۔۔ سارا دن گذر گیا۔" اس نے کچھ اپنے آپ سے اور کچھ اپنے سامنے کھڑے ہوئے ایک اجنبی سے مخاطب ہو کر یکساں آواز میں کہا۔ اور ذرا اور آگے کو بڑھ کر باہر کے اجالے سے مانوس ہونے کے لئے اپنی پلکیں جھپکاتی رہی۔

پراکرم وِلیشور دروازے کا دوسرا پٹ کھول کر اندر چلا آیا۔

"تم کون ہو۔۔۔؟" اس نے اندر آتے ہوئے اس اجنبی انسان کو ذرا ٹھٹھک کر، اپنی پھیلی پھیلی آنکھوں سے غور سے دیکھتے ہوئے اسی یکساں آواز

میں پوچھا۔

"میں ---؟" وہ ششدر رہ گیا۔ اور ذرا پیچھے کو ہٹا۔

وہ اس طرح سائے کی مانند چلتی ہوئی گیلری کے سرے پر آ گئی "آپ ---
ار --- آپ کون صاحب ہیں ---؟ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے چمپئی ہاتھوں
سے اپنی آنکھیں مل کر دوبارہ ذرا زیادہ ٹھہری ہوئی آواز میں سوال کیا --- وہ
ایک بہت تکلیف دہ، بہت لمبے، بہت تھکا دینے والے سفر سے واپس آئی
تھی اور ایک بڑی طویل نیند سے جاگی تھی۔ دروازے میں سے اندر آتی ہوئی دن
کی روشنی میں اس نے پھر جلدی جلدی اپنی پلکیں جھپکائیں۔

"میں ---؟" پراکرم وملیشور نے اس کا سوال دہرایا --- "میں وِمل ہوں۔
روشی بی بی۔ وِمل کمار چٹوپادھیا۔" اس نے ذرا جھک کر ارسان سے اسے بتانے
کی کوشش کی۔

"ارے تم وِمل بھائی ہو" اس نے اسی جذبات سے عاری، پرسکون آواز
میں کہا۔ "اندر آ جاؤ وِمل بھائی۔" "سارا دن گذر گیا --- سارا دن" اس نے پھر
اسی انداز میں اپنے آپ سے اپنی بات دہرائی۔

تاریک گیلری طے کر کے وہ ایک ویران نشست کے کمرے میں جا بیٹھے۔
جس کی اونچی اونچی چھتیں تھیں جیسی عموماً چھاؤنیوں کی ساری کوٹھیوں کی ہوتی ہیں،
اور بڑے بڑے شیشوں کے دریچے تھے، اور رنگین ٹاٹ کا فرش تھا جس کے
چاروں طرف سرخ گوٹ تھی۔ اور دیواروں کے حاشیے سیاہ کولتار کے تھے۔
کہ واہا راج کی زنہشدہ آتشدان کے پاس ایک پرانے سرخ رنگ کے نیچے

صوفے پر جس کے ٹوٹے ہوئے اسپرنگ نیچے کو دھنس گئے تھے، اپنے ہاتھوں پر چہرہ رکھے بیٹھی رہی اور پلکیں جھپکاتی رہی۔

تمہارا دن گذر گیا ـــ" اس نے پھر دہرایا۔

دریچے کے باہر ہوائیں زرد پتّوں کو ادھر سے ادھر اڑاتی رہیں۔

پھر یکلخت اس نے آگے کو جھک کر، جیسے کوئی بہت ہی رازداری کی بات کہتی ہو اپنے سامنے بیٹھے ہوئے انسان کو آہستہ سے بتایا۔"تمہیں معلوم ہے۔ پی چو کو انہوں نے مار ڈالا۔ پی چو مر گیا۔ جانتے ہو۔ ؟"

"ہُم ـــ" اس انسان نے جواب میں کہا۔ پھر وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے ہوائیں سنسناتی رہیں۔

اپنی پلکیں جھپکا کر غور سے دیکھتے ہوئے اس نے دماغ پر زور ڈالا۔ اس سامنے بیٹھے ہوئے اکیلے انسان کی تصویر میں کہیں کچھ کمی تھی۔ کچھ کمی تھی۔ وہ دونوں ہمیشہ اکٹھے آیا کرتے تھے۔ وہ دوسرا ـــ اس انسان کا دوسرا ساتھی ـــ اس کے ذہن کے دھندلکے میں دفعتًا ایک رَو کوند گئی۔ ایک دم سے اسے یاد آ گیا۔ ٹھیک ہے۔ اس نے سوچا ـــ یہ وِمل ہے۔ وِمل کمار چٹوپادھیا۔ اس کے ساتھ ہمیشہ کرن ہوتا ہے۔ کرن بہادر کا نجو ـــ تب اس نے اسی طرح دھیرے دھیرے، پلک جھپک کر پوچھا۔"وِمل بھائی، کرن کیوں نہیں آیا تمہارے ساتھ ـــ ؟"

"مَیں ؟" پرا کرم وِملیشور نے یہ سوال سن کر اس کے جواب سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے بیوقوفوں کی طرح پوچھا۔

"کرن آگیا —؟ کارلٹن میں ٹھہرا ہے؟ اسے مجھ سے پہلے یہاں واپس پہنچنا چاہیئے تھا نا؟" کرواہا راج کی رخشندہ کا ذہن ذرا تیزی سے کام کرنے لگا۔

"کرن —؟" پراکرم وملیشور نے بیوقوفوں کی طرح پھر دہرایا۔

"اسے فون کر دو وِمل بھائی —" اس نے ذرا جوش اور احساس کی آواز میں کہا۔ لیکن اس کے بعد پھر وہ اپنی اس بات کو بھول کر زیر لب کہنے لگی۔ "سارا دن گذر گیا۔ کوئی نہیں آیا — کوئی نہیں — سارا دن گذر گیا —"

"کرن —" پراکرم وملیشور نے گلا صاف کر کے بڑی کوشش سے کہنا شروع کیا "کرن دراصل بات یہ ہے کہ۔ کرن کو بھی انہوں نے مار ڈالا — کرن مر گیا — دراصل —"

پھر وہ دونوں بالکل خاموش ہو گئے۔ گویا یہ کوئی بڑی ہی اطمینان بخش بات تھی۔ گویا ابھی ابھی جو دونوں نے ایک دوسرے سے کہا یہ بالکل کوئی ایسی خاص چیز نہ تھی جس کے لئے اب کچھ اور گفتگو کی جاتی۔ وہ احمقوں کی طرح آتشدان کے شعلوں کو تکتا رہا۔ آتشدان کے اوپر ایک پرانی شیلڈ رکھی تھی۔ جو غالباً سر ہیری ہیگ کے زمانے میں صوبے کی سنٹرل رینج کی ملٹری پولیس نے گورنر ایلیون سے جیتی تھی۔ اس کے قریب دیوار پر برطانیہ کے بادشاہ اور ملکہ کی ایک بہت بڑی تصویر آویزاں تھی جو شاید ٹائمز آف انڈیا کے اسپیشل کارونیشن نمبر میں سے نکلوا کر فریم کروائی گئی ہوگی۔ اس کا کاغذ بالکل پیلا پڑ چکا تھا۔ اور اس کے شیشے پر گرد جم آئی تھی۔ کمرے میں چاروں طرف جالے لگے ہوئے تھے۔ باہر ہوائیں گھوں گھوں کہہ رہی تھیں۔

سارا دن گذر گیا —— سارا دن گذر گیا —— کرواہار اج کی رخشندہ نے ہاتھ ہلا کر پھر اپنے آپ سے دہرایا۔ باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے اپنی ناک کھجائی۔ دو تین بال سر میں سے کھینچ کر توڑے۔ گھڑی دیکھی کہ ٹھیک چل رہی ہے یا نہیں۔ دریچے سے باہر نظر ڈالی کہ پوس کے مہینے کا یہ بے وقت پانی رُک گیا یا برسے جا رہا ہے۔ پھر اپنے سامنے، سرخ پرانے صوفے پر بیٹھی ہوئی اس لڑکی کو دیکھا۔ جو اسی طرح ہاتھوں پر چہرہ رکھے سامنے کی طرف بے دھیانی سے کچھ دیکھ رہی تھی۔

پھر ہوا نے گھوں گھوں کرنا بند کیا اور مینہ تھما۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر ایک ساتھ کمرے سے نکل کر باہر آ گئے۔ ہوا کے ایک جھونکے سے ان کے پیچھے گیلری کا دروازہ زور سے بند ہو گیا۔ شام کی تاریکی تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی۔

"ومل بھائی چاء پیو گے —— ؟" برساتی میں پہنچ کر اس کے کام کرتے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اسے یہ سوال اس انسان سے کرنا چاہیئے تھا۔ یعنی اسے چاء پینے کے لئے کہنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ اسی طرح چپ چاپ اس کے ساتھ چلتی ہوئی سڑک پر آ گئی۔ بارش میں بھیگی ہوئی طویل اور سرمئی کوپر روڈ، دلکشا اور ٹیوکونونٹ، گورنمنٹ ہاؤس کرائسٹ چرچ۔ وہ خاموشی سے یہ خوبصورت اور خوشگوار راستہ پیدل طے کرتے ہوئے ایبٹ روڈ کے چوراہے پر آ گئے۔

چوراہے پر پہنچ کر وہ حسب عادت ریڈیو اسٹیشن کی طرف مڑنے لگے۔ لیکن وہ دفعتاً ٹھٹھک گئی۔ "ومل بھائی تم اسٹوڈیوز جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں —" اس نے جواب دیا۔

"اچھا شب بخیر۔"

"شب بخیر۔" دِل نے یہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تم اندھیرا پڑے، سردی میں کہاں جا رہی ہو۔ وہ اپنی سائیکل سنبھال کے سڑک کے بے پناہ ہجوم میں رل مل گیا۔

وہ چلتی رہی۔ چوراہے پر سے گذر کر وہ نسبتاً خاموش اورٹرم روڈ پر آگئی انڈیا کافی ہاؤس کے سامنے حسبِ معمول بہت بڑا مجمع تھا لیکن اس کے بعد آگے چل کر سڑک خاموش اور سنسان پڑی تھی۔ وہ چلتی رہی۔ اس کا دماغ اور ذہن بالکل خالی تھا۔ صرف اس کا دل آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا اور وہ محض اتنا محسوس کر رہی تھی کہ اس کی ٹانگیں اس ٹھنڈی سڑک پر متحرک ہیں اور سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ ریذیڈنسی کلب، سید علی ظہیر کی کوٹھی، کلائیڈ روڈ کا چوراہا ان سب چیزوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے وہ اسی طرح سامنے کی طرف بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ ۴۲، اورٹرم روڈ پر پہنچ گئی۔ وہاں وہ رُک گئی اور خالی خالی پھیلی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی اور اسے یاد نہ آیا کہ وہ وہاں کیوں آئی ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہ آیا کہ اپنے آپ کو وہاں کیوں موجود پا رہی ہے۔ اس کو اپنے سامنے ایک دو منزلہ، پرانی کوٹھی نظر آ رہی تھی۔ اس کوٹھی کی برساتی میں بہت سی بدرنگ بنچیں اور کرسیاں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ سامنے کے لق و دق برآمدے میں نوٹس بورڈ ٹنگے تھے۔ مولسری کے جھنڈ کے نیچے دو سرکاری ٹرک اور چند سائیکلیں کھڑی تھیں۔ اور

اور دن بھر کام کرنے کے بعد بڑھئی جو شیشم کی لکڑی کے تختے وہاں چھوڑ گیا تھا ان پر دو تین چپراسی اکڑوں بیٹھے بیڑیاں سلگا رہے تھے۔

جب وہ پھاٹک کے سامنے آکر رکی تو وہاں کھڑے ہوئے ایک سنتری نے جو غالباً مقامی ہوم گارڈ کا ایک فرد تھا اور صبح دفتر آنے کی جلدی میں دھوتی کے اوپر ہی اپنے یونیفارم کا کورٹ پہن آیا تھا، اپنی کھدر کی گاندھی ٹوپی ٹیڑھی کر کے کان کھجاتے ہوئے ذرا آگے بڑھ کر اس سے کہا۔ "اجی شریمتی جی بیواؤں کے لئے ری سٹلمنٹ کا دفتر تو امین آباد میں کھولا گیا ہے۔ یہاں صرف پرشوں کو کام دلایا جاتا ہے۔ ترلوکی نندن بابو آپ کو صبح دس بجے کے بعد وہیں ملیں گے۔"

یہ اطلاع دے کر وہ کان کے پیچھے سے ادھ جلا سگریٹ نکال کے "وہ اڑن کھٹولے پر اڑ جاؤں" الاپتا ہوا اپنی بنچ پر جا بیٹھا۔

سامنے طویل سڑک پر سردیوں کی شام کا دھندلکا اور کہرہ بکھر رہا تھا اور پچھوا ہوا بہت تیزی سے بہہ رہی تھی۔ *

دلکشا، لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۴۷ء